رب کے دربار میں!

''حرمین شریفین'' ہر صاحبِ ایمان کے دل کی دھڑکن اور چشم عقیدت کا سرمہ ہیں، کون مسلمان ہوگا جس کے سامنے ان مقدس مقامات کا ذکر ہو اور شوقِ زیارت کی آتش بھڑک نہ اُٹھے، دل کی دھڑکن تیز نہ ہو اور نگاہِ تمنا نم نہ ہو، بچپن سے دیکھا کہ جہاں گاڑی سے کوئی صاحب توفیق اور خوش نصیب حج کے لئے نکلتا اس کو رخصت کرتے ہوئے ایک جشن کا سا منظر ہو جاتا، لوگ ریلوے اسٹیشن تک جلوس کی شکل میں اس کو رخصت کرنے جاتے، بوڑھے، جوان، بچے، اَن پڑھ، پڑھے لکھے، غریب، امیر، ٹرین آنے سے کچھ پہلے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے اور وداع کہتے، حاجی کی واپسی ہوتی تو پورا گاؤں سراپا منتظر ہوتا اور خاص شان و اہتمام کے ساتھ استقبال ہوتا، نعرے لگائے جاتے، پھول پتی سے گاڑی کو سجایا جاتا، اس زمانے میں حج کا سفر بھی بڑا پُر مشقت ہوتا، پانی کے جہاز میں ہفتوں گذارنا پڑتا اور سمندر کی سرکش موجیں بار بار انسان کو اس کی زندگی سے مایوس کر دیتیں، پھر جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ کا سفر بھی کچھ کم مشکل نہ تھا، اس لئے جانے والا وصیت کر کے روانہ ہوتا اور لوگوں سے اپنے قصور معاف کرانے کا خاص اہتمام کرتا، لوگ بھی خانۂ خدا کے اس مہمان سے معافی تلافی کر کے اُمید و بیم کے ساتھ اسے روانہ کرتے۔

جب میں خانقاہِ رحمانی مونگیر میں طالب علم تھا تو اس زمانہ میں وہاں ایک روایت قائم تھی، شاید اب بھی باقی ہو؛ کہ ہر سال خانقاہ کے کچھ متوسلین حج کو جاتے اور وہ خانقاہ ہو کر روانہ ہوتے، عموماً امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے وسیع اثرات کی وجہ سے لوگ حج بدل کا انتظام کرنے کی خواہش بھی کرتے اور قرعہ فال اکثر جامعہ کے کسی مدرس کے نام نکلتا،

اس قافلہ کو روانہ کرنے کے لئے جامعہ میں اساتذہ وطلبہ کا ایک پُر اثر اجتماع ہوتا، کہا سنا جاتا، دُعائیں دی اور لی جاتیں، پھر جب یہ قافلہ واپس آتا تو اس کی پہلی منزل جامعہ ہوتی، یہاں بڑے شان واہتمام سے حاجی کا استقبال ہوتا، اکثر تو بسوں کے ذریعہ طلبہ جمال پور ریلوے اسٹیشن جاتے اور نعروں کی گونج میں زائرِ حرم کو خانقاہ لاتے، جامعہ میں اس روز تعطیل ہوتی، پھر مغرب کے بعد اجتماع ہوتا، سپاس نامے پیش کئے جاتے، خیر مقدمی کلمات کہے جاتے اور مہمان معزز کے تاثرات سنے جاتے، طلبہ میں کھجور تقسیم ہوتی، زمزم دیا جاتا، ہم لوگ بڑے ہی احترام ومحبت کے ہاتھوں اسے لیتے، مجھے خوب یاد ہے کہ کھجور کی گٹھلیوں کو بھی نہ چھوڑتا انھیں ٹکڑا ٹکڑا کر کے آہستہ آہستہ کھاجاتا؛ بلکہ ایک دفعہ تو حد ہوگئی، عم محترم مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ جب حج بیت اللہ سے واپس تشریف لائے تو ان کی پلاسٹک کی معمولی چپل میں ایک پتھر پھنسا ہوا تھا، بر سبیل تذکرہ انھوں نے کہہ دیا کہ میں ''حرا'' پر چڑھا تھا، وہاں یہ پتھر اٹک کر رہ گیا، پھر کیا تھا میں نے اس پتھر کو نکالا، دھویا اور عرصہ تک چوستا رہا، اب ان باتوں کو یاد کر کے ہنسی آتی ہے، مگر اس میں عبرت کا ایک پہلو موجود ہے کہ خدا نے مسلمان بچہ بچہ کے دل میں ان مقدس مقامات کی کیسی محبت کوٹ کوٹ کر رکھ دی ہے؟ اس آنے اور جانے کا منظر اتنا پُر کیف اور پُر تاثیر ہوتا کہ ہر شخص کے دل میں زیارت حرمین شریفین کی تمنا کروٹ لینے لگتی اور اکثر کوچۂ جاناں کی کہانی سن کر آنکھیں شوق ومحبت اور ہجر ومحرومی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اشکبار ہواُٹھتیں، یاد ہے کہ اس زمانہ میں بار بار اور بے ساختہ ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں اُٹھتے تھے، کہ کبھی اس بے کس کی رسائی بھی اس دربار تک ہو، زبان کے ساتھ ساتھ آنکھ بھی محبت کے گہر اپنے رب کریم کے دربار میں نذر کرتی، اس وقت ۱۳،۱۴ سال عمر رہی ہوگی۔

حسرت کی چنگاری دل میں دبی رہی اور آنکھیں انتظار دید میں سلگتی رہیں، مگر کئی بار ایسے خواب دیکھے جن سے یقین سا ہوتا تھا کہ کبھی داتا کے گھر کا پھیرا اس فقیر کو بھی میسر ہوگا، ایک بار خواب میں دیکھا کہ زمزم کا کنواں ہے اور پانی قدرے نیچے ہے، میرا ہاتھ بہ مشکل پہنچ

پاتا ہے، مگر منڈھیر پر لیٹ کے ہاتھ نیچے مارتا ہوں اور چلّو چلّو پانی لے کر پیتا ہوں، غالباً والد صاحب سے یہ خواب نقل کیا تو فرمایا کہ اس کی تعبیر ''علم دین'' ہے، یہ زمانۂ طالبِ علمی کی بات ہے، فراغت کے بعد بھی کئی خواب دیکھے، من جملہ ان کے ایک یہ تھا کہ جیسے ہم مکہ مکرمہ پہنچے اور حمال میرے سامان سمیت مجھے مسجد حرام لے جارہا ہے، میں نے کہا کہ یہاں فقہاء نے ''باب السلام'' سے داخلہ کو مستحب لکھا ہے، مگر اس نے نہ مانا اور بالآخر کسی دوسرے دروازہ سے داخل ہونا پڑا، شعبان ۱۴۱۱ھ میں یہ خواب بعینہٖ شرمندۂ تعبیر ہوا، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ اور مولانا بدرالحسن قاسمی کے ساتھ حرمین شریفین میں پہلی مرتبہ حاضری ہوئی، جناب عبدالوحید صاحب (کورین ایرلائنز) کے ساتھ ان کی گاڑی میں مکہ مکرمہ حاضری کی سعادت میسر ہوئی، اس وقت یہ ''خواب'' خواب وخیال میں بھی نہ تھا، میں نے بے ساختہ کہا کہ ''باب السلام'' سے داخل ہونا چاہئے، مگر میزبانِ نے معذرت کی کہ اس کے لئے بہت گھوم کر جانا پڑے گا، چنانچہ ''باب الملک عبدالعزیز'' سے داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا اور آنکھیں شرفِ دید سے محظوظ ہوئیں، عمرہ کے بعد جدہ واپس آیا تو آنکھوں میں اب تک کعبہ کا حسین وپُرشکوہ منظر بسا ہوا تھا، جب بستر پر لیٹا تو اچانک وہی خواب یاد آ گیا اور بے ساختہ زبان پر حمد باری جاری ہوئی کہ کس طرح خدا نے اپنے ایک گنہگار اور بے سروسامان بندے کی ایک آرزو کو پورا فرمادیا اور اس کے خواب کو سچا کردیا۔

اس کے بعد اللہ رب العزت نے کئی عمرے نصیب فرمائے، مگر حج سے اب تک محروم تھا، بچپن سے آرزو تھی کہ خدا نے وسعت دی تو ابا کو حج کرائیں گے، مگر وہ ہمارے برگ وبار لانے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگئے، اب یہی تمنا والدہ کے لئے تھی، اہلیہ کا الگ الزام تھا کہ دنیا کے اسفار میں ہم رکابی ہوگئے اور دین کے سفر میں رفاقت سے محرومی؟ کچھ جدہ کے دوستوں اور کرم گستروں کا اصرار ہوا کہ رمضان میں آؤ تاکہ رمضان المبارک کا عمرہ نصیب ہو، جو بجائے خود حج کے برابر ہے، **العمرة فی رمضان تعدل الحج .**

شوال میں فقہی موضوعات پر جدہ کے اہل ذوق کے لئے کچھ خطبات ہوں اور حج کے بعد واپسی ہو، کچھ اور اسباب بھی اس سفر کے لئے مہیا ہو گئے، چنانچہ اللہ کا نام لے کر تینوں نے شعبان ۱۴۱۲ھ میں اس مبارک و مسعود سفر کا ارادہ کرلیا کہ جو قصد و ارادہ ہمارے بس میں ہے سو کرلیں، تکمیل اللہ کی قدرت میں ہے، سو وہ کرتے رہیں گے، میری خوش قسمتی کہ رمضان المبارک کی حد تک اخی فی اللہ مولانا خورشید انور صاحب ندوی بھی ہمارے ساتھ ہو گئے ؛ بلکہ یوں کہئے کہ وہی امیر قافلہ کے فرائض ادا کرتے رہے اور ''سید القوم خادمہم'' کی تعبیر صدیقی کو اس شان سے پورا کیا کہ ہر بُنِ موان کی محبت اور برادرانہ سلوک کے لئے سپاس گذار ہے، جزاہ اللہ خیر الجزاء .

اس سفر میں بظاہر اتنی رکاوٹیں پیش آئیں کہ کئی بار میں نے بساط اُمید لپیٹ کر رکھ دی، پہلے اہلیہ کے پاسپورٹ میں اتنی تاخیر ہوئی کہ مایوس ہو گیا، پھر یہ حل ہوا تو والدہ کے پاسپورٹ کی فائل دفتر شاہی سے گم ہو چکی تھی، از سرِ نو کوشش کی اور بڑی نا اُمیدیوں کے بعد پاسپورٹ بن سکا، پاسپورٹ میں ویزا نہ لگ سکا، یہ ہوا تو والدہ کا پاسپورٹ ویزے سے رہ گیا، ان ہی دنوں انڈین ایرلائنز کی ہڑتال شروع ہوئی اور معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز میں سیٹ ملنی مشکل ہے، مدت بھی ختم ہونے میں صرف دو چار دن رہ گئے، آخر سیٹ ملی، مگر جب حیدرآباد ایرپورٹ پر آیا تو معلوم ہوا کہ بمبئی تک کا ٹکٹ O.K نہیں ہے، خیر خدا نے اس مرحلہ سے گزارا، مگر والدہ کا ویزا بمبئی آ کر ملنا تھا، بمبئی آیا، مگر ایئرپورٹ پر پاسپورٹ ویزا لے کر کوئی نہیں پہنچا، مولانا خورشید صاحب نے ہم لوگوں کو ''سہارا ایئرپورٹ'' چھوڑا اور اس تگ و دو میں ٹراویلس گئے تو معلوم ہوا کہ ویزا اب تک نہیں لگ پایا ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ پانچ بجے بورڈنگ کا وقت ہے، ۱۲ بج رہے ہیں اور ویزا موجود نہیں، خدا جزاء خیر دے مولانا خورشید صاحب کو، وہ سفارتخانہ گئے اور خصوصی کوشش سے لمحۂ آخر میں ویزا لے کر آئے، اس طرح سعودی ایئر لائنز کے جہاز پر چڑھنے تک ایک اُمید و بیم کی کیفیت رہی، یہ پوری مدت دُعاء، خدا کے حضور گریہ و زاری

اور صلوٰۃ الحاجۃ کا اہتمام تمام اہل خانہ اور بچے بڑے کرتے رہے اور مجھے یقین سا ہے کہ اسی بات نے اس سفر کو ممکن بنایا اور خدا کی رحمت خاص ہی سے ہم لوگ سفر کر سکے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عازمین کا یہ سہ رکنی قافلہ جب حیدرآباد سے روانہ ہوا، تو اس حقیر کے پاس ایک ہزار روپئے سے بھی کم رقم تھی۔

بہرحال! خدا خدا کر کے یہ تمام مرحلے طے پائے اور ۱۰ رمضان المبارک کو مغرب سے پہلے ہم لوگ سیکوریٹی سے گذرنے کے بعد ایرلائنز کے لاؤنز میں آگئے، سعودی ایرلائنز نے افطار کا بڑا معقول انتظام کر رکھا تھا، ہر شخص کو دو سموسے، چند کھجوریں اور ایک بوتل زمزم خوبصورت پاکٹ میں، یہیں ہم لوگوں نے آسودہ ہو کر افطار کیا، پھر جماعت کے ساتھ یہیں نماز مغرب ادا کی اور سنتوں سے فارغ ہو کر جہاز میں بیٹھے، جہاز نے اُڑان بھری اور جہاز کے مائک سے پر وقار آواز میں دُعاءِ سفر بلند ہوئی اور احساس ہوا کہ واقعی ہم کسی اسلامی ملک کے جہاز میں سفر کر رہے ہیں، ساڑھے چار گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز جدہ ایرپورٹ پر تھا، اس وقت ہماری گھڑی میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے، مگر سعودیہ میں اس وقت رات کے ۸ بج رہے تھے، ہم لوگوں نے گھڑی پیچھے کی اور کھڑکی سے جدہ کا طائرانہ منظر دیکھا پورا شہر روشنی میں نہایا ہوا، کہیں اُجلے کہیں پیلے بلب، دُلہن کا سا شہر، جیسے خوب گہنے پہنا دیئے گئے ہوں، پورا شہر منصوبہ کے ساتھ تعمیر شدہ، نیچی، اونچی اور درمیانی عمارتیں، صاف شفاف ایسی سڑکیں کہ گویا ابھی دھو کر پونچھی گئی ہیں، سڑکوں کے کنارے عمارتیں قطار در قطار کھجور اور نیم کے سر سبز گھنے درخت، جدہ کے وسیع ایرپورٹ میں جہاز رکا، اور کپتان کے شکریہ کے الفاظ سنتے ہوئے ہم لوگ باہر نکلے، جدہ ایرپورٹ نہایت نفیس، خوبصورت اور وسیع و کشادہ ہے، حاجیوں کا مستقل ایرپورٹ ہے جو بڑا خوبصورت، وسیع، بلند اور خیمہ نما صورت میں بنایا گیا ہے، غیر ملکی جہازوں کے لئے علاحدہ اور سعودی ایر کے لئے علاحدہ ایرپورٹ ہے۔

ایرپورٹ کی طویل کارروائی پہلے ہی سے تھکے ہوئے مسافروں کے لئے بڑا تھکا دینے

والاعمل ہوتا ہے، اس سے گذر کر باہر نکلے تو اخوانی فی اللہ جناب ظفر مسعود صاحب (جرمن ایر لائنز)، جناب ظفر اللہ خانصاحب (الکٹرک انجینئر)، اور مولانا محمد یوسف صاحب مفتاحی (استاذ مدرسہ تحفیظ القرآن مسجد شعیبی) اپنی گاڑیوں کے ساتھ انتظار میں کھڑے تھے، اس طرح ہم لوگ جناب ظفر مسعود صاحب کے مکان، حی الرحاب، آگئے اور سفر کی ایک منزل تمام ہوئی، ہم لوگ جس اُمید و بیم کے ساتھ یہاں تک پہنچ پائے، اس کی وجہ سے ہم لوگوں پر ایک خاص مسرت کی کیفیت تھی اور خدا کے لئے جذبۂ شکر ہر رگ و ریشہ میں تڑپ رہا تھا، عشاء سے پہلے نمازِ شکر ادا کی گئی پھر نماز عشاء ہوئی۔

کل ہو کر سعودی عربیہ میں رمضان المبارک کی ۱۳ تاریخ تھی، دن آرام اور دوستوں سے ملاقات اور متعارفین سے ٹیلیفون پر گفت و شنید میں گذرا اور عصر سے پہلے ہم لوگوں نے غسل کر کے احرام کا کپڑا تبدیل کیا، جناب ظفر اللہ خانصاحب اپنی گاڑی اور عشائیہ یعنی زاد و راحلہ کے ساتھ نماز عصر کے عین بعد موجود تھے، ہم چاروں کا قافلہ ان کے ساتھ مکہ کے لئے روانہ ہوا، دل میں جذبات کا سیلاب، آنکھوں میں چمک، زبان پر تکبیر و تہلیل اور ہر بُن مو زبان حال سے بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز کہ: "کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل" — میرے لئے حرمین شریفین کی حاضری کا یہ تیسرا موقع تھا، مگر والدہ اور اہلیہ کے لئے پہلا، اس لئے ان حضرات پر کچھ زیادہ ہی کیف ساطاری تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ خوابوں کے شہر میں ہیں اور یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ واقعی ہم کوتاہ دستوں کو مہر اسلام کے اس طلوع گاہ سے بادۂ محبت اور بادۂ یقین ملنے والا ہے۔

ہم لوگ مغرب سے کچھ پہلے حدودِ حرم کے باب الداخلہ پر پہنچے جہاں رحل کی شکل میں نہایت خوبصورت، فنِ تعمیر کا شاہکار اور نازک و لطیف نقشہ کا حامل گیٹ بنا ہوا ہے، یہاں سے آگے غیر مسلموں کے لئے داخلہ ممنوع ہے، اس کی دائیں جانب اُوپر کی طرف سے طائف کی سڑک جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت عین حدیبیہ کے محاذی ہے جہاں آپ ﷺ نے

سن ٦ ھ میں کفار مکہ سے معاہدہ فرمایا تھا، ذرا آگے بڑھے کہ چیک پوسٹ تھا، ادھر ہم لوگ چیک پوسٹ پر پہنچے اور ادھر مغرب کی اذان ہوئی، اس لئے چیک پوسٹ بھی خالی تھا، بازو میں ہی مسجد ہے، جو ایک بڑے رتیلے میدان میں واقع ہے، مسجد اونچی جگہ پر بنائی گئی ہے اور سعودی عرب کی عام مسجدوں کی طرح مردوں اور عورتوں کے لئے تمام سہولتوں کی حامل ہے، جگہ شمیسی کہلاتی ہے، پہلے جدہ سے چلتے ہوئے مکہ سے پہلے حاجیوں کے لئے یہی منزلِ آرام ہوتی تھی، صورتِ حال یہ تھی کہ گاڑیاں جوق درجوق مکہ کی طرف رواں دواں تھیں، اکثر جانے والے افطار کے لئے یہاں اتر رہے تھے، ہم لوگوں نے افطار کیا، مسجد میں ایک طرف عرب روزہ دار افطار کے وسیع دسترخوان کے ساتھ بیٹھے تھے، اور ہر آنے والے سے تقاضا کر رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ شریک ہو، ہم لوگوں نے بھی ان کے ساتھ چھانچ پی اور مغرب کی نماز ادا کی، نماز کے بعد طے ہوا کہ بہتر ہے کہ یہیں کھانا کھا کر وضو کر کے چلا جائے، مکہ مکرمہ میں اس وقت طہارت خانوں پر ہجوم ہوگا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور نماز کے بعد مسجد کے باہر کشادہ صحن میں ہلکی ہلکی خوشگوار ہواؤں کے زیر سایہ ہم لوگوں نے کھانا کھایا، خواتین کے لئے علاحدہ ٹھہرنے کی سہولت تھی، وہ ادھر ہو گئیں اور ہم لوگ دوسری طرف، جناب ظفر اللہ خاں بڑے صاحبِ ذوق آدمی ہیں، انھوں نے کھانے میں پوری خوش مذاقی کا مظاہرہ کیا تھا اور نفیس حیدرآبادی ڈش پکوائی تھی، چائے کا بھی وافر نظم رکھا تھا، ٹھنڈا پانی بھی ساتھ تھا، خوب سیر ہو کر کھایا گیا اور اب ہمارا یہ مختصر سا قافلہ مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مکہ آنے سے پہلے جبل ثور کی طرف جانے والا راستہ ملتا ہے، میں جب بھی وہاں پہنچتا ہوں تو ایک عجیب کیفیت سی محسوس کرتا ہوں، وہ بھی کیا وقت رہا ہوگا کہ محمد بن عبداللہ نبی اُمی ﷺ کو اسلام کے لئے مکہ کی ارض پاک کو باوجود ہزار محبت کے چھوڑنا اور الوداع کہنا پڑا ہوگا، پھر ایک نامانوس اور نسبتاً دور کے راستہ سے چھپتے چھپاتے مدینہ کی طرف چلنا پڑا ہوگا، ایک ویران پہاڑ کے غار میں پناہ ڈھونڈی ہوگی اور ایک یہ وقت ہے کہ کیا محکوم کیا حاکم، مرد اور عورت،

بڑے اور چھوٹے ہر سمت سے آپ ﷺ کے ایک ایک قدم کو اپنی چشم محبت کا سرمہ بنانے کے لئے بیتاب چلے آتے ہیں، ''صلی اللہ علیہ وسلم'' — بائبل نے عرب کا ذکر ''بیابان'' کے لفظ سے کیا ہے؛ بلکہ اہل تحقیق کا کہنا ہے کہ عرب کہتے ہی ہیں ''بیابان'' کو، مگر آج جب آپ اس ریگستانی ملک سے گذریں گے تو آپ کو ذہن پر زور دے کر سوچنا پڑے گا کہ کیا یہی وہ ''بیابان'' ہے جس کا تاریخ اور مذہب کی کتابوں میں ذکر ہے؟ مگر مکہ کی پہاڑیاں آج بھی پوری طرح خشک و ناہموار اور بے آب و گیاہ نظر آتی ہیں۔

اللہ اللہ کر کے ہم لوگ مکہ کے ''موقف'' (بس اسٹانڈ) تک پہنچے، رمضان المبارک اور حج کے قریبی ایام میں اس سے آگے پرائیوٹ گاڑیوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، یہیں گاڑی پارک کی گئی اور سعودی 'منی بس' کے ذریعہ جو بڑی فراوانی اور آسانی سے فراہم ہیں، ہم لوگ مسجد حرام کی طرف بڑھے، مسجد حرام کا حصہ چاروں طرف سے اونچی اور درمیانی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، اس لئے عام سڑکیں ان پہاڑوں سے کٹ کر خوب گھوم کر بیت اللہ تک پہنچتی ہیں، موجودہ حکومت نے آسانی کے لئے پہاڑوں کے بیچ سے مسجد تک سرنگیں بنادی ہیں، جو بڑی کشادہ، خوبصورت، ٹیوب لائٹ کی وجہ سے نہایت روشن ہیں، جا بجا حمامات کا نظم ہے، برقی پنکھے ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کھلے ہوئے حصے ہیں، تا کہ گھٹن نہ پیدا ہو، ایسی ہی ایک سرنگ کے ذریعہ یہ گاڑی ایک مسجد کی طرف چلی اور نہایت کم وقت میں ''باب الملک عبدالعزیزؒ'' کے سامنے نشیب میں آ پہنچی، یہاں سے مسجد حرام کی سڑک خاصی بلندی پر ہے، اس لئے عام سیڑھی کے علاوہ حکومت نے چڑھنے اور اُترنے کے لئے خود کار سیڑھیوں کا نظم بھی کر دیا ہے، اس سے یوں تو سبھوں کو اور خصوصاً ضعیف لوگوں کو بڑی آسانی ہو جاتی ہے، اس طرح ہم لوگ مسجد حرام پہنچے۔

ہم لوگ 'باب ملک عبدالعزیز' سے مسجد حرام میں داخل ہوئے، مطاف کی سیڑھیوں سے پہلے کعبۃ اللہ کا پر جلال منظر سامنے تھا، کعبۃ اللہ پر جب پہلی نظر پڑتی ہے، تو ہر زائر کے دل

میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اکثر یہ کیفیت عرق انفعال بن کر آنکھوں کے ذریعے باہر آتی ہے، یہیں رُک کر جی بھر کے دُعائیں کی گئیں، داتا کے گھر کے سات پھیرے لگائے گئے۔

کعبۃ اللہ کی موجودہ تعمیر سلطان محمود ترکی کی کرائی ہوئی ہے، جو ۱۰۴۰ھ میں عمل میں آئی تھی، اس کی بلندی ۱۴ میٹر ہے، یہ بنیادی طور پر چوکور عمارت ہے؛ لیکن ہر طرف کی مقدار برابر نہیں، ملتزم کی طرف ۱۲٫۸۴ میٹر، حطیم کی سمت ۱۱٫۲۸ میٹر، حطیم اور رکن یمانی کے درمیان ۱۲٫۱۱ میٹر، نیز رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان ۱۱٫۵۲ میٹر ہے، خود حجر اسود ایک چاندی کے فریم میں جڑا ہوا ہے، جس کے پانچ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں اور سطح زمین سے ایک میٹر سے زیادہ بلندی پر واقع ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بوسہ لینے والوں کے گناہوں کو جذب کرتے کرتے یہ جنت سے اُترنے والا سفید پتھر سیاہ ہوگیا ہے، اس وقت تو حجر اسود کا بوسہ نہیں لیا گیا، کیوں کہ خاصا اژدحام تھا اور خواتین کے لئے خاص طور پر اس اژدحام میں حجر اسود تک پہنچنا دشوار تر تھا اور اس کی کوشش بھی نہیں کی گئی؛ کیوں کہ حجر اسود پر خاصی مقدار میں عطر لگا ہوا ہوتا ہے، اگر آدمی حجر اسود کا بوسہ لے، تو اس کے دونوں ہونٹ پر پوری طرح عطر لگ جاتا ہے؛ اسی لئے فقہاء نے حالتِ احرام میں اس کا بوسہ لینے سے منع کیا ہے، کعبۃ اللہ یوں تو فن تعمیر کا شاہکار نہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقبولیت میں اسے وہ قبول عام اور بقاء و دوام عطا فرمایا ہے، جو محتاجِ اظہار نہیں اور یہ بات یقیناً مسلمانوں کے ایمان میں اضافہ کا باعث ہے۔

کعبۃ اللہ کا غلاف اتنا خوش منظر ہے کہ نگاہ محبت سے اسے دیکھتے رہئے، نہ آنکھیں بھرتی ہیں اور نہ دل بھرتا ہے، کہا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیل نے سب سے پہلے کعبۃ اللہ کی دیواروں کو غلاف سے آراستہ کیا، بہر حال اسلام سے پہلے بھی کعبہ کو غلاف پہنایا جاتا تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے بھی کعبہ پر غلاف پہنایا ہے، خلافت عباسیہ کے بعد مصر کو یہ شرف حاصل ہوا کہ کعبۃ اللہ کے لئے غلاف مہیا کرے؛ لیکن ماضی قریب کے

فرعون جمال عبدالناصر کے نامۂ سیاہ میں جو افعال شامل ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مصر سے غلاف کعبہ کی آمد کا سلسلہ رُک گیا، بہر حال اب طویل عرصہ سے خود سعودی عرب میں غلاف تیار ہوتا ہے، ملک عبدالعزیزؒ نے اس کارخانہ کی بنیاد رکھی تھی، پھر ملک فہد بن عبدالعزیز نے ۱۹۷۲ء میں نئے کارخانہ کی بنیاد رکھی، جو ۱۹۷۷ء میں مکمل ہوا، اب یہی غلاف کعبہ تیار کرتا ہے، نیز کعبہ کا اندرونی غلاف اور مدینہ منورہ میں روضۂ شریفہ کا غلاف بھی اسی کارخانے میں بنتا ہے، ہر سال ذی الحجہ کو غلاف تبدیل کیا جاتا ہے، یہ غلاف مجموعی طور پر ۶۸۵ میٹر پر مشتمل ہوتا ہے، جس پر سونے کے تاروں سے حج اور کعبۃ اللہ کی مناسبت سے قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہیں، جہاں سنہرا رنگ کالے غلاف پر نگاہ کے لئے جذب وکشش کا باعث ہے، وہیں یہ تحریر فن کتابت کے اعتبار سے بھی نہایت نفیس اور خوبصورت ہے۔

ایک زمانہ میں کعبۃ اللہ کا مطاف بہت تنگ تھا، شروع میں تو یہ پتھریلی زمین کی شکل میں تھا؛ لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے مطاف کو پختہ بنایا، جس کی چوڑائی تقریباً ۸ میٹر تھی، ہم لوگوں کے بچپن میں جن لوگوں نے حج کیا، وہ بتاتے تھے کہ کعبۃ اللہ کے گرد کچھ حصہ پختہ تھا، کچھ حصہ پر کنکریاں ڈالی ہوئی تھیں اور مسجد حرام سے متصل مطاف کے حصہ میں ریت تھی، کھردرے پتھروں کی وجہ سے بعض دفعہ طواف کرنے والوں کے تلوے زخمی ہوجاتے تھے اور شدت حرارت کی وجہ سے تلووں میں آبلے آجاتے تھے؛ لیکن اب ماشاء اللہ مسجد حرام کی بنیادوں تک مطاف کو وسعت دے دی گئی ہے؛ اس لئے مطاف کا حصہ بہت وسیع ہوگیا ہے، مختلف رکاوٹیں ختم کردی گئی ہیں، طواف کرنے والوں کا ہجوم صرف دو جگہ رکاوٹ سے دوچار ہوتا ہے، ایک زمزم میں جانے کے راستہ کے پاس اور یہ بہت زیادہ اژدحام کا وقت ہوتا ہے،(۱) دوسرے مقام ابراہیم کے پاس۔

---

(۱) اب زمزم میں جانے کے لئے بنا ہوا یہ راستہ ختم کردیا گیا ہے، اس طرح مطاف میں آنے والی یہ بڑی رکاوٹ ختم ہوگئی ہے اور لوگوں کو بڑی سہولت ہوگئی ہے۔

مقام ابراہیم کو جس گنبد نما جالی دار خول میں رکھا گیا ہے، وہ کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے؛ بلکہ اس کا قطر صرف ۸۰ سنٹی میٹر ہے؛ لیکن لوگ چوں کہ یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدمین مبارکین کا نقش دیکھنے کو رُک جاتے ہیں؛ اس لئے اژدحام بڑھ جاتا ہے، اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدمین مبارکین کے نقوش بالکل واضح اور نمایاں ہیں، یہ حجر اسود سے ساڑھے چودہ میٹر کے فاصلہ پر ہے، مقام ابراہیم کی سلاطین اسلام نے اپنے اپنے دور میں خدمت کی ہے، پہلے اس کے لے باضابطہ ایک گنبد والا کمرہ تھا، اسی کمرہ میں چاندی کے صندوق کے اندر اس مبارک یادگار کو رکھا گیا تھا؛ لیکن طواف کرنے والوں کو رکاوٹ پیش آنے کی وجہ سے علماء کے مشورہ سے ۱۹۶۷ء میں لوہے کی مضبوط جالی کو زمین پر نصب کرتے ہوئے اس کو اسی میں محفوظ کر دیا گیا اور شاہ فہد نے اس خول کو تبدیل کر کے پیتل سے بنایا ہے، سونے کی پالش کرائی ہے، اور شفاف شیشہ چاروں طرف سے لگوا دیا ہے، جس کی وجہ سے قدمین مبارکین صاف دیکھے جاسکتے ہیں، یہ خول محض دو مربع میٹر سے کچھ زیادہ جگہ لیتا ہے؛ اس لئے اگر نماز پڑھنے والے موجود نہ ہوں، تو ہجوم کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی —— طواف مکمل ہونے تک اژدحام نسبتاً کم ہوتا تھا؛ اس لئے ہم لوگوں کو یہیں پر دوگانۂ طواف ادا کرنے کا موقع مل گیا۔

صفا اور مروہ، کے درمیان مسعیٰ صفا کی اُبھری ہوئی پہاڑیوں سے لے کر مروہ تک ۹ء ۳۹۴ میٹر طول میں واقع ہے اور چوڑائی ایک جانب سے دوسری جانب تک دیواروں کو شامل کرتے ہوئے ۲۰ میٹر ہے، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جگہ کے دونوں طرف پہلے دکانیں واقع تھیں اور بازار کا منظر تھا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے اپنے سفر نامۂ حج میں بھی اس کا ذکر کیا ہے؛ لیکن سعودی حکومت نے ان دوکانوں کو خرید کر مسعیٰ میں شامل کرتے ہوئے اسے مسجد حرام سے ملا دیا ہے، اس طرح مسعیٰ کا کل رقبہ ۷۸۹۰ مربع میٹر ہوتا ہے، چوں کہ سعودی حکومت نے آسانی کے لئے اس پر دوسری منزل بھی تعمیر کر دی ہے؛ اس لئے گویا اس کی

دوہری مقدار سعی میں استعمال ہوتی ہے، (۱) پھر بھی حج میں تنگ دامانی کی شکایت رہتی ہے، دونوں منزلوں پر میلین اخضرین کو سبز روشنیوں کے ذریعہ ممتاز کردیا گیا ہے اور روشنی، اے سی، پنکھے اور چکنے فرش کا معقول انتظام ہے، اس کے بھی سات چکر کئے گئے اور خدا کی نیک بندی حضرت ہاجرہ کی اپنے شیر خوار نونہال حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پانی کی بے تابانہ تلاش کا تصور ذہن تازہ ہوگیا، سعی سے فارغ ہوکر ہم لوگ زمزم کے چشمے کی طرف پہنچے۔

پہلے زمزم کے چشمہ کے اوپر ایک بڑی عمارت بنی ہوئی تھی، جو طواف کرنے والوں کے رکاوٹ بنتی تھی؛ لیکن اب سعودی حکومت نے چشمے کو زمین کے اندر رکھتے ہوئے اس کے پانی کے لئے زمین دوز نظم کردیا ہے، اس طرح مطاف کا صحن ہموار ہے، صرف صفا کی طرف سے دو وسیع راستے نیچے اترنے کے لئے بنادیئے گئے ہیں، ایک راستہ مردوں کے لئے اور دوسرا عورتوں کے لئے اور دونوں کے حصے الگ الگ رکھے گئے ہیں، (۲) البتہ مطاف کے صحن میں ایک پتھر پر بیئر زمزم کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں، یہ پتھر ملتزم والی دیوار کے سامنے کسی قدر فاصلہ پر ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کنویں کی پوری گہرائی ۳۰ میٹر ہے اور مختلف چشمے جہاں سے پانی کنویں کی دیواروں تک پہنچتا ہے، اس کا فاصلہ کم و بیش ۱۳ میٹر ہے، اس وقت یہ کنواں شیشے کی دیواروں سے محفوظ کردیا گیا ہے اور تہ خانوں میں ۳۵۰ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں، جس سے میں نے ۲۲۰ مردوں اور ۱۵۰ عورتوں کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پانی میں ایسی برکت رکھی ہے کہ حرمین شریفین میں ہر جگہ زمزم کے بڑے ڈبے گلاسوں کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں، جہاں سے وافر مقدار میں لوگ پانی حاصل کرتے ہیں، اس کے علاوہ ''کدی'' نامی پارکنگ —— جو مسجد حرام سے چند کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے —— میں زمزم کی ایک بڑی ٹنکی ہے، جہاں مسلسل

(۱) مگر اب سعودی حکومت نے مسعیٰ کو منہدم کرکے اسے چوڑائی میں پہلے کا دوگنا کردیا ہے اور اونچائی میں بھی تین منزلیں بنائی جارہی ہیں؛ لیکن اہل علم کو چوڑائی میں اس توسیع پر کلام ہے؛ کیوں کہ یہ صفا اور مروہ کے حدود سے تجاوز کرگئی ہے۔ واللہ اعلم

(۲) جیسا کہ مذکور ہوا، اب یہ راستے بھی بند کردیئے گئے ہیں۔

زمزم کی سپلائی ہوتی رہتی ہے، یہ ٹینک خود پندرہ سومربع میٹر کا ہے، جہاں سے ٹینکر اور گیلن کے ذریعے ہزاروں لوگ پانی حاصل کرتے ہیں اور جدہ اور دوسرے شہروں تک بھی پانی پہنچتا ہے، اس کے علاوہ حج وعمرہ کرنے والے حضرات نہ جانے کتنا پانی تبرکاً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور پوری دنیا تک چشمۂ زمزم کا فیض پہنچتا ہے۔

حدیث میں ماءِ زمزم کی بڑی فضیلت منقول ہے، ماہرین آبیات اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا میں اس پانی کا کوئی جواب نہیں ہے اور یہ حیرت انگیز طور پر نہایت ہی مفید اور صحت بخش پانی ہے، اس سلسلے میں ایک ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایک بار راقم الحروف زمزم کا ایک ڈبہ اپنے مکان (واقعہ کوتہ پیٹ، بالا پور، حیدرآباد) کے چھجہ پر رکھ کر بھول گیا اور بہت سے سامانوں سے چھپ جانے کی وجہ سے وہ نظر سے اوجھل ہوگیا، سالہا سال کے بعد جب اس حقیر کا نیا گھر 'شاہین نگر' میں بنا اور وہاں منتقل ہونے کی نوبت آئی تو سامان صاف کرتے ہوئے یہ ڈبہ بھی ملا، اندازاً اس پانی پر تین چار سال گذر گئے تھے؛ لیکن یہ بات ہم لوگوں کے لئے باعث حیرت تھی کہ پانی میں ذرا بھی تغیر نہیں ہوا تھا، حالاں کہ چند ہفتے ہی پانی میں کیڑے پیدا ہونے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ واللہ یفعل مایشاء .

طواف کے درمیان ملتزم پر رکنے اور اپنے مالک کے سامنے گڑگڑا کر التجا کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس لئے سعی سے فارغ ہوکر اور بال منڈا اور کٹا کر ہم لوگ ملتزم پر واپس آئے، حجر اسود سے بیت اللہ شریف کے دروازہ تک کے حصہ کو ''ملتزم'' کہتے ہیں، جو تقریباً ۲ میٹر پر مشتمل ہے، ملتزم کے معنی ایسی چیز کے ہیں، جس سے چمٹا جائے، ان دیواروں سے چمٹ کر اللہ کے سامنے گڑگڑانا اور دُعاء والتجا کرنا مسنون ہے؛ اس لئے اس کو ملتزم کہتے ہیں، اس سے متصل کعبۃ اللہ شریف کا دروازہ ہے، اس وقت یہ دروازہ شاہ خالد بن عبدالعزیز کا لگایا ہوا ہے، جو مکمل سونے کا ہے اور اس پر جو پردہ ڈالا جاتا ہے، وہ ہوتا تو غلافِ کعبہ ہی کا حصہ ہے؛ لیکن زیادہ نمایاں، نیز طغرے اور کشیدہ کاری کے اعتبار سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر ہے، کچھ

دیر ملتزم پر اور نسبتاً زیادہ دیر کعبۃ اللہ کے دروازے سے چمٹ کر دُعاء والتجاء کرنے کا موقع ملا۔

پھر وہاں سے ہم لوگ حطیم کی طرف بڑھے، دراصل جب زمانۂ جاہلیت میں کعبۃ اللہ کی تعمیر ہوئی، تو وسائل کی کمی کی وجہ سے کچھ حصہ تعمیر میں شامل نہیں ہوسکا، اسی حصہ کو "حطیم" کہتے ہیں، عام طور پر لوگ پورے حطیم کو کعبۃ اللہ کا حصہ سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، کعبۃ اللہ کی دیوار سے چھ ہاتھ ہی کا حصہ محققین کے نزدیک کعبۃ اللہ کا جز ہے، باقی حصہ اضافہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس حصہ کو شامل کرتے ہوئے کعبۃ اللہ کی ازسرنو تعمیر کی جائے؛ لیکن چوں کہ ابھی لوگ نئے نئے دامن اسلام میں آئے تھے، اس عمل سے غلط فہمی کا اندیشہ تھا؛ اس لئے آپ نے یوں ہی رہنے دیا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں کعبہ کی نئی تعمیر فرمائی اور اس حصہ کو بھی اس میں شامل کردیا؛ لیکن مشہور ظالم فرماں روا حجاج بن یوسف کو یہ گوارا نہیں ہوا اور اس نے پھر کعبۃ اللہ کو زمانۂ جاہلیت کی بنیادوں پر تعمیر کرایا، بعد میں بعض سلاطین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے مطابق بناء ابراہیمی پر کعبہ کی تعمیر کرانی چاہی؛ لیکن علماء نے مصلحتاً منع کردیا، کہ اس طرح کعبہ کی تعمیر سلاطین کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن جائے گی اور اس کی حرمت متاثر ہوگی، چنانچہ اسی نقشہ پر تعمیر ابھی باقی ہے، اس میں اللہ کی طرف سے مصلحت کا ایک خصوصی پہلو یہ ہے کہ کعبۃ اللہ کے اندر پہنچ کر ہر کس وناکس نماز پڑھنے کا شرف حاصل نہیں کرسکتا تھا؛ لیکن حطیم میں اکثر زائرین کو کسی نہ کسی وقت نماز پڑھنے کا موقعہ مل جاتا ہے، ہم لوگوں کو بھی اللہ نے یہ سعادت بخشی اور وہاں چند رکعت نماز ادا کی گئی، —— جب ہم لوگ عمرہ سے فارغ ہوکر جدہ کی طرف واپس ہوئے، تو ایسی مسرت کا احساس تھا، جو انسان کی زندگی میں خال خال ہی حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کعبۃ اللہ کے چاروں طرف نمازیں پڑھی جاتی تھیں، مسجد کی کوئی عمارت نہیں تھی اور کعبہ سے کچھ ہی فاصلہ پر چاروں طرف لوگوں کے رہائشی مکانات تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مطاف کی تنگی محسوس کرتے ہوئے

قرب وجوار کے مکانات خرید کر زمین ہموار کردی، بعض لوگ اپنے مکانات فروخت کرنے کو تیار نہیں ہوئے؛ لیکن اجتماعی مفاد، نیز اس وجہ سے کہ یہ ساری جگہیں اصل میں کعبۃ اللہ ہی کی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں مطاف میں شامل کرلیا اور قیمت ادا فرمادی نیز مطاف کی انتہاء پر چاروں طرف سے دیوار کا احاطہ کردیا، عرصہ تک وہی کھلا ہوا زیر آسمان احاطہ نماز کے لئے استعمال ہوتا رہا، عباسی خلیفہ مہدی (م:۱۶۹ھ) نے باضابطہ مسجد کی تعمیر کی اور اس کے لئے کثیر رقم خرچ کی، یہ تقریباً ایک ہزار سال باقی رہی، پھر ترکوں نے اس کی تعمیر کی، جو آج بھی مسجد حرام کے اگلے حصوں میں موجود ہے، چھوٹے گنبدوں پر مشتمل یہ عمارت فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ۹۸۰ھ تا ۹۸۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، جو اب تک قائم ہے، یہاں تک کہ موجودہ سعودی حکومت کے موسس شاہ عبدالعزیز نے مسجد حرام کی توسیع کا کام شروع کیا، جو بیس سال کے عرصہ میں شاہ سعود کے دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، یہ عمارت دو منزلہ بنائی گئی، شاہ فہد بن عبدالعزیز نے اپنے عہد میں اس کی چھت کو بھی نماز کی ادائیگی کے لئے بنایا، شاہ عبدالعزیز کی توسیع سے پہلے مسجد اور مطاف کو لے کر ۲۷ ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی، شاہ فہد کی ابتدائی توسیع کے بعد چار لاکھ کے قریب نمازیوں کی گنجائش ہوگئی، شاہ فہد نے مسجد اور ان کے صحن میں مختلف جہتوں سے اضافہ کیا ہے اور ابھی اضافہ کا کام جاری ہے، اُمید ہے کہ ان تعمیرات کے مکمل ہونے کے بعد یہاں تقریباً دس لاکھ افراد نماز ادا کرسکیں گے۔(۱)

مسجد حرام شاہ فہد کے تعمیری اضافہ کو لے کر نو پرشکوہ اور خوبصورت میناروں پر مشتمل ہے، ایک مینارہ صفا سے متصل ہے اور دو دو مینارے باب ملک عبدالعزیز، باب الفتح، باب العمرہ اور باب ملک فہد پر بنایا گیا ہے، ان میناروں کی بلندی ۸۹ میٹر ہے، صرف کلس ۷ میٹر

---

(۱) اب بحمد اللہ یہ توسیع مکمل ہوچکی ہے اور خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز دنیا سے گذر چکے ہیں، اب شاہ عبداللہ کی توسیعات کا سلسلہ جاری ہے اور توسیع وتعمیر کی رفتار سالہا سال سے اتنی تیز ہے کہ جب پہنچئے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا پورا نقشہ بدل سا گیا ہے۔

سے زیادہ کا ہے اور کلس پر لگا ہوا چاند تقریباً چھ میٹر کا ہے اور حرم کی بیرونی دیواروں میں ہلکی سیاہی کے قدرتی نقش ونگار کے ساتھ جو سفید سنگ مرمر نصب کیا گیا ہے، وہ بھی مرقع حسن ہے، اپنی روحانی تجلیات کے ساتھ ساتھ فن تعمیر کے اعتبار سے بھی مسجد حرام کی پوری عمارت اپنی مثال آپ ہے، اس وقت باب ملک فہد اوراس کے بعد صحن کا توسیعی حصہ زیر تعمیر ہے اور شب وروز کام چل رہا ہے۔

اس کے بعد بارہا حرم شریف کی حاضری، نماز تراویح میں شرکت، طواف اور عمرہ کا موقعہ ملتا رہا ستائیسویں اور انتیسویں شب بھی مسجد حرام میں گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی، ایسا لگتا تھا کہ نور کا ایک قافلہ کعبۃ اللہ کے گرد گردش کررہا ہے اور دنیا کے کونہ کونہ سے بارگاہِ خداوندی پر فقیروں کی آمد ہے، یوں تو روز ہی نماز وتر میں ائمہ حرم کی دُعائیں حاضرین کو آنسوؤں سے وضو کراتی تھیں اور ہچکیوں سے درودیوار گونج اُٹھتے تھے؛ لیکن خاص کر انتیسویں شب کو قرآن پاک ختم کرتے ہوئے شیخ عبدالرحمٰن سدیس نے بڑی ہی طویل اور پراثر دُعاء کی، شاید ہی کوئی آنکھ ہو جونم نہ ہو اور کوئی دل ہو جو تڑپا نہ ہو، اب یہ بات محل نظر ہے کہ کیا نماز کے اندر اتنی طویل دُعاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور کیا اسے بہتر عمل کہا جاسکتا ہے؟ لیکن بہرحال اس دُعاء سے جو پُر کیف منظر پیدا ہوا، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، قرآن مجید تو حرمین شریفین کے تمام ہی ائمہ اچھا پڑھتے ہیں؛ لیکن شیخ سدیس کے لب ولہجہ میں بڑا سوز وگداز ہے، ترغیبی آیات پر رونا اس گداز کو سوا کردیتا ہے۔

رمضان المبارک کے بعد جدہ کے محبین ومخلصین نے میرے خطبات کا نظم رکھا تھا، یہ خطبات قرآن وحدیث، سیرت وفقہ اور اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر ہوا کرتے تھے، تقریباً تیس خطبات ہوئے، عام طور پر دو گھنٹہ کا خطبہ اور نصف گھنٹہ سوال وجواب کا پروگرام ہوتا تھا، دو دن عمومی سوال وجواب کے لئے اور دو دن حج وعمرہ سے متعلق سوال وجواب کے لئے مخصوص رکھے گئے تھے، یہ نشستیں حیدرآباد کے مختلف احباب جناب سید حبیب علی انجینئر،

جناب ظفر مسعود، جناب سید کرامت علی (امریکن سفارت خانہ)، جناب سید حامد حسین انجینئر وغیرہ کے مکانات پر منعقد کئے گئے تھے، سعودی عرب میں چوں کہ اجتماعات کی ممانعت ہے، اس لئے کسی ایک جگہ پر خطبات کو مناسب نہیں سمجھا گیا، ان خطبات میں ستر، اسّی مردوں کے علاوہ خواتین بھی شریک ہوا کرتی تھیں، سعودی عرب میں بیرونی ملاقات گاہ کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس سے متصل چھوٹا سا ہال ہوتا ہے اور درمیان میں لکڑی یا گلاس کی ایسی دیوار ہوتی ہے، جس کو بوقت ضرورت ایک کنارے سمیٹ دیا جائے، اس طرح ایک بڑا ہال وجود میں آجاتا ہے، اس ہال میں خطبات کا نظم رکھا گیا، بحمد اللہ ان کیسٹوں کا سیٹ بڑی تعداد میں فروخت ہوا اور ایک سیٹ مجھے بھی دیا گیا، مگر افسوس کہ نہ یہ سیٹ محفوظ رہ سکا اور نہ اسے تحریر میں نقل کرایا جاسکا، ورنہ عامۃ الناس کو اُمورِ اسلامی کی تفہیم کے سلسلے میں ایک اچھا لٹریچر ثابت ہوتا۔

جدہ میں طویل قیام اور تدریسی مشغلہ سے دوری طبیعت پر بہت شاق گذرتی تھی؛ لیکن ان علمی مجالس اور ان مجلسوں میں بڑی تعداد میں اصحابِ ذوق کی شرکت اور پذیرائی، نیز مخلص دوستوں کی محبت نے اس احساس کو نسبتاً کم کردیا اور اس دوران ہم نے بچے ہوئے اوقات کو ''احکام حج'' کے مطالعہ میں صرف کیا، جو کتابیں اس وقت میسر آسکیں، ان میں 'فتح القدیر، بدائع الصنائع اور رد المحتار' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان تینوں کتابوں سے ابواب حج کو حرفاً حرفاً پڑھا گیا اور اور فتح القدیر کے شروع میں میں نے زیر بحث آنے والی فقہی جزئیات کی ایک تفصیلی فہرست بھی مرتب کردی، جس سے لوگوں کی رہنمائی میں بڑی سہولت حاصل ہوئی۔

حج کے لئے جدہ سے بہت سے قافلے مکہ جاتے ہیں، انفرادی طور پر جانے سے بہتر قافلہ کے ساتھ جانا ہوتا ہے، چنانچہ ہمارے احباب نے جناب عبد اللطیف صاحب کے قافلے کا انتخاب کیا، جو زیادہ تر دعوت و تبلیغ کے کام کرنے والوں پر مشتمل تھا، اس کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں میرے کئی شاگرد اور اہل تعلق شامل تھے اور متعدد علماء اور حیدرآباد کی ذمہ دار شخصیتیں بھی تھیں، جن سے پہلے سے تعلق تھا اور واقعی یہ انتخاب دینی اعتبار سے بہتر

محسوس ہوا، البتہ بعض دفعہ ان کا غلو دشواری کا باعث بھی بنا، بہر حال ہم لوگ ۷ ذی الحجہ کی شب میں جدہ سے براہ راست منیٰ کے لئے روانہ ہوئے؛ کیوں کہ مکہ سے ہوتے ہوئے جدہ آنا اژدحام اور ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے بہت دشوار تھا، سواری کا معقول انتظام نہیں تھا؛ کیوں کہ ایک بڑا ٹریلا لے لیا گیا تھا، جس میں ایک طرف خواتین اور ایک طرف مرد حضرات تھے، تاہم مقصد کی اہمیت کے سامنے وقتی دشواریاں قابل مسامحت ہوتی ہیں، ہم لوگ آٹھ کو ٹھیک فجر کے وقت منیٰ پہنچ گئے، ابھی منیٰ میں بہت زیادہ اژدحام نہیں تھا، جیسے ہی منیٰ میں داخل ہوئے، تو یہ منظر دیکھ کر گھبراہٹ ہوئی کہ ایک حصہ میں شامیانوں میں آگ لگی ہوئی ہے، آگ کے شعلے اور دھوئیں اوپر اُٹھ رہے ہیں اور مزید دشواری کی بات یہ تھی کہ ہوا بھی تیز چل رہی تھی، بہر حال آتش فرو عملہ متحرک ہوا اور جلد ہی آگ پر قابو پالیا گیا۔

قافلہ کے ذمہ داروں نے جس معلم کے تحت خیمے حاصل کئے تھے، وہ سعودی نژاد تھا اور بڑا ہی شریف آدمی تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد بھی متعدد بار حج کی سعادت نصیب فرمائی؛ لیکن اتنا نیک اور انسانیت دوست معلم نہیں ملا، کیمپ میں ایک بڑا ہال مردوں کے لئے اور ایک بڑا ہال عورتوں کے لئے رکھا گیا تھا، یہ بات بہت بہتر محسوس ہوئی، ورنہ عام طور پر حجاج کے خیمے میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط نظم رہتا ہے، اس سے بڑی دشواری ہوجاتی ہے، اس سلسلے میں ایک واقعہ بطور لطیفہ کے قابل ذکر ہے، دوسری بار ۱۴۱۲ھ میں مجھے اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کی سعادت حاصل ہوئی، اس بار حیدرآباد کے کئی احباب مع اہل خانہ میرے ہم سفر تھے اور ایک اچھا خاصا قافلہ بن گیا تھا، مکہ میں قیام کے درمیان ہم لوگوں نے دو کمرے لے لئے، ایک میں مرد مقیم ہوگئے اور ایک میں عورتیں، منیٰ میں ہمارے شامیانہ میں اچھے خاصے لوگ تھے، زیادہ تر حجاج کا تعلق ممبئی و راجستھان سے تھا، میں نے وہاں اپنے کیمپ میں سے ڈاکٹروں اور علماء کا انتخاب کیا، علماء کو لوگوں کی تربیت پر، مرد ڈاکٹروں کو مردوں کی خدمت پر اور خاتون ڈاکٹر کو خواتین کی خدمت پر لگا دیا، میں خود روزانہ فجر بعد اور مغرب بعد بیان کیا کرتا تھا، جس میں

خاص طور پر ایام حج کے اعمال بتائے جاتے تھے، اس کارِخیر کے لئے معلم نے ایک اپنا مائیک بھی دے دیا تھا، وہاں بھی میں نے تحریک چلائی کہ ہر خیمے میں ایک حصہ مردوں کا اور ایک حصہ عورتوں کا ہو جائے اور درمیان میں چادر گھیر دی جائے، ایک بڑے حضرت جن کا تعلق ممبئی سے تھا، وہ مصر ہو گئے کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ ہی رہوں گا، چوں کہ یہ بات تمام لوگوں کو ناگوار گذر رہی تھی اور نوبت تو تو میں میں تک آ گئی تھی، میرے ذہن میں اللہ نے ایک ترکیب ڈالی، میں نے لوگوں کو اُلجھنے سے منع کیا اور ان سے کہا کہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ مردوں والے حصہ میں آخری سیٹ آپ کی رکھ دیتے ہیں اور عورتوں والے حصہ میں آپ کی اہلیہ کی رکھ دیتے ہیں، اس طرح جب کوئی ضروری بات کرنی ہو، آپ تھوڑا سا پردہ اٹھا کر اپنی اہلیہ سے بات کر لیں گے، خیر سے انھوں نے اس کو قبول کر لیا اور اسی ترتیب پر مردوں اور خواتین کا قیام رہا، یہ مسائل بھی خوب پوچھا کرتے تھے؛ لیکن تھے بریلوی فکر کے، ایک دن جوابات سن کر خوش ہوئے اور برسرِ عام کہنے لگے، مولانا صاحب کا عقیدہ تو خراب ہے؛ لیکن مسئلہ اچھا سمجھاتا ہے۔

بہر حال حج کے اس پہلے سفر میں بڑا اچھا قافلہ ہم لوگوں کو ملا، دینی و دعوتی ذہن رکھنے کی وجہ سے زیادہ تر ذکر و عبادت اور شرعی مسائل کے بارے میں استفسار و جواب میں ہی وقت گذرتا تھا، البتہ غلو کا ایک پہلو یہ تھا کہ جو لوگ طواف و سعی اور رمی وغیرہ کر کے تھک تھکا کر آتے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے، انھیں بھی ''فضائل اعمال'' سنانے کے لئے زبردستی اُٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی، بعض لوگوں کو اس بے وقت کے اصرار سے ناگواری ہوتی تھی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی اہمیت معلوم ہوئی کہ عالم کا سونا بھی عبادت ہے، اسی طرح معتکف کے سونے کو بھی عبادت قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے کہ اس سے آگے کی عبادت میں تازگی پیدا ہوتی ہے، ایامِ تشریق میں روزہ کو مکروہ قرار دیا گیا ہے اور سفر جہاد میں آپ نے روزہ رکھنے کو پسند نہیں فرمایا ہے؛ کیوں کہ اس وقت جو عبادت مقصود ہے، اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے کی اہمیت زیادہ ہے اور حج بھی مشقت کی عبادت ہوتی ہے؛ اسی لئے آپ

نے حج کو جہاد قرار دیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت اصل اہمیت افعالِ حج کی ہے، بہر حال جذبۂ وخلوص کے ساتھ ساتھ اگر مطالعہ کم ہو، تو اس طرح کی غلو آمیز باتیں پیش آجاتی ہیں؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دعوت وتبلیغ کی یہ محنت عند اللہ مقبول ہے اور اس کے فوائد محتاج بیان نہیں ہیں۔

کیمپ میں مختلف علماء اور دعوتی کام کرنے والوں کے خطاب کا سلسلہ بھی بہت اچھا رہا، ایک دن اس حقیر نے بھی منتظمین کی خواہش کی تعمیل میں کچھ عرض کیا، منیٰ کو دیکھ کر حشر کا میدان یاد آتا ہے، لاکھوں کی تعداد میں کفن بردوش اہل ایمان اللہ کے دربار میں اپنی حاضری کا اعلان کرتے ہوئے جمع ہیں، سارے امتیازات مٹ چکے ہیں، ایک ہی لباس، زبان پر ایک ہی طرح کے بول اور ایک ہی جگہ کا قیام، نہ عالم وجاہل میں کوئی فرق، نہ شاہ وگدا میں کوئی تفاوت، نہ گورے اور کالے میں کوئی امتیاز، یہ مجمع اسلامی اُخوت اور اجتماعیت کے جذبہ کو بھی پروان چڑھاتا ہے، اسی منیٰ میں وہ وادی بھی ہے، جہاں موسم حج میں رات کے اوقات کی تنہائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ سے بیعت کی تھی، گویا مکہ میں طلوع ہونے والا ''مہر مبین''، منیٰ کی ان ہی وادیوں سے گذرتے ہوئے مدینہ میں جلوہ افروز ہوا۔

اگلی صبح یعنی ۹ ذی الحجہ کو ہم لوگ میدانِ عرفات کے لئے روانہ ہوئے، اللہ کا شکر ہے کہ بہت تھوڑے وقت میں زوال سے پہلے ہی ہم لوگ عرفات پہنچ گئے، یہ سفر بھی کتنا ایمان افروز ہوتا ہے، ہر طرف سے انسانوں کا سمندر، ''لبیک'' کی صدا لگاتے ہوئے ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے، زوال سے پہلے ہی دو چار لوٹا پانی جسم پر ڈال کر غسل کی سنت ادا کی گئی، خواتین نے خیموں میں نماز ادا کی اور ہم لوگوں نے مسجد نمرہ پہنچ کر ظہر وعصر کو جمع کیا، مسجد کے اندر تو جگہ نہیں مل سکی، مسجد سے متصل میدان میں زیر آسمان نماز ادا کی گئی، اتفاق سے موسم میں بڑی تمازت تھی؛ لیکن میدانِ عرفات میں ہونے کا احساس موسم کی شدت کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ جنت سے اترنے کے بعد حضرت آدم وحواء علیہما السلام کی ملاقات

ہوئی تھی، میدانِ عرفات کا کچھ حصہ حرم میں ہے اور زیادہ تر حصہ حدودِ حرم سے باہر ہے، مسجد حرام سے اس کا فاصلہ تقریباً ۲۲ کیلومیٹر ہے اور خود میدان کا رقبہ ایک سو چار مربع کیلومیٹر ہے، عرفات کی ابتداء وانتہاء کو ظاہر کرنے کے لئے بڑے بڑے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں، عرفات کی مسجد ''مسجد نمرہ'' ہے، جس کا آگے سے مغرب تک طول ۳۴۰ میٹر، عرض ۲۴۰ میٹر اور کل رقبہ ایک سو دس ہزار مربع میٹر ہے، مسجد کا پچھلا حصہ دو منزلہ ہے اور مسجد کے عقب میں آٹھ ہزار مربع میٹر کے حصہ پر سایہ کے لئے شیڈ بھی موجود ہے، اس مسجد کے چھ مینارے ہیں، جن میں سے ہر ایک ساٹھ میٹر بلند ہے، یہ مسجد موجودہ سعودی حکومت کی بنائی ہوئی ہے، اس مسجد میں ساڑھے تین لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہے اور حمامات اور وضو کے نل بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

راقم الحروف نے کچھ رفقاء کے ساتھ مل کر ''جبل رحمت'' کا رُخ کیا، اس پہاڑ پر لوگوں کا ایسا اژدحام تھا کہ گویا کسی میٹھے پھل پر ہر چہار جانب سے مکھیاں بیٹھی ہوں اور کوئی جگہ خالی نہیں، جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھے، اژدحام بڑھتا گیا، درمیان میں سیاہ فام لوگوں کا ایک قافلہ ملا، جو بہ آواز بلند تلبیہ پڑھتا ہوا جا رہا تھا، ان کی آواز کا زیر و بم کچھ ایسا تھا کہ پورے جسم میں ایک انفعالی کیفیت پیدا ہوگئی، رونگٹے کھڑے ہوگئے اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے، یوں لگتا تھا کہ گویا دربار الٰہی لگا ہوا ہے، رب کائنات اپنی شان جمال وجلال کے ساتھ جلوہ افروز ہے اور کوتاہ کار غلاموں اور بے نوا فقیروں کا ہجوم ان کی چوکھٹوں تک پہنچنے کے لئے بے قرار ہے، آخر ہم لوگوں کو اژدحام کی وجہ سے رُک جانا پڑا اور ہم ایک دوسرے سے ٹوٹ بھی گئے، واپسی میں کچھ آگے جا کر ملاقات ہوئی، اس کے بعد ہم لوگ اپنے خیمے کی طرف واپس آگئے اور پندرہ بیس منٹ آرام کر کے خیمہ سے باہر نکلے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقوفِ عرفہ کے بارے میں فرمایا کہ یہی اصل حج ہے ''**الحج عرفة**'' (ابن ماجه : كتاب الحج ، باب من أتى عرفة قبل الفجر ...... حدیث نمبر:۳۰۱۵، ترمذی : كتاب الحج ، حدیث نمبر:۱۸۸۹) یہ دن خاص طور پر دُعاؤں اور دُعاؤں کی قبولیت کا دن

ہے، اللہ تعالیٰ اس دن آسمانِ دنیا پر جلوہ فرما ہوتے ہیں اور فرشتوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں، یہ میرے پراگندہ حال بندے ہیں اور میری خوشنودی کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں، پھر اہل عرفات سے فرماتے ہیں کہ میں نے تمہاری مغفرت فرمادی، یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی گریہ وزاری کے ساتھ دُعائیں فرمائی تھی اور یہیں آپ کو تکمیل دین کا مژدہ سناتے ہوئے ''**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم ورضیت لکم الاسلام دینا** '' (المائدہ:۳) نازل ہوئی، جو بہت سے اہل علم کی رائے میں نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی آخری آیت ہے، یہ منظر بھی عجیب منظر تھا، لوگوں کی ایک بڑی تعداد دھوپ میں کھڑی ہوئی، زبان پر نالۂ دل اور اللہ کی کبریائی اور اس کے جود وکرم کا حوالہ، ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلے ہوئے، آنکھیں اشک بار، واقعہ ہے کہ اس دن اللہ سے مانگنے میں بڑا لطف آیا اور خوب دل لگا، دل میں یقین سا آتا تھا کہ آج کی دُعاء رائیگاں نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ انسان بھی کسی کو اپنے گھر بلا کر نامراد واپس نہیں کرتا، تو خدا کیسے واپس کرسکتا ہے، یاد آتا ہے کہ غالباً جتنی دُعائیں اُمورِ دنیا سے متعلق اس دن کی گئیں، اکثر ظہور پذیر ہوچکی ہیں؛ اس لئے اُمید ہے کہ جو دُعائیں اُمور آخرت سے متعلق کی گئی ہیں، انشاء اللہ وہ بھی مالک کے کرم سے قبول ہی ہوئی ہوں گی، غروب آفتاب سے کچھ پہلے اجتماعی دُعاء بھی کی گئی۔

موسم میں سختی اور خیموں کے بجائے بڑے بڑے شامیانوں پر اکتفاء کرنے نیز یہاں پنکھے نہ ہونے کی وجہ سے موسم کی تمازت کا احساس زیادہ ہوتا ہے، اس وقت حکومت نے پورے میدانِ عرفات میں نیم کے درخت بکثرت لگادیئے ہیں اور پورے میدان میں اونچے اونچے پائپ فٹ ہیں، جس کا متحرک فوارہ چاروں طرف پانی کی پھوار پھینکتا رہتا ہے، اس کی وجہ سے فضا ایک گونہ معتدل رہتی ہے، ادھر مغرب کا وقت شروع ہوا، ادھر توپ داغی گئی اور عرفات سے قافلے کی روانگی شروع ہوئی، بسیں، لاریاں، موٹر گاڑیاں اور پیادہ پا، غرض کہ :

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

ہندوستانی حجاج کی قیام گاہ عام طور پر عرفات میں پیچھے کی طرف ہوتی ہے؛ اس لئے نکلنے میں تھوڑی تاخیر ہوتی ہے، عام حالات میں حکم ہے کہ مغرب کی نماز میں عجلت کی جائے؛ لیکن آج اللہ کا حکم تاخیر سے یعنی مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھنے کا ہے؛ اس لئے آج مغرب میں عجلت کے بجائے تاخیر کرنی ہے، بندۂ مومن کا مزاج زندگی کے ہر شعبے میں یہی ہونا چاہئے، جہاں چلایا جائے، وہاں چلے، جہاں روکا جائے وہاں رکے، گرمایا جائے تو گرم ہو اور نرمایا جائے تو نرم ہو جائے، مغرب کے کچھ دیر بعد ہم لوگ روانہ ہوئے اور عشاء کا وقت شروع ہوتے ہوتے مزدلفہ کے ایک پتھریلے میدان میں اتارے گئے، یہیں وضو کیا گیا، مغرب و عشاء ایک ساتھ مزدلفہ میں پڑھی گئی، کچھ بسکٹ وغیرہ ساتھ تھے، اس کے کھانے پر اکتفاء کیا گیا اور یہیں کھلے میدان میں چادر بچھا کر لیٹ گئے، دن بھر کے تھکے مسافر نے جب آنکھ بند کی، تو بغیر تکئے اور گدے کے اس چبھتے ہوئے بستر پر بھی ایسی گہری نیند آئی کہ شاید فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی ایسی نیند نہ آئی ہوگی، نصف شب کے بعد ہی سے میدانِ مزدلفہ میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، غالباً یہ اذان تہجد کے لئے ہوتی ہے، بہت سے لوگ اسی وقت منیٰ کے لئے روانہ ہونے لگے، ان میں کچھ تو معذور تھے؛ لیکن بیشتر لوگوں کے لئے یہ جہالت اور ناسمجھی کا کرشمہ تھا۔

ہم لوگوں کی بھی آنکھ کھلی، ہلکی بونداباندی بھی ہو رہی تھی، میں نے اس کو نیک فالی اور نزولِ رحمتِ خداوندی کی علامت سمجھا اور باوجود یکہ بدن چور چور ہو چکا تھا؛ لیکن ہمت کر کے خود اٹھا اور متعلقین کو اٹھایا، یہیں نماز تہجد ادا کی، میں نے نماز پڑھائی اور والدہ اور اہلیہ نے اقتداء کر لی، اس نماز میں بھی بڑا لطف آیا، جیسے بچے اپنے ماں باپ کے سامنے ان کی فرماں برداری کر کے پھولے نہیں سماتے، ایسا ہی احساس مزدلفہ کی نماز میں ہو رہا تھا، فجر کی نماز بھی اول وقت میں ادا کی گئی، پھر سورج کے طلوع ہونے تک خوب دُعائیں کی گئیں، مزدلفہ طول میں چار کیلومیٹر اور رقبہ میں بارہ مربع کیلومیٹر سے زیادہ ہے، یہیں 'مسجدِ مشعرِ حرام' ہے، اسی

کی سمت قبلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا؛ اسی لئے یہ جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی، یہ مسجد مشرق سے مغرب نوے میٹر ہے، اس کا عرض ۵۶ ؍میٹر ہے اور ۳۲ میٹر بلند دو مینار اس کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں، مزدلفہ مختلف پہاڑیوں سے مرکب ہے، سعودی حکومت نے بڑے حصے کو مسطح کر دیا ہے، یہاں چوں کہ رات کا قیام ہوتا ہے، اس لئے خیمے کا نظم نہیں ہوتا، جگہ جگہ کشادہ میدان ہے، ان ہی میدانوں میں لوگ ٹھہرتے ہیں، تقریباً ہر جگہ حمامات اور نلوں کا بھی انتظام ہے، اس کے باوجود حجاج کی کثرت کی وجہ سے دقت پیش آتی ہے۔

بہر حال سورج طلوع ہوا اور ہم لوگ مزدلفہ سے نکلے، ہم لوگ مزدلفہ میں ایسی جگہ ٹھہرائے گئے تھے، جو منیٰ سے بہت قریب واقع تھا، اس لئے وہاں سے پیدل ہی روانگی ہوئی، اژدحام کی وجہ سے گویا چیونٹیوں کی رفتار سے چلتے ہوئے منیٰ پہنچنا ہوا، نو دس بجے ہم لوگ منیٰ میں اپنے خیمہ میں تھے، یہیں آرام کیا گیا، ظہر کی نماز پڑھی گئی، قافلہ کے ذمہ داروں نے کھانے پینے کا بھی معقول انتظام کیا تھا اور مشورہ ہوا کہ مغرب تک اپنے خیمہ ہی میں آرام کیا جائے؛ کیوں کہ بھیڑ کی وجہ سے رمی کرنا بالخصوص والدہ واہلیہ کو ساتھ لے کر بڑا مشکل کام تھا، مغرب سے کچھ پہلے ہم لوگ خیمے سے نکلے، عزیزانِ حافظ محمد اسماعیل نیز حافظ عبدالرحمٰن وسیم کمپیوٹر انجینئر (۱) کے برادرانِ خورد اور برادرانِ نسبتی ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے، یوں تو ہر جگہ ان سے بے حد سہولت پہنچی، لیکن خاص کر رمی، طواف اور سعی میں ان کی دستگیری بہت کام آئی، رمی کے درمیان ان سب عزیزوں نے اپنے گھیرے میں لے کر ہم تینوں کو رمی کرائی اور باوجود ہجوم کے ہم لوگوں کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور بڑی آسانی سے سنت کے مطابق رمی کی گئی۔

منیٰ کی انتہاء پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے عام قسم کے پتھروں کے تین ستون بنادیئے گئے ہیں، منیٰ کی جانب سے پہلا ستون ''جمرۂ عقبہ'' کہلاتا ہے، اس کے بعد دوسو سینتالیس میٹر

(۱) افسوس کہ گذشتہ سال موصوف کا انتقال ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

کے فرق کی مسافت پر ''جمرۂ وسطیٰ'' واقع ہے، اور اس جمرہ سے دوسو میٹر پر ''جمرۂ صغریٰ'' ہے، یہ وہ مقامات ہیں، جہاں شیطان نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی توفیق سے ان کو دھتکار کرنا کام ونامراد کردیا تھا، اسی کی یادگار کے طور پر حجاج ان ستونوں پر کنکری مارتے ہیں، گویا یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ہم اللہ کی رضاء وخوشنودی پر شیطان کے بہکاوے کو غالب نہیں آنے دیں گے، اس ستون پر پلاسٹر نہیں ہے، اس کی چوڑائی غالبًا دوفٹ ہوگی، اژدحام کو دیکھتے ہوئے اس پر پل بھی بنادیا گیا ہے اور ستون اس طرح اونچا کردیا گیا ہے کہ اوپر کی منزل سے بھی کنکر مارے جاسکیں، (۱) ان جمرات کو عام طور پر لوگ بڑا، درمیانی اور چھوٹا شیطان کہتے ہیں، اسی مناسبت پر جمرۂ عقبہ پر جو بورڈ لگا ہوا ہے، اس پر فارسی میں ''شیطان بزرگ'' لکھا ہوا ہے، ایک صاحب مجھ سے بڑی حیرت سے پوچھنے لگے: کیا شیطان بھی بزرگ ہوسکتا ہے؟ میں نے انھیں بتایا کہ بزرگ کے اصل معنی بڑے کے ہیں، پھر وہ مطمئن ہوئے، ورنہ وہ اسے ''وہابیوں'' اور ''نجدیوں'' کی زیادتی سمجھ رہے تھے، ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں استعمال ہوتا ہے، تو ضروری نہیں کہ بعینہٖ اسی معنی میں استعمال ہو، اس کی وجہ سے بعض دفعہ ایسے لطائف پیش آجاتے ہیں۔

رمی کے بعد ہم لوگ وہیں سے مکہ چلے گئے، عشاء کے بعد مسجد حرام پہنچے، طوافِ زیارت اور سعی میں بڑا ہجوم تھا؛ لیکن مذکورہ عزیزوں کی وجہ سے طواف اور سعی کا مرحلہ تمام ہوا اور بال مونڈا اور کٹا کر فجر سے پہلے ہم لوگ منیٰ واپس آگئے، حج کے ارکان چوں کہ ادا ہوگئے تھے، اس لئے بڑی خوشی ہوئی۔

۱۱ر ذی الحجہ کو پھر ہم لوگ عصر کے وقت عام لباس میں اپنے خیموں سے نکلے اور تینوں

---

(۱) اب یہ جمرات کافی وسیع کردیئے گئے ہیں، ان کی چوڑائی تیس پینتیس فٹ سے کم نہیں ہوگی، البتہ وضع کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ نیچے آکر کنکریاں اسی مقام پر گرتی ہیں جو پہلے کنکریوں کے گرنے کی جگہ تھی۔

جمرات پر رمی کی، نیز منیٰ کی مسجد خیف میں نماز مغرب پڑھی، یہ بڑی ہی طویل وعریض مسجد ہے، جو چار فلک بوس میناروں سے مزین ہے، مسجد کے اندر اے سی کا بھی نہایت ہی معقول انتظام ہے، یہیں سے ہم لوگ مکہ کے لئے نکل گئے؛ کیوں کہ حج کے فوراً بعد ہی جدہ سے ہندوستان کے لئے ہمارا جہاز تھا؛ اس لئے مکہ پہنچ کر طوافِ زیارت کیا گیا اور طواف کے بعد ہم لوگ پھر منیٰ واپس آ گئے، ۱۲ر ذی الحجہ کو مولانا نجم الحسن قاسمی، جناب میر سید قطب الدین علی چشتی مہتمم جامعہ انوار الہدیٰ اور یہ حقیر رمی کے بعد ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اور حج کی تکمیل پر ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کی نیز اس کے بعد اپنے قافلے کے ساتھ الگ الگ سواریوں سے جدہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اتفاق سے بعد کو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بھی رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر حج کے لئے تشریف لائے، مجھے اس کی اطلاع مل چکی تھی، چنانچہ ۱۱ ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت جب کہ تپش اپنے شباب پر تھی، میں منیٰ میں جمرات کے قریب رابطہ کے بنے ہوئے مہمان خانہ میں پہنچا، جہاں راحت وآسائش کے تمام اسباب موجود تھے، اے سی کی وجہ سے دھوپ کی تپش کا ادنیٰ درجہ بھی احساس نہیں ہو رہا تھا، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف بھی موجود تھے اور پوری دنیا سے اہم شخصیتیں یہاں فروکش تھیں، تھوڑی دیر میں میں نے واپسی کی اجازت چاہی، قاضی صاحب نے فرمایا: اس گرمی میں کہاں جاؤ گے؟ شام تک یہیں آرام کرلو، میں نے عرض کیا کہ حج کا لطف تو ان ہی تپتے ہوئے خیموں میں آتا ہے تو خاموش ہو گئے اور فرمایا کہ اصل حج تو وہی ہے، جو عام لوگوں کے ساتھ کیا جائے، پھر اپنا واقعہ سنایا کہ جب پہلی بار حج کے لئے آئے، تو مطاف کے کچھ حصے میں کنکر بچھے ہوئے تھے اور اژدحام کی صورت میں اس حصہ پر بھی طواف کرنا پڑتا تھا؛ اس لئے تلوے زخمی ہو جاتے تھے، بعض دفعہ لوگ تلووں پر کپڑا باندھ کر طواف کیا کرتے تھے، واقعہ ہے کہ سعودی حکومت میں حرمین شریفین کی خدمت کا جو جذبہ ہے، اس کے تحت ایسی مشقتوں سے لوگ بڑی حد تک بچ گئے ہیں، البتہ اژدحام کی وجہ سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں،

وہ اپنی جگہ ہیں اور اگر حج میں مجاہدہ ومشقت ہی باقی نہ رہے، تو عبادت کا لطف ہی کیا باقی رہے گا؟

اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد متعدد بار سعادت حج سے سرفراز فرمایا، (۱) ۱۴۲۸ھ میں خادم حرمین شریفین شاہ عبداللہ کی خصوصی دعوت پر بھی سفر ہوا، جو ظاہر ہے کہ راحت وآرام کے اعلیٰ وسائل کے ساتھ پر تھا؛ لیکن پہلے سفر میں جو کیفیت حاصل رہی اور عبادت کی جو لذت قلب وروح نے محسوس کی، شاید ہی بعد میں کبھی حاصل ہوئی ہو، واپسی پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، اس کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا، ہم لوگ جاتے ہوئے گھر مقفل کر کے گئے تھے اور ایک مرغی پال رکھی گئی تھی، وہ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ڈربہ میں تھے اور بلی کی آمد ورفت بھی ہمہ وقت رہتی تھی، اکثر بچے اسی کی خوراک بن جاتے تھے، ہم لوگ مرغی اور اس کے بچوں کو ویسے ہی چھوڑ کر چلے گئے، خیال تھا کہ بچے اور مرغی کا نام ونشان مٹ چکا ہوگا؛ کیوں کہ تین ماہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا، گھر میں داخل ہونے کے بعد یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہی ڈربہ مرغی اور اس کے بچوں کا مسکن ہے اور بلی کا بھی، اور مرغی سارے بچوں کے ساتھ محفوظ ہے، بہر حال اس پورے سفر میں یہ تجربہ ہوا کہ بندہ جب کوئی عمل رضائے خداوندی کی معمولی طلب کے ساتھ بھی کرتا ہے تو قدم قدم پر اللہ کی طرف سے نصرتیں اور حفاظتیں شامل حال ہوتی ہیں اور یہ بھی تاثر قائم ہوا کہ حج سے واقعی ایمان تازہ ہوتا

(۱) اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے، پہلے حج کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوسرے ہی سال پھر اہلیہ کے ساتھ حج کا سامان فرمادیا، اس بار یوم عرفہ جمعہ کو تھا، اس لئے غیر معمولی اژدحام تھا، اتفاق سے ۱۰ ذی الحجہ کو مجھے شدید (۱۰۴) بخار آ گیا، موسم کی حدت اور اس کے ساتھ بخار کی اندرونی تپش کی وجہ سے برا حال تھا، اس بے چینی میں میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ حجِ فرض تو ادا ہو ہی چکا ہے، رمضان المبارک کا عمرہ بھی حج کے برابر ہے، اس لئے آئندہ حج کے بجائے رمضان میں عمرہ کرلیا کریں گے، ظاہر ہے یہ فقرہ ادب کے خلاف تھا، اہلیہ نے فوراً ہی ٹوکا اور کہا کہ ایسی بات زبان سے نہ نکالیں، یہ اتفاقی بات ہے کہ بخار آ گیا ہے، مجھے بھی تنبہ ہوا اور فوراً استغفار کیا، اس کے بعد کئی سال حج کے مواقع پیدا نہیں ہوئے اور مجھے اپنے آپ پر بڑی ملامت ہوئی، میں بار بار دُعاء واستغفار کرتا رہا، آخر جب تیسری دفعہ حج کا موقعہ آیا اور اللہ تعالیٰ نے اس سعادت سے بہرہ مند فرمایا تو بے حد خوشی ہوئی، شاید پہلے حج سے بھی زیادہ، میں نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پروانۂ عفو سمجھا اور دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

ہے اور اللہ پر یقین بڑھتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اسلام اور حج کا ایک ساتھ ذکر فرمایا اور بتایا کہ یہ دونوں چیزیں پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں ''الاسلام یھدم ما کان قبلہ والحج یھدم مکان قبلہ''۔(مسلم : کتاب الإیمان ، باب کون الإسلام یھدم ماکان قبلہ،حدیث نمبر:۱۹۲)

مکہ مکرمہ میں بعض تاریخی آثار بھی ہیں، جہاں پہنچنے کا شرف حاصل ہوا اور جن کے ذکر کے بغیر یہ سفرنامہ سعادت یقیناً ادھورا ہوگا، صفا ومرہ کے عقب میں ایک بڑا سا میدان ہے، جس پر سفید، ٹھنڈے پتھر نصب ہیں، اس صحن کے ختم ہونے کے بعد ایک سڑک واقع ہے، سڑک عبور کرنے کے بعد کچھ فراز کا علاقہ ہے، یہیں بنو ہاشم کا قبیلہ آباد تھا اور اسی کے قریب شعب ابی طالب واقع ہے، ۱۹۵۰ء میں وہاں ''مکتبہ مکۃ المکرّمہ'' کے نام سے لائبریری قائم کر دی گئی ہے، یہی مقام رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش ہے، مکہ میں غارِ حرا واقع ہے، یہ مسجد حرام کے شمال مشرق میں کسی قدر فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے، جس کا اصل نام تو ''حرا'' ہے؛ لیکن نزول قرآن کی نسبت سے اسے ''جبل نور'' بھی کہا جاتا ہے، اسی کی چوٹی پر غارِ حرا واقع ہے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار اللہ کا کلام اترا، یہ غار سطح زمین سے ۲۸۱ میٹر کی بلندی پر واقع ہے، اہل علم نے لکھا ہے کہ اس کی لمبائی ۳ر میٹر، بلندی ۲ر میٹر اور چوڑائی کہیں کم اور کہیں زیادہ ہے، اس غار کی عظمت اس کی نسبت سے ظاہر ہے، حضور ﷺ نبی بنائے جانے سے پہلے بھی یہاں گویا معتکف رہتے تھے، یہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلی بار اللہ کا کلام لے کر اترے اور سورۂ علق کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، یہاں بہت لوگ آتے ہیں اور اہل ہمت غار تک پہنچتے ہیں، اس حقیر نے کوشش کی، مگر دھوپ، اونچائی اور روزہ کی حالت ہونے کی وجہ سے چڑھ نہیں پایا۔

موجودہ مسجدِ حرام اور مسعیٰ سے متصل ہی ''دار ارقم'' کی جگہ واقع ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جاں نثار حضرت ارقم بن ارقم رضی اللہ عنہ کا مسکن تھا، ابتدائی مکی دور میں یہ مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہیں آ کر کلمۂ شہادت پڑھا تھا

اور یہیں سے خفیہ طور پر دعوتِ دین کا کام ہوتا تھا، پہلے یہ جگہ مسعی اور مسجد حرام سے باہر تھی؛ لیکن جب مسعی کی توسیع عمل میں آئی تو اس حصہ کو مسجد حرام میں شامل کرلیا گیا، اب بطور علامت کے یہاں ایک دروازہ "باب ارقم" کے نام سے ہے، راقم الحروف یہ اور ایسے مقامات پر اپنے رفقاء کو لے جاتا اور انھیں اس کی تاریخ بھی بتاتا۔

ایک دن غارِ ثور کی طرف جانے کا موقع ملا، یہ مسجد حرام سے جنوب کی سمت میں ۴ کیلو میٹر پر واقع ہے، یہی وہ غار ہے، جہاں مکہ سے ہجرت کرتے ہوئے تین روز آپ ﷺ نے پناہ لی تھی، یہ غار پہاڑ کی چوٹی سے ذرا نیچے واقع ہے اور سطح زمین سے ۴۵۸ میٹر کی بلندی پر ہے، اس پہاڑ پر چڑھنا نسبتاً زیادہ دشوار ہے، راقم الحروف نے تو اسے صرف نیچے ہی سے دیکھا؛ لیکن بہت سے لوگ ہمت کرکے اوپر تک پہنچ گئے، —— مکہ ہی میں جنت المعلیٰ کا قبرستان بھی واقع ہے، اس قبرستان میں بھی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم مدفون ہیں، ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی قبر یہیں اسی قبرستان میں واقع ہے اور شناخت بھی قائم ہے، ایک دن بعد نماز فجر وہاں بھی جانے اور زیارت کرنے کی توفیق میسر آئی، تاریخی اعتبار سے ایک قابل دید چیز "نہر زبیدہ" بھی ہے، جسے عباسی حکمراں ہارون رشید کی بیوی نے تعمیر کرایا تھا، یہ پختہ نہر "حنین" سے شروع ہوکر مکہ مکرمہ تک پہنچتی ہے، بحیثیتِ مجموعی ۳۶ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے، عرصہ تک اہل مکہ اسی سے پینے کا پانی حاصل کرتے تھے۔

❑ ❑ ❑ ❑

کوئے جاناں میں چند دن

دین کی بنیاد خدا اور رسول کے تصور پر ہے، توحید اگر دینِ حق کی خشت اول ہے، تو رسالت کو تسلیم کئے بغیر ایمان وجود میں نہیں آ سکتا؛ اسی لئے جس کلمۂ شہادت کو ایمان کا عنوان اور مسلمان ہونے کی پہچان قرار دیا گیا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ ساتھ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی ذکر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا یقین ہی کافی نہیں ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مسلمان کا دل آپ ﷺ کی محبت سے سرشار ہو اور آپ ﷺ کی عظمت اس کے دل و نگاہ میں اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور چیز اس کے ہم پایہ نہ ہو، مولانا جامیؒ کے بقول :

بعد از خدا بزرگ تو ای قصہ مختصر

اس لئے کون مسلمان ہوگا، جس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہ ہوگی؟ اس حقیر نے اپنے والد مرحوم کو بچپن میں دیکھا کہ وہ بڑے شوق و محبت سے نعتیہ اشعار کہتے اور گنگناتے تھے، جیسے قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتے تھے، اسی طرح کثرت سے درود شریف بھی پڑھتے تھے اور اٹھتے بیٹھتے زبان پر درود کے الفاظ رہتے تھے، یہ بھی دیکھا کہ سیرت کے واقعات بیان کرتے ہوئے آواز رندھ جاتی تھی اور آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، اس لئے بے شعوری کی عمر ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام اور ذکر مسعود سے اُنس پیدا ہو گیا تھا، پھر جوں جوں عمر بڑھتی گئی، ذکر یار کی لذت بھی بڑھتی گئی، آخر وہ دن آ ہی گیا کہ :

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے

رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ میں عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد ایک دن ہم لوگ مدینہ

منورہ کے لئے روانہ ہوئے ،سید حبیب علی صاحب کی گاڑی میں مَیں ، میری والدہ اور اہلیہ اور خودان کے بچے مدینہ منورہ کے لئے نکلے،خوشی کا عجیب عالم اور ولولۂ شوق کی عجیب کیفیت تھی ، زبان پر درود شریف ، دماغ میں سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات کی خوشگوار یادیں اور آنکھوں میں اس احساس کے ساتھ نمی کہ :

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ؟

جب ''مسجدِ قبا'' پار کی تو خیالی ہوا کہ گاڑی سے اتر کر پیادہ پا چلنا چاہئے ،حضرت نانوتویؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب مدینہ کے قریب پہنچے،تو سواری سے اُتر کر ننگے پاؤں حریم اقدس ﷺ تک پہنچے اور حضرت امام مالک کا تو حال یہ تھا کہ مدینہ میں رہنے کے باوجود زندگی بھر چپل پہن کر مدینہ منور کے حدود میں نہیں چلے اور قضائے حاجت کے لئے بھی مدینہ سے باہر کا رُخ کرتے ؛لیکن سب لوگوں کے ساتھ ہونے ، راستہ کے نشیب وفراز سے واقف نہ ہونے اور سمندر کی موجوں کی طرح اُٹھتی ہوئی ٹریفک کے بہاؤ کی وجہ سے یہ بات ممکن نہیں ہوسکی ، مسجدِ قبا کے قریب ہی سے مسجد نبوی کے فلک بوس ،خوبصورت اور خوش منظر مینارے دعوت نظارہ دے رہے تھے اور منزل کے قریب ہونے کا احساس طبیعت کو بے قابو کررہا تھا ، پھر مسجد قریب آئی اور گنبد خضراء نظر آیا،تو کوئی آنکھ نہ تھی جو چھلک نہ آئی ہو،نماز تراویح شروع ہوچکی تھی ،اس لئے ہم لوگ سیدھے مسجد میں داخل ہوئے اور نماز میں مصروف ہوگئے،شیخ حذیفی رقیق القلب آدمی ہیں؛اس لئے قرآن مجید پڑھنے کے درمیان بار باران پر گریہ طاری ہوتا تھا،انھوں نے ہی وتر کی نماز بھی پڑھائی اور طویل ورقت انگیز دُعاء فرمائی،نماز کے بعدُ باب السلامُ کی طرف سے داخل ہوکر روضۂ مبارکہ پر حاضر ہوا،اس وقت جو کیفیت تھی ، اسے الفاظ کا پیکر نہیں دیا جاسکتا،ایسا لگتا تھا کہ کوئی بچھڑا ہوا بیٹا اپنے شفیق اور غمخوار وغمگسار باپ سے ملا ہو،نگاہیں جھکی ہوئی اور اشکبار،زبان پرلرزہ،قدموں میں شوق کے پر لگے ہوئے ؛لیکن ساتھ ہی احساسِ گناہ کی زنجیر بھی ، جب قبر شریف کا سامنا ہوا،تو صلاۃ وسلام کا تحفہ پیش کیا گیا،

دل میں کیا کیا ارمان تھے اور کن کن الفاظ میں تحفۂ درود وسلام پیش کرنے کا ارادہ تھا؟ لیکن غلبۂ جذبات کی وجہ سے الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے، جو کچھ توفیق ہوئی، صلوٰۃ وسلام عرض کیا گیا، اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تحفۂ سلام پیش کرکے آگے بڑھا اور ڈھیر ساری دُعائیں کیں۔

یوں تو روضۂ شریف پر بار بار حاضری کی سعادت ملتی رہی ہے اور خدا کرے کہ آئندہ بھی ملتی رہے؛ لیکن اس حاضری کے بعد سب سے زیادہ تاثر اس وقت رہا، جب بابری مسجد کی شہادت کے بعد حاضری ہوئی؛ چوں کہ دل بھرا ہوا تھا، اس لئے بے ساختہ چند اشعار بھی نوکِ زبان پر آگئے :

کچھ غلامانِ ہندی ہیں آئے ہوئے
چوٹ کھائے ، ہوئے دل دُکھائے ہوئے

خونِ دل میں سراپا نہائے ہوئے
زخم سینوں پر اپنے سجائے ہوئے

سنگ پر سنگ ہنس ہنس کے کھائے ہوئے
غم کے بادل ابھی تک ہیں چھائے ہوئے

ایک مدت ہوئی گیت گائے ہوئے
ایک زمانہ ہوا مسکرائے ہوئے

ہیں کھڑے چشم پُرنم جھکائے ہوئے
ہاتھ اپنی طلب کے اُٹھائے ہوئے

ان کی آنکھوں میں آنسو کی سوغات ہے
روز جور وجفا سے ملاقات ہے

بس یہی ہے خطا ، ایک یہی بات ہے
کہہ نہ پائے کبھی دن کو ہم رات ہے

خوش اگر ہم سے پھر بھی تیری ذات ہے
شعلہ ہو ، سنگ ہو ، خار ہو ، مات ہے

غم نہیں ہے ، اگر غم کی برسات ہے
کہ یہ اہل جنوں کی مدارات ہے

تجھ پر قربان ہم ، تجھ پر لاکھوں سلام
ہے یہی اُمت ہند کا ایک پیام

مسجد نبوی کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ خود رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بنیاد رکھی ہے اور بنفس نفیس اس کی تعمیر میں شرکت فرمائی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں نماز ادا کرنے کو دوسری مسجدوں کے مقابلے سوائے مسجد حرام کے ایک ہزار گنا زیادہ باعثِ ثواب قرار دیا ہے،(بخاری : کتاب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکة والمدینة،حدیث نمبر:۱۱۹۰)—— بلکہ بعض روایتوں میں پچاس ہزار کا بھی ذکر آیا ہے —— اور علماء نے لکھا ہے کہ مسجدِ نبوی یا مسجدِ حرام میں جو کچھ توسیع ہوگی ، وہ بھی اجر وثواب کے اعتبار سے ان مسجدوں ہی کے حکم میں ہے،(شرح مھذب:۸/۲۷۷،وفاء الوفاء:۱/۳۵۷)—— نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جو شخص میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کرے اور کوئی نماز نہ چھوٹے ،اس کے لئے آگ سے اور نفاق سے براءت ہے، علامہ ھیثمیؒ نے اس روایت کو مسند احمد اور طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور اسے معتبر بھی قرار دیا ہے۔

(مجمع الزوائد : کتاب الحج ، باب فیمن صلی بالمدینة أربعین صلاة،حدیث نمبر:۵۸۷۸)

یہ مسجد ایک ہجری میں پہلی بار تعمیر ہوئی ، پھر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات

ہجری میں دوطرف سے اس میں مزید اضافہ کیا، پھر سن سترہ ہجری میں سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے جانبِ قبلہ یعنی جنوب کے علاوہ شمال اور مغرب کی طرف سے اضافہ کیا، اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے سن ۲۹ ہجری میں مسجد کو وسیع بھی فرمایا، نیز منقش پتھروں اور چونے سے تعمیر کرائی اور ساگوان کی لکڑی سے چھت بنوائی، چوں کہ مسجد کی مشرقی سمت میں ازواج مطہرات کے حجرات تھے؛ اس لئے اب تک مشرقی جانب میں کوئی توسیع نہیں کی گئی، اموی فرماں روا ولید بن عبدالملک نے جب توسیع کا ارادہ کیا تو ازواجِ مطہرات کی وفات ہوچکی تھی؛ چنانچہ اموی فرماں روا ولید بن عبدالملک نے ۹۱ ہجری میں جب مسجد کی توسیع کی تو مشرقی حصہ میں مسجد نبوی کی توسیع کرتے ہوئے شمال ومغرب میں بھی اضافہ کیا، منقش اور خوبصورت پتھروں سے عمارتیں اور ستون بنے، ستون میں اندر سے لوہے اور سیسے پگھلا کر ڈالے گئے، مسجد کی دہری چھت بنائی گئی، تاکہ نمازی سردی وگرمی سے محفوظ رہ سکیں، اس تعمیر میں اندر کے حصہ میں سنگِ مرمر اور اس پر سونے کی پلیٹیں بھی استعمال کی گئیں، یہ تعمیر مدینہ کے گورنر حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زیر نگرانی کی گئی۔

عباسی گورنر مہدی عباسی نے ۱۶۵ھ میں پھر مسجد نبوی کی توسیع کا کام شروع کیا، ۱۶۱ھ تا ۱۶۵ھ تعمیر کا یہ کام مکمل ہوا، اس بار شمالی جانب مسجد کے حصے میں وسیع اضافہ کیا گیا، آتشزدگی کے بعض واقعات کے پس منظر میں اس کے بعد بھی کئی بار تعمیر و ترمیم کا سلسلہ جاری رہا؛ لیکن از سرِنو پوری مسجد کی تعمیر اور اس میں اضافہ کا شرف اللہ کی طرف سے ترکوں کے لئے مقدر تھا، چنانچہ سلطان عبدالمجید نے ۱۲۶۵ھ تا ۱۲۷۷ھ کے درمیان مسجدِ نبوی کی تعمیر کا کام کرایا، نہایت ہی اہتمام کے ساتھ وادیٔ عقیق سے سرخ پتھر تلاش کئے گئے اور مسجد کے ایک ایک حصہ کو منہدم کر کے نقشے کے مطابق تعمیر کا کام کیا گیا، نیز مسجد کی چھت اس شان سے بنائی گئی کہ پوری چھت گنبدوں کا مجموعہ تھی، یہ چھوٹے بڑے ایک سوستر گنبد ہیں، عمارت کے اندرونی حصہ میں خوبصورت پتھر لگائے گئے ہیں اور ان پر میناکاری اور سوناکاری کی گئی ہے، نیز قرآن مجید کی

آیات نہایت خوبصورت حروف میں لکھی گئی ہیں اور گنبدوں کے اندر نقاشی اور آیات کی کتابت کی گئی ہے، یہ سب تعمیر اور آرٹ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور آج بھی ترکوں کا تعمیر کیا ہوا حصہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ترکی تعمیر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ عمارت کے حسن اور فی الجملہ یکسانیت کو برقرار رکھتے ہوئے علامات بھی باقی رکھی گئی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو حصہ مسجدِ نبوی میں شامل تھا، ان میں ستونوں کے اوپری حصہ پر سنہرے رنگ میں خوبصورت نقش و نگار کے ساتھ ''مسجد النبی'' لکھا ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں محراب جس جگہ پر واقع تھا، وہاں محراب بنا کر اس کو نمایاں کیا گیا ہے، جو حصہ ''ریاض الجنہ'' کا ہے، اس میں سفید سنگ مرمر کے ستون لگائے گئے ہیں اور منبر اقدس سے حجرۂ عائشہ تک جو آپ کی گذرگاہ تھی، اس میں ان سفید پتھروں کے درمیان سرخ مرمر کی پٹی لگائی گئی ہے، اس طرح ایسی علامات باقی رکھی گئی ہیں، جن سے مسجد کے خصوصی مقامات کی وضاحت ہوتی ہے، افسوس کہ بعد کی توسیعات میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

ترکی تعمیر میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ عہدِ نبوی کی تعمیر میں جہاں جہاں ستون تھے، ان ہی مقامات پر ستون بنائے جائیں، اسی طرح ''اسطوانۂ حنانہ، اسطوانہ عائشہ، اسطوانۂ ابولبابہ، اسطوانۂ سریہ، اسطوانۂ وفود، اسطوانۂ حرس، اسطوانۂ جبرئیل، منبر نبوی'' یہ سب مقامات جن سے حیات نبوی کے مختلف واقعات متعلق ہیں کی علامات کو برقرار رکھا گیا، —— ترکی تعمیر کا یہ پہلو بڑا ہی قابل تعریف ہے۔

ترکی توسیع کے تقریباً سو سال کے بعد ۱۳۶۸ھ تا ۱۳۷۵ھ میں بعض ترمیمات کے ساتھ مسجد کی کافی بڑی توسیع کی گئی، نیز مسجد کے باہر اسبسٹس کے سائبان بھی ڈالے گئے، تاکہ اژدحام کے وقت لوگ اس میں بھی نماز ادا کرسکیں، پھر ۱۴۰۵ھ میں خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز نے توسیع شروع کی، جس کا بڑا حصہ مکمل ہو چکا ہے اور ابھی اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے، سعودی عہد کی یہ دونوں توسیعات بہت بڑی ہیں اور ان میں بڑی فیاضی اور فراخدلی

سے کام لیتے ہوئے اعلیٰ ترین پتھر اور اشیاء استعمال کی گئی ہیں، ان دونوں توسیعات میں یکسانیت بھی رکھی گئی ہے اور اب یہ پوری تعمیر اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے ایک عالمی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، جب یہ توسیع صحن کے ساتھ مکمل ہوجائے گی، تو اس میں بیک وقت سات لاکھ لوگ نماز ادا کرسکیں گے، (۱) مسجد میں ۲۷ متحرک گنبد بھی موجود ہیں، جن کو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ہٹایا اور پھر اپنی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔

مسجدِ نبوی کے میناروں کی بھی اپنی ایک شان ہے، اب اس مسجد پر کل دس مینار ہیں، دو مینار تو ترکی حصہ میں واقع ہے اور دو ملک عبدالعزیز والے توسیعی حصہ میں اور چھ مینار شاہ فہد کے دور کے، یہ تمام ہی مینار حسن و جمال کا پیکر ہیں، یوں تو سارے ہی مینار اونچے ہیں؛ لیکن یہ چھ نئے مینار نہایت ہی بلند یعنی ۱۰۴ کلو میٹر اونچے ہیں، اور اس کے ڈیزائن میں ایسی لطافت ونزاکت ملحوظ ہے کہ بس انسان دیکھتا رہ جائے! مینارے پر روشنی کا بھی کچھ ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ گویا عمارت کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔

مسجدِ نبوی سے متصل ''صفہ'' بھی تاریخی حیثیت کا حامل ہے، یہ اسلامی تاریخ کا پہلا مدرسہ ہے، اب یہ جگہ مسجد نبوی کا حصہ بن چکی ہے، عام طور پر حجرۂ فاطمہ کے سامنے جو چبوترہ ہے، لوگ اسے صفہ خیال کرتے ہیں؛ لیکن یہ درست نہیں ہے، یہ تو اصل میں روضۂ اقدس کے محافظین کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔

بہر حال قبر شریف کی زیارت کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے اور نماز تہجد کے وقت پھر مسجد واپسی ہوئی، خیال تھا کہ اس وقت آسانی سے ''ریاض الجنۃ'' میں جگہ مل جائے گی؛ لیکن لوگوں کا ایک ہجوم تھا، جو مسجد کی طرف جا رہا تھا اور ایک دوسرے پر سبقت کے لئے کوشاں تھا،

(۱) بحمد اللہ اب یہ توسیع مکمل ہوچکی ہے، اس تعمیر کا ایک نادر الوقوع حصہ قدیم مسجد نبوی کے سامنے موجود دو کھلے ہوئے صحنوں میں مینار نما چھتریوں کی تعمیر ہے، جب چھتری کھول دی جاتی ہے تو ایک خوبصورت اور خوشنما خیمہ کی چھت محسوس ہوتی ہے، اور جب بند ہوجاتی ہے تو مینارہ نظر آتا ہے، توسیعات کی تکمیل کے بعد اب یہاں تقریباً سات لاکھ نمازیوں کے لئے بیک وقت نماز ادا کرنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے۔

بہر حال کسی طرح ریاض الجنۃ میں جگہ مل گئی اور یہیں تہجد ادا کی گئی، آج کے تہجد میں بھی بڑا لطف آیا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے جنت کی زمین ہے اور پیش گاہِ ربانی کے سایہ میں شفیع آقا کی سفارش کے ساتھ غلامِ بےنوا اپنی بندگی اور دُعاء والتجاء کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔

مسجدِ نبوی کے ذکر کے ساتھ حجرۂ شریفہ کا ذکر بھی ضروری ہے؛ پیغمبر کی جہاں وفات ہوتی ہے، وہیں ان کی تدفین بھی عمل میں آتی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ہوئی؛ اس لئے یہیں آپ کو دفن کیا گیا، پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقب میں کسی قدر نیچے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین عمل میں آئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے کے مقابل ہو، پھر اسی حجرہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی قدر نیچے حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن کئے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کاندھوں کے مقابل ہے، یہاں قبر کی ایک اور جگہ موجود ہے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام دفن کئے جائیں گے، عرصہ تک یہ معمول رہا کہ جب روضہ شریف کی دیواریں شکستہ ہو جاتیں، تو انھیں اور مضبوط شکل میں تعمیر کر دیا جاتا، قبور مبارکہ کے حصہ پر کوئی چھت نہیں تھی اور قبریں کچی تھیں؛ لیکن جب قبر شریف سے جسدِ اطہر کو نکالنے کی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے اور شیخین کے جسد مبارک کو نکالنے کی روافض کی طرف سے مختلف ناکام سازشیں ہوئیں تو روضۂ اطہر کے چاروں طرف زیر زمین سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار نورالدین زنگی کے عہد میں چن دی گئی، اوپر سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پنج پہل جو دیوار بنائی تھی، اسے مضبوط کیا جاتا رہا اور حفاظتی نقطۂ نظر سے پہلے لکڑیوں کا اور پھر پتھر کا گنبد بنا دیا، یہ گنبد اصلاً سلیٹ کے رنگ کا تھا؛ اسی لئے قدیم مصنفین نے اسے سفید گنبد اور نیلے گنبد سے ذکر کیا ہے، ترکوں کے عہد میں سلطان محمود عثمانی کے حکم سے پہلی دفعہ اس گنبد پر سبز رنگ کیا گیا اور اس طرح اب یہ ''گنبدِ خضراء'' سے معروف ہے، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر پر ایک گنبد نیچے ہے اور اس کے عین اوپر گنبد

ِ خضراء ہے اور اندر کا گنبد بالکل بند ہے؛ البتہ اس پر اور گنبد خضراء پر ایک چھوٹا سا سوراخ کسی قدر دھوپ اور بارش کے قطرات کے اندر جانے کے لئے باقی رکھا گیا ہے۔

روضۂ اطہر پر بحمد اللہ ہر وقت ہدیۂ صلاۃ وسلام پیش کرنے والوں کا اژدحام رہتا ہے، اس میں بے اعتدالیاں بھی ہوتی ہیں، بعض حضرات زور زور سے سلام پڑھتے ہیں، حالاں کہ یہ احترام کے منافی ہے: ''لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ''(الحجرات:۲) —— اسی طرح بعض لوگ قبر شریف کے سامنے مرادیں مانگنے لگتے ہیں؛ حالاں کہ مرادیں تو اللہ سے مانگنی ہیں، آپ ﷺ پر تو صلاۃ وسلام پیش کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا، حیدرآباد کے ایک بزرگ مولانا شریف حسین ترمذیؒ تھے، وہ دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے اور انھوں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، غالباً ۱۳۹۹ھ یا ۱۴۰۰ھ میں انھوں نے حج کیا تھا، سفر سے واپسی پر مولانا نے تاثرات بیان فرمایا، اس میں اس حقیر کو بھی شرکت کا موقع ملا، مولانا نے بتایا کہ وہ روضۂ اطہر کے باہر صحن کے حصہ میں کھڑے تھے، ایک خاتون وہاں آئی، جو واپسی کا رختِ سفر باندھ رہی تھی، دیر تک درود وسلام پڑھتی رہی اور واپس ہوتے ہوئے اشکبار آنکھ اور دلگیر آواز میں کہنے لگی: ہم نے آپ کو غوث پاک کی حفاظت میں چھوڑا، الغرض کہ جب غلو پیدا ہو جاتا ہے، تو انسان اللہ کے اختیارات کو اس کے بندوں میں تقسیم کرنے لگتا ہے۔

اگلی صبح فجر کے بعد ہم لوگ مدینہ کے مشہور قبرستان ''جنت البقیع'' میں پہنچے، شاہ فہد نے اس قبرستان کی بھی توسیع کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص مدینہ میں مر سکے تو یہاں مرنے کی کوشش کرے، یعنی اخیر وقت میں مدینہ میں آجائے، اس لئے کہ بہت سے لوگ ہیں جو اس قبرستان میں آسودۂ خواب ہونے کی حسرت ساتھ لے کر چلے گئے اور بہت سے وہ ہیں جن کے دل میں ابھی بھی یہ حسرت مچل رہی ہے، یہ جگہ جسے ''غرقد'' نامی درختوں کی کثرت کی وجہ سے ''بقیع غرقد'' کہا جاتا تھا، مسلمانوں کا قدیم قبرستان ہے

اور عہد نبوی ہی سے اس میں تدفین کا سلسلہ جاری ہے، حضرت خدیجہؓ اور حضرت میمونہؓ کے سوا تمام اُمہات المومنین اس قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں، حضرت فاطمہؓ کے بشمول آپ ﷺ کی چاروں صاحبزادیاں اور آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اسی قبرستان کا حصہ ہیں، یہیں آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور آپ ﷺ کی پھوپھیاں حضرت صفیہؓ اور حضرت عاتکہؓ مدفون ہیں، کئی اہل بیت، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی قبریں جنت البقیع میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کم وبیش دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم یہاں مدفون ہیں اور محدثین وفقہاء اور دیگر صالحین کا تو ذکر ہی کیا؟

جب آپ جنت البقیع کے موجودہ دروازہ سے داخل ہوں گے تو دائیں جانب کسی قدر بلندی پر حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی قبریں نظر آئیں گی، اہل تشیع کے غلو آمیز رویہ کی وجہ سے آج کل وہاں جانے کی اجازت نہیں ملتی، پھر سامنے جو راستہ بنا ہوا ہے، اس میں بائیں جانب کسی قدر نشیب میں آپ ﷺ کی پھوپھیاں حضرت صفیہؓ اور حضرت عاتکہؓ کی قبریں ہیں، جب سامنے کے راستے سے آگے بڑھیں تو راستہ سے متصل دائیں جانب سب سے پہلے حضور ﷺ کی صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور اُم کلثومؓ کی قبریں ہیں، اس کے آگے حضور ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ مدفون ہیں، اس سے آگے بڑھیں تو ابوطالب کے صاحبزادے حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ مدفون ہیں، اس سے کچھ اوپر مشہور فقیہ ومحدث امام مالکؒ اور ان کے خاص استاذ حضرت نافعؒ کی قبریں ہیں، موجودہ راستہ یہاں سے دوطرف آگے بڑھتا ہے، دائیں طرف سے آخر میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے، جو پہلے جنت البقیع سے باہر تھی، اب توسیع کے بعد اندر آگئی ہے اور بائیں طرف ایک مستطیل احاطہ ہے، اس میں ان شہدائے اُحد کی قبریں ہیں جن کی لاشیں مدینہ سے لے آئی گئی تھیں، ان قبروں سے آگے بڑھ کر بائیں جانب کی دیوار احاطہ سے کچھ آگے بڑھ کر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی قبر ہے، ان تمام قبروں پر گنبد بنے ہوئے تھے،

لوگ یہاں آکر مرادیں مانگتے تھے اور طرح طرح کی بدعات کی جاتی تھیں؛ اس لئے ملک عبدالعزیز کے دور حکومت میں یہ تمام گنبد منہدم کردیئے گئے اور قبریں اپنی اصل حالت میں باقی رکھی گئیں۔

مختلف توسیعات کے بعد اس وقت جنت البقیع کا رقبہ تقریباً پونے دولاکھ مربع میٹر ہے، گنبدوں کے انہدام سے یہ بڑا فائدہ ہوا کہ بہت سی بدعات کا سد باب ہوگیا؛ لیکن کم سے کم قبروں کی شناخت اور علامات کو باقی رکھا جانا چاہئے تھا، کہ انسان جب گذری ہوئی نشانیوں کو دیکھتا ہے، خاص کر وہ نشانیاں جن سے قربانی و جاں نثاری کے واقعات متعلق ہوں، تو ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے، آخر اسی لئے تو مقام ابراہیم کو نماز گاہ بنایا گیا، حضرت ہاجرہ کے صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا کی طرف چلنے کی ادا کو حج وعمرہ کا رکن مقرر کیا گیا، منیٰ میں قربانی اور جمرات پر رمی یہ سب کے سب علامتی عمل ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ آثارِ مقدسہ کو باقی رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے، ہاں، یہ ضروری ہے کہ عوام کو غلو سے بچایا جائے، سر کے درد کا علاج درد کی دوا دینا ہے نہ کہ سر کاٹ دینا، کاش! جن لوگوں کو حرمین شریفین کی خدمت کا اعزاز دیا گیا ہے، وہ اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھیں!

اسی دن نماز عصر کے بعد اُحد حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، اس پہاڑ کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: یہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جب آپ ﷺ باہر سے سفر کر کے مدینہ واپس تشریف لاتے اور اس پہاڑی پر نظر پڑتی تو سواری کی رفتار تیز کردیتے، یہ پہاڑ اصل میں مدینہ سے ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر واقع تھا؛ لیکن اب شہر کی آبادی اور مکانات تسلسل کے ساتھ پہاڑ تک پہنچ گئے ہیں، یہ پہاڑ مشرق سے مغرب تقریباً پانچ میل پر واقع ہے، یہ سرخی مائل پہاڑ ہے، جس میں ایک خاص طرح کی چمک محسوس ہوتی ہے اور اپنی رنگت کے اعتبار سے حجاز کے دوسرے پہاڑوں سے مختلف ہے، پہاڑ کے دامن میں ایک میدانی حصہ ہے، یہیں سن ۲ھ میں مسلمانوں اور مشرکین

مکہ کی فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئیں، اس میدان کے بعد ایک چھوٹا سا ٹیلہ بھی ہے، اس ٹیلہ کو "جبل العینین" کہتے تھے، چوں کہ ٹیلہ سے متصل پانی کا دو چشمہ تھا، اسی لئے اس کو جبل العینین کہا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد کے درمیان جنگی حکمت عملی کے تحت تیراندازوں کا ایک دستہ اس پہاڑی پر متعین کر دیا تھا، تاکہ مسلمان فوج کی پشت کی طرف سے دشمنوں کا حملہ نہ ہو سکے، اسی مناسبت سے اس پہاڑی کا نام اب "جبل الرماۃ" ہو گیا ہے، اُحد کے میدان میں ایک بڑا احاطہ ہے، جس میں سید الشہداء حضرت حمزہ، حضرت عبداللہ بن جحش اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم کی قبروں کے نشانات نمایاں ہیں؛ لیکن ان کے علاوہ اور شہداء بھی مدفون ہیں، یہاں ایک سمت سے جالیاں لگی ہوئی ہیں، ان ہی جالیوں سے شہداء اُحد کی زیارت کی جاتی ہے، جب اُحد پہنچا، تو غزوۂ اُحد کی پوری تاریخ نگاہوں میں گھوم گئی کہ کس کس طرح جاں نثارانِ اسلام نے اپنے لہو کے ذریعے اسلام کے شجر طوبیٰ کو سیراب کیا، یہیں اُحد میں آپ کا دندانِ مبارک بھی دفن ہے۔

میں بہت مشتاق تھا کہ اس غار تک پہنچوں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہونے کے بعد لے جائے گئے تھے، چنانچہ ایک سفر میں محبّ مخلص ڈاکٹر سید ریاض الرحمٰن وہاں تک لے کر گئے، یہ غار تھوڑی بلندی پر واقع ہے، کسی قدر مشکل کے ساتھ چڑھ کر ہم لوگ وہاں پہنچے، غار کے اندر ایک مسطح چکنا پتھر ہے، جس پر بیٹھا یا لیٹا جا سکتا ہے، اونچائی اتنی نہیں ہے کہ آدمی کھڑا ہو سکے، غار کی وضع ایسی ہے کہ جب آدمی اندر چھپ جائے تو باہر سے نظر نہیں آ سکتا، یہاں آ کر خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دین کی اشاعت کے لئے کیسی کیسی ابتلائیں برداشت کی ہیں اور آج اُمت دعوت دین کے فریضے سے ایسی غافل ہے کہ گویا یہ ایک زائد کام ہے۔

مدینہ منورہ میں متعدد مسجدیں ہیں، جن کی زیارت ٹیکسی والے کراتے ہیں، ان میں "مسجد اجابہ" بھی ہے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی، اُمت کے حق میں بعض دُعائیں مقبول ہوئیں،

ان میں ''مسجد قبلتین'' بھی ہے، یہ مسجد قبیلۂ بنوحارثہ میں واقع تھی، درمیان نماز ہی قبلہ کی تبدیلی کی اطلاع ہوئی اوراسی وقت نمازیوں نے قبلہ تبدیل کرلیا، یہاں بیت المقدس کے سمت میں بھی ایک محراب بنی ہوئی ہے، جودراصل قبلۂ اول کی علامت ہے، مگر بہت سے لوگ جہالت کی بنیاد پراس رُخ پر بھی نماز پڑھنے لگتے ہیں، حالاں کہ جب اس رُخ پر نماز پڑھنا منسوخ ہوگیا، تواب ادھر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، ان ہی مساجد میں مساجد سبعہ ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی کمرہ دو کمرہ کے برابر سات مسجدیں ہیں، جوکوہ سلع کے دامن میں واقع ہیں، یہیں غزوۂ خندق ہوئی تھی، کوہ سلع کو اپنی پشت پر رکھ کرایک طویل خندق شیخین نامی مقام سے کوہ سلع کے مغربی حصہ تک ؛ بلکہ اس کے آگے تک کھودی گئی، یہ خندق بعض اہل علم کی رائے کے مطابق پانچ ہزار گز لمبی، نوگز چوڑی اور سات گز یا پانچ گز گہری تھی، مسلمانوں کے مقابلہ اتحادی فوج —— جس میں مکہ کے تمام قبائل کے علاوہ بنوغفار، بنوفزارہ اور یہود بھی شامل تھے —— ایک جُٹ ہوکر مسلمانوں پر حملہ کیا، جن کی تعداد کم وبیش ہزار تھی، جب کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کل تین ہزار تھی ؛ اس لئے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر ایرانیوں کے طریقے کے مطابق دفاعی خندقیں کھودی گئیں، چوں کہ اعدائے اسلام کے تمام گروہوں نے مل کر حملہ کیا تھا، اسی لئے اس کو ''غزوۂ احزاب'' بھی کہتے ہیں۔

اسی پہاڑ کے دامن میں مسلمان خیمہ زن تھے، چنانچہ مختلف صحابہ کی جائے قیام پر ان کے نام سے چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں، جیسے مسجد ابوبکر، مسجد عمر، مسجد علی، کسی قدر بلندی پر مسجد فتح ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب تھا، جب دشمنوں کے بھاگنے کی اطلاع ملی تو یہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ شکر ادا کیا، یہ اہل مکہ کا مدینہ پر آخری حملہ تھا، اس کے بعد پھر انھیں حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، یہ جگہ سیرت نبوی کا ایک اہم باب مسلمانوں کے سامنے رکھتی ہے ؛ لیکن افسوس کہ آج کل لوگوں نے اسے ایک تفریح گاہ بنالیا ہے ؛ کیوں کہ یہاں پر کھانے پینے کی اشیاء بھی فروخت ہوتی ہیں اور بچوں کے کھیل کود کا

بھی انتظام ہے۔والی اللہ المشتکی

ہفتہ کے دن بعد نماز فجر ہم لوگوں نے مسجد قبا کا رُخ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے، تو سب سے پہلے آپ نے یہیں مسجد کی بنیاد رکھی، خود قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے: '' لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیه ''(توبہ:۱۰۸) —— اس مسجد میں نماز پڑھنے کی خصوصی فضیلت ہے اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ ہفتہ کے دن وہاں تشریف لے جاتے اور نماز ادا فرماتے، یہ مسجد بالکل سادہ تھی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کو دوبارہ تعمیر کرایا، سعودی حکومت سے پہلے عثمانی حکمراں سلطان محمود خاں نے ۱۲۴۶ھ میں اس کی تعمیر کی، خادم حرمین شریفین شاہ فہد کے عہد میں جہاں حرمین شریفین کی توسیع کا کام ہوا ہے، وہیں مسجد قبا کی تعمیر نو اور اس کی توسیع بھی ہوئی ہے، اب یہ بہت ہی وسیع وعریض اور خوبصورت مسجد ہے، جس کے منور مینارے دور سے چشم شوق کو دعوت نظارہ دیتے ہیں، یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے آثار تو محفوظ نہیں ہیں؛ البتہ ایک طرف وسیع وعریض ستون ہیں، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسی قدر مسجد قبا کا حصہ تھا، یہ بات بھی نقل کی جاتی ہے کہ اس وقت مسجد قبا کا بیت الخلاء جہاں واقع ہے، وہیں پر منافقین کی بنائی ہوئی مسجدِ ضرار تھی، جسے آپ ﷺ کے حکم سے منہدم کر دیا گیا تھا۔واللہ اعلم

مدینہ منورہ کی ایک قابل ذکر جگہ ''سقیفۂ بنوساعدہ'' بھی ہے، سقیفہ کا ترجمہ چوپال سے کیا جا سکتا ہے، یہ عرب کے معاشرہ میں ایک عمومی مجلس کی جگہ ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لئے گئے تھے، وہاں نماز بھی ادا کی گئی تھی اور حضور ﷺ کی وفات کے بعد انتخاب خلیفہ کے لئے یہیں مشورہ ہوا تھا، جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر بیعت کی، اب اس جگہ کا صحیح پتہ نہیں چلتا، البتہ اس کے ایک حصہ پر باغیچہ اور ایک حصہ پر بجلی اسٹیشن ہے، جیسا کہ سینہ بہ سینہ نقل کیا جاتا ہے، راقم الحروف نے یہ جگہ محبّ

عزیز مولانا الطاف حسین مالانی (متعلم: جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کے ساتھ دیکھی ہے، سقیفۂ بنوساعدہ کے قریب ہی ''بیئر بضاعہ'' تھا، اس کنویں کا حدیث میں بار بار ذکر آیا ہے، یہ بھی اب مسجدِ نبوی کے صحن میں آ گیا ہے۔

مدینہ کے دو اور بھی آثار قابل ذکر ہیں، ایک تو بیئر عثمان، جسے سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا، یہ کنواں اب بھی موجود ہے، معروف نہ ہونے کی وجہ سے لوگ یہاں پہنچ نہیں پاتے اور حکومت کا بھی منشاء یہی ہے کہ لوگ ایسی جگہوں کو زیارت گاہ نہ بنالیں، راقم الحروف کو مولانا الطاف مالانی کے ساتھ وہاں بھی پہنچنے کا موقع ملا، یہ کنواں خاصا گہرا ہے اور پانی بھی اچھی مقدار میں معلوم ہوتا ہے، کنویں کے اوپر لوہے کی جالی ہے، جس سے جھانک کر دیکھا جاسکتا ہے اور اوپر سے پانی نظر آتا ہے، کنویں سے متصل ایک باغ بھی ہے، جو غالباً اسی کنویں کے پانی سے سیراب ہوتا ہے، کنویں میں پانی کھینچنے کا موٹر بھی لگا ہوا ہے، یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا اخلاص ہے کہ ان کا وقف اب تک محفوظ اور قابل استفادہ ہے۔

عرصہ سے خواہش تھی کہ کعب بن اشرف کا قلعہ دیکھا جائے، کیوں کہ اس سے بھی عہد نبوی کی ایک تاریخ وابستہ ہے، مولانا الطاف مالانی وہاں مجھے لے کر گئے، اب یہ حصہ مدینہ کی حدود میں آ گیا ہے، یہ پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنا ہوا ایک مضبوط قلعہ ہے، چاروں طرف موٹی اور اونچی فصیلیں ہیں، مختلف برجیاں بھی بنی ہوئی ہیں، جن کی قلعوں کی حفاظت ونگرانی میں بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی، اس قلعہ کا بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے؛ لیکن اب بھی بعض جہتوں سے قلعہ کی دیواریں، برجیں اور اندر بنے ہوئے چھت دار کمرے نیز بالا خانے موجود ہیں، یہ اور یہودیوں کے اس طرح کے قلعے مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے مرکز تھے، یہ قلعے اپنے زمانے میں بڑے عالی شان رہے ہوں گے، کعب بن اشرف مسلمانوں سے سخت بغض رکھتا تھا، غزوۂ اُحد کے لئے قریش کو بھڑکانے والوں میں وہ بھی تھا، اسی محل میں ۱۴ ربیع

الاول ۳ھ کو یہ شخص قتل کیا گیا، اب یہ قلعہ نما محل جو اپنے قدیم شان وشوکت کا پرتو ہے، مایۂ عبرت بن کر کھڑا ہے۔

ہجرت کے پہلے سال ہی مسلمانوں پر اہل مکہ کی یلغار شروع ہوگئی تھی اور مسلمانوں اور کافروں کا باضابطہ معرکہ بدر میں پیش آیا تھا، بدر ساحل سمندر سے قریب مدینہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہیں مجاہدین اسلام اور مشرکین مکہ کا مقابلہ ہوا؛ اس لئے سیرت نبوی میں اس کی حیثیت بڑے اہم واقعہ بلکہ تاریخ کے ایک موڑ کی ہے؛ اس لئے عرصہ سے خواہش تھی کہ اس مقام کی زیارت کرنی چاہئے، چنانچہ ایک سفر میں مولانا محمد یوسف مفتاحی اور میرے لڑکے محمد عمر عابدین سلمہ کے ساتھ جمعہ کے بعد بدر کے لئے روانگی ہوئی، راستہ میں ہم لوگ بیئر روحاء پر رکے، بدر جاتے ہوئے اس مقام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر رہا تھا اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کنویں میں آپ ﷺ نے اپنا لعاب دہن ڈالا اور اس سے پانی نوش فرمایا تھا، اس لئے ہم لوگ پہلے یہیں رُکے، یہ کافی گہرا مدوّر شکل کا چوڑا کنواں ہے، کنویں کی منڈھیر کو لوہے کی جالی سے بند کر دیا گیا ہے، جس سے صاف طور پر پانی نظر آتا ہے، پانی کھینچنے کے لئے موٹر بھی لگا ہوا ہے اور بازو میں خزانہ آب بھی ہے، جو پانی سے لبریز رہتا ہے، غالباً اس سے گرد وپیش کے علاقے سیراب بھی کئے جاتے ہیں، ہم لوگ یہاں اُترے، اس پانی سے وضو کیا اور یہاں پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں نماز عصر ادا کر کے آگے بڑھے۔

مغرب سے پہلے ہی ہم لوگ بدر پہنچ گئے، بدر میں جس جگہ مسلمانوں کی فوج واقع تھی، وہ کسی قدر نشیبی حصہ ہے، اور وہاں کی مٹی نسبتاً نرم ہے، اس سے متصل ''مسجد عریش'' ہے، یہ کسی قدر بلندی پر واقع ہے، عریش کے معنی چھپر کے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چھپر ڈالا گیا تھا، آپ ﷺ یہاں گریۂ ودُعاء میں مصروف تھے اور بلندی پر ہونے کی وجہ سے میدانِ جنگ پر نظر بھی رکھے ہوئے تھے، اس کی دوسری جانب فراز ہے، جو پتھریلی زمین پر مشتمل ہے، اس طرف مشرکین کی فوجیں تھیں اور اسی حصہ میں ان کے مقتولین دفن بھی

کئے گئے تھے، آج کل اس حصہ پر وہ روڈ بنی ہوئی ہے، جس کے ایک طرف وہ باغات ہیں، جن کو اسلامی فوج کا مسکن کہا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ حصہ ہے، جہاں مشرکین کی فوج تھی، آج کل اس حصہ میں وہاں کا عام قبرستان واقع ہے اور اسی سے متصل ایک چھوٹا سا حصہ وہ ہے، جس میں شہداء بدر آسودۂ خواب ہیں، مشہد بدر کی زیارت کے بعد ہم لوگوں نے مسجد عریش میں نماز مغرب ادا کی۔

مدینہ سے بدر جاتے ہوئے بہت سے وہ مقامات ملتے ہیں، جن کا سیرت کی کتابوں میں ذکر آیا ہے اور جن کے نام اب بدل گئے ہیں، یہ پورا حصہ کہیں چھوٹے کہیں اونچے پہاڑی اور پہاروں کے بیچ آنے والی وادیوں سے معمور ہے، پہاڑ بھی مختلف رنگتوں کے ہیں، کہیں سیاہی مائل، گویا جلے ہوئے پتھر ہوں، کہیں سرخی لئے ہوئے، کہیں ریت سے بالکل خالی اور کہیں ریت سے اس طرح ڈھکے ہوئے گویا پہاڑوں نے ریت کی چادر اوڑھ رکھی ہو، پھر ریت بھی کہیں سفید اور کہیں سرخی مائل، راستہ میں جابجا دیہات بھی آتے ہیں، کسی زمانے میں یہ دیہات شہری سہولتوں سے محروم تھے؛ لیکن اب ساری سہولتیں مہیا ہیں، مسافرانِ شوق کو راستہ کا یہ پیچ و خم اور ان کی نیرنگیاں بھی آنکھوں میں بسا لینے کی خواہش ہوتی ہے؛ کیوں کہ اسی راہ سے ان کے محبوب اور محبوب کے جاں نثاروں کا قافلہ گذرا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

❑ ❑ ❑ ❑

سرحد کے اُس پار

ہند و پاک کے درمیان جغرافیائی فاصلہ بہت معمولی ہے، دہلی سے لاہور اتنا دور بھی نہیں جتنا دہلی لکھنؤ یا حیدر آباد سے بمبئی، تہذیبی وثقافتی یکسانیت بھی اس درجہ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر اجنبیت اور بیگانگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا، وہی کھانے پینے کا ذوق، رہنے سہنے کا ڈھنگ، عمارتوں کا طرزِ تعمیر، بازاروں اور دکانوں کی زیبائش، ہرے بھرے کھیت، جابجا گھنے جنگل اور کھلے میدان، لیکن برطانیہ اور مغربی استعمار کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ جس ملک سے نکلو یا نکالے جاؤ، وہاں کچھ سرحدی اور قومی اختلاف کی بیج بو کر اور نفرت کا درخت لگا کر جاؤ؛ تا کہ صدیوں تک جنگ جاری رہے اور ان کو بالواسطہ محکوم بنا کر رکھا جائے، بدقسمتی سے ہند و پاک بھی اسی کا شکار ہیں اور سیاسی فاصلہ نے ان کے درمیان اتنا بعد پیدا کر دیا ہے کہ اس وقت وہ دریا کے دو ساحل ہیں، اتنے قریب کہ صبح وشام ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کریں اور اتنے دور کہ کبھی باہم بغل گیر نہ ہو سکیں۔

اس نے سب سے زیادہ نقصان علمی وادبی رشتوں کو پہنچایا ہے، دونوں طرف اہل علم ودانش اور اصحابِ زبان وادب ایک دوسرے سے فکر وخیال کے تبادلہ کے لئے مضطرب ہیں، لیکن سیاسی رکاوٹیں ان کے لئے زنجیر پا ہیں، اس پس منظر میں عرصہ سے دل مچلتا تھا کہ کبھی پاکستان کا سفر میسر ہو اور وہاں کے علمی وادبی اداروں، انجمنوں اور شخصیتوں نیز ان کے کاموں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے، اس تمنا کے بر آنے کی اُمید اس وقت روشن ہوئی جب ''بین الاقوامی اسلام آباد یونیورسٹی'' کے ذیلی شعبہ ''ادارہ تحقیقاتِ اسلامی'' کی طرف سے ''بین الاقوامی امام ابوحنیفہ کانفرنس'' کے لئے مقالہ لکھنے کی دعوت آئی، ملک معراج خالد اس یونیورسٹی

کے ڈائرکٹر ہیں، یہ غالباً ۲ سال پہلے کی بات ہے، لیکن زیادہ عرصہ نہ گذر پایا تھا کہ ملک میں ایک سیاسی بھونچال آیا اور ملک معراج خالد کارگذار وزیر اعظم بن گئے، اور عرصہ تک کانفرنس کی بابت کوئی اطلاع نہ آئی، ستمبر ۱۹۹۸ء میں ادارہ کا مکتوب موصول ہوا، جس میں کانفرنس کے لئے مقالہ کی منظوری کی اطلاع اور ۵ تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۸ء کانفرنس کے انعقاد کا مژدہ تھا، لیکن کچھ ملکی حالات اور کچھ اپنی شخصی ضروریات کے تحت سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا، بعد کو دوبارہ دعوت نامہ اور ایر ٹکٹ آیا اور کچھ اور رفقاء نے بھی عزم سفر کیا، تو اب کمند ہمت نے قدم بڑھایا، پڑوسیوں کے لئے ہندو پاک کا ویزا حاصل کرنا کچھ آسان کام نہیں، پاکستانی سفارت خانہ کے سامنے سفر کے آرزومند بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں کا بے ترتیب، بدن سے بدن چھلتا ہوا ازدحام دیکھ کر ممکن نہیں کہ حساس دل پسیج نہ جائے، لیکن دعوت نامہ نے اس جاں گسل معرکہ کو نسبتاً آسان کیا اور صبح سے شام تک کی تگ و دو کے بعد خدا خدا کر کے ویزا لگا۔

ہندوستان سے جناب عبدالرحیم قریشی (حیدرآباد)، مولانا عتیق احمد قاسمی (لکھنؤ)، مولانا سلمان حسنی ندوی (لکھنؤ)، مولانا فہیم اختر ندوی (دہلی) اور راقم الحروف اس کانفرنس میں مدعو تھے، ہمارا یہ قافلہ ۲ / اکتوبر کو پاکستان کے لئے روانہ ہوا، ۶ بجے شام کو جہاز نے اڑان بھری، ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ کپتان نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد لاہور اترنے والا ہے، اس سے احساس ہوا کہ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے سے کتنا قریب رکھا ہے، لیکن یہاں اختلاف نے ہمارے درمیان ایک مصنوعی فاصلہ پیدا کر دیا ہے، کاش اس حقیقت کو ان دونوں ملکوں کے اربابِ اقتدار سمجھیں۔

دہلی سے اُڑان بھرنے کے بعد صرف ۳۵ منٹ میں ہم لاہور ہوائی اڈہ پر تھے، نیچے اترنے کے بعد ایسا لگتا تھا، جیسے ہم اپنے ہی ملک میں ہوں، لاہور کراچی کے بعد پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے، اور اس کا ہوائی اڈہ انٹرنیشنل ہوائی اڈہ ہے، لیکن ہوائی اڈہ بہت چھوٹا ہے، میرا خیال ہے کہ حیدرآباد بنگلور کے ہوائی اڈہ سے بھی چھوٹا، جہاں سے ملک و بیرون ملک کی

پروازیں نکلتی ہیں، باہر کا پلیٹ فارم ایک بڑے ریلوے اسٹیشن سے زیادہ طویل نہیں، جس میں ایک طرف بیرون ملک اور دوسری طرف اندرون ملک کے مسافرین کے لئے انتظار اور ضروری کارروائی کی جگہ مقرر ہے۔

لاہور ایرپورٹ پر مولانا سلمان حسینی ندوی کے کچھ اعزہ اور متعلقین موجود تھے، جو غائبانہ ہم لوگوں سے بھی واقف تھے، ان حضرات کی تشریف آوری نے اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیا، ایرپورٹ ہی کے کیفے میں چائے پی گئی، مولانا سلمان صاحب تو یہیں رُک گئے اور ہم لوگوں نے اسی وقت اسلام آباد کا جہاز پکڑا، لاہور سے اسلام آباد کم وبیش چار سو کیلومیٹر پر واقع ہے، اور پون گھنٹہ میں جہاز لاہور سے اسلام آباد پہنچ جاتا ہے، اسلام آباد انٹرنیشنل ایر پورٹ خوبصورت لیکن چھوٹا ہے ایرپورٹ پر کانفرنس کے منتظمین کی جانب سے ڈاکٹر محمد ادریس استاذ کلیہ اُصول الدین اسلام آباد یونیورسٹی موجود تھے، ان ہی کی معیت میں ہم لوگ قلب شہر میں واقع ''ہالی ڈے ان ہوٹل'' پہنچے، یہ اسلام آباد کا سب سے معیاری ہوٹل سمجھا جاتا ہے اور واقعی ہوٹل کے نظم ونسق سے اس کی تائید ہوتی ہے، یہ فائیو اسٹار ہوٹل ہے، لیکن بہت سی لہوو لعب — جو ایسے ہوٹلوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہے — سے محفوظ ہے، تمام کام کرنے والے مرد ہیں، ہر کمرہ میں سمت قبلہ کی نشاندہی کی گئی ہے اور ہوٹل میں نماز کے لئے تمام ضروریات کے ساتھ ایک ہال بنا ہوا ہے، پاکستان میں چوں کہ شراب پر پابندی ہے، اس لئے کھلے عام لوگ شراب پیتے اور پلاتے نظر نہیں آتے۔

اسلام آباد نہایت خوبصورت اور جاذب نظر شہر ہے، نہایت عمدہ، صاف ستھری اور چوڑی سڑکیں، سڑکوں کے درمیان سبزہ زار، خوبصوت اور پُر رونق بازار، خوبصورت اور زیادہ تر ایک دومنزلہ عمارتیں، تمام عمارتیں منصوبہ بند طور پر بنی ہوئیں اور ان میں کسی قدر یکسانیت، بڑے بڑے پارک، روشنی کا معقول انتظام، قدم قدم پر خوبصورت مسجدیں، اور مسجدوں پر سرو قد مینارے، شہر کے مرکز میں ایوان صدر، قومی اسمبلی اور وزیر اعظم کا

سکریٹریٹ بنایا گیا ہے، یہ عمارتیں سفید، پرشکوہ اور خوبصورت ہیں، شہر ایک پہاڑی سلسلہ پر ختم ہوتا ہے۔

شہر کے اس آخری حصہ میں انٹرنیشنل اسلام آباد اسلامی یونیورسٹی اور مسجد فیصل واقع ہے، اس یونیوسٹی کا شمار دنیا کی بڑی اسلامی یونیورسیٹیوں میں ہوتا ہے، اس وقت اس یونیورسٹی میں ساٹھ ممالک کے ہزاروں طلبہ زیر تعلیم ہیں، یونیورسٹی کے تحت مختلف تعلیمی شعبہ جات کے علاوہ متعدد ذیلی تحقیقاتی ادارے بھی ہیں، ان ہی میں ''ادارہ تحقیقات اسلامی'' ہے جس نے اب تک عربی میں پانچ، اُردو میں پینتالیس اور انگریزی میں چھیاسی علمی وتحقیقی کتابیں شائع کی ہیں، اسی ادارہ نے ڈاکٹر تنزیل الرحمان کی ''مجموعہ قوانین اسلام'' کی نشر واشاعت کا اہتمام کیا ہے اور متعدد بنیادی عربی کتابوں کو جو فقہ وحدیث کے اہم مراجع میں سے ہیں، کے اُردو ترجمے کرائے ہیں، ادارہ تحقیقات اسلامی کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری ہیں، جو بہت کم گو لیکن ذہین، نرم خو اور متوازن فکر ومزاج کی حامل شخصیت ہیں، اور مختلف المزاج لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یونیورسٹی کے تحت شریعہ اکیڈمی اور دعوہ اکیڈمی بھی قائم ہے، شریعہ اکیڈمی نے اسلامی قانون کے مختلف موضوعات پر مختصر لیکن نہایت اہم رسائل مراتب کرائے ہیں، ججوں کی تربیت کے لئے چوبیس کتابوں پر مشتمل ایک نصابی سیٹ مرتب کیا گیا ہے، جو علماء اور قانون دانوں کے لئے یکساں قابل مطالعہ ہے، افسوس کہ اکیڈمی کے ذمہ داروں اور خود ہم لوگوں کی خواہش کے باوجود وقت کی تنگی کی وجہ سے ہم اکیڈمی نہیں جا سکے، لیکن ذمہ داروں نے اکیڈمی کی مطبوعات کا گراں قدر تحفہ ہم لوگوں تک پہنچا دیا۔ فجزاهم الله خير الجزاء .

دعوہ اکیڈمی میں ہم لوگوں کو خود حاضر ہونے کا موقع ملا، ڈاکٹر انیس اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہیں اور وہ دعوت کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے دعوت واصلاح کے مختلف الجہات کام کر رہے ہیں، اس شعبہ کے تحت ائمہ کی تربیت اور مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر

کی منتقلی کا بڑا اچھا کام ہو رہا ہے، ایک زبان سے دوسری زبان میں کتابوں کے ترجمہ کے لئے کسی تعصب اور گروہی تنگ نظری کے بغیر مفید کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے، اس ادارہ نے بچوں کے لئے اسلامی اور اخلاقی کتابوں کی ایک نہایت معیاری اور دلچسپ سیریز بھی شائع کی ہے، جو قریب قریب پچاس رسائل پر مشتمل ہے، ڈاکٹر انیس صاحب نے بہت تفصیل سے اس ادارہ کی کارکردگی اور اثرات ونتائج کا تعارف کرایا، اور ہم لوگوں نے بھی کچھ مشورے دیئے، ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء ماشاءاللہ فراخ چشم اور کشادہ قلب لوگ ہیں اور کسی بھی مسئلہ پر اعتدال کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں، پاکستان کے ماحول میں اس میانہ روی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی لائبریریاں ہیں اور ہر لائبریری میں اپنے موضوع کے لحاظ سے کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری مصادر ومراجع کا بڑا قیمتی مخزن ہے، اس لائبریری میں ایک لاکھ ستائیس ہزار کتابیں ہیں، جن میں دوسو اکسٹھ مخطوطات ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس لائبریری کو ''ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری'' کا نام دیا گیا ہے، لائبریری میں مختلف اہل علم وذوق کی عطیہ کی ہوئی کتابیں مختلف گوشوں کے نام سے موسوم ہیں، جن میں گوشۂ انصاری اور گوشۂ نیازی خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہ مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا کوثر نیازی کی طرف منسوب ہیں، لائبریری میں دنیا بھر سے رسائل کے منگانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، مستقل طور پر جو رسائل منگائے جاتے ہیں، ان کی تعداد سات سواسی ہے، اور غیر مستقل طور پر جو رسائل آتے ہیں ان کی تعداد بھی ڈیڑھ ہزار ہے، جناب شہزور خاں لائبریری کے ذمہ دار ہیں، نوجوان لیکن صاحبِ ذوق ہیں، اور ہر ماہ مختلف اسلامی موضوعات پر شائع ہونے والے معیاری اور معلوماتی مضامین کا انڈکس تیار کرتے ہیں، راقم الحروف سے بھی وہ اسی نسبت سے واقف تھے، انھوں نے بڑی خوش اخلاقی اور محبت کے ساتھ لائبریری کا معائنہ کرایا، سہ ماہی ''بحث ونظر'' پٹنہ کے بہت مداح اور معترف ہیں، چنانچہ

بار باراس رسالہ کا ذکر کرتے رہے۔

لائبریری پرایک طائرانہ نظر ڈال کر ہم لوگ یونیورسٹی کے نائب الرئیس ڈاکٹرمحمود احمد غازی کے دفتر پہنچے، ڈاکٹر صاحب کی عمر بہت زیادہ نہیں، لیکن مطالعہ وسیع بھی ہے اور عمیق بھی، بہت ذکی، اپنے مدعا کے اظہار پر قادر، عربی، اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں پڑھنے لکھنے بولنے کی صلاحیت کے حامل، خوش اخلاق اور منکسر المزاج، علمی رشتہ سے ہم لوگوں سے پہلے سے واقف تھے، باوجود کثرت مشاغل کے متعدد بار ہوٹل میں قدم رنجہ ہوئے اور تفصیل سے گفتگو کی، یونیورسٹی کا بھی تفصیلی تعارف کرایا، ڈاکٹر صاحب کے انکسار کا حال یہ ہے کہ ایک روز شام میں دیر تک ''شریعت بل'' اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر دیر تک مصروف گفتگو رہے اور اس بات کو ذکر تک بھی نہیں کیا کہ وہ آج ہی پاکستان سپریم کورٹ کی شرعی وفاقی عدالت کے جج مقرر ہوئے ہیں، کل ہو کر ہم لوگوں کو اخبار سے اس کی اطلاع ملی اور اگلی ملاقات میں ہم لوگوں نے ان کو مبارک باد بھی پیش کی اور یہ توقع بھی ظاہر کی کہ وہ اس اہم عہدہ کو نفاذ شریعت کا ذریعہ بنائیں گے، ڈاکٹر صاحب نے بین ملکی قانون پر امام محمدؒ کی نہایت اہم، مستند اور ابتدائی کتاب ''سیر صغیر'' کو ایڈٹ بھی کیا ہے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی، کانفرنس کے موقع سے صدر پاکستان کے ہاتھوں اس کتاب کی رسم اجراء عمل میں آئی۔

یونیورسٹی کے قریب ہی سبز دوپٹہ اُوڑھے ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں ''مسجد فیصل'' ہے، اس مسجد کا شمار دنیا کی بڑی مسجدوں میں ہے، مسجد اور اس کی متعلقات چھیالیس ایکڑ کے علاقہ میں واقع ہے، اصل مسجد اور میناروں کا حصہ (برآمدوں کو چھوڑ کر) باون ہزار مربع فٹ ہے، مسجد، برآمدہ اور اس کے صحن کو ملا کر قریب ایک لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہے، چار مینارے ہیں اور ہر مینارہ دوسو پچاسی فٹ اونچا ہے، ۱۹۶۶ء میں اس مسجد کے لئے موجودہ جگہ کا انتخاب عمل میں آیا تھا، مسجد کے ڈیزائن کے لئے ۱۹۶۹ء میں بین الاقوامی مقابلہ رکھا گیا اور بالآخر ترکی انجینئروں کا یہ نادر اور منفرد نقشہ قبول کیا گیا، اکتوبر ۱۹۷۶ء میں شاہ خالد (سعودی عربیہ)

نے مسجد کا سنگ بنیاد رکھا، مسجد کے برآمدہ میں اپریل ۱۹۸۷ء میں پہلی امامت فرمائی اور ۱۸ جولائی ۱۹۸۸ء کو اس مسجد کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی اور شاہ فیصل شہیدؒ کے نام اس مسجد کو موسوم کیا گیا۔

یہ مسجد فن تعمیر کا ایک نمونہ ہے، اس مسجد کی چھت ایک سو چالیس فٹ اونچی ہے اور مسجد کا اندرونی رقبہ تراسی ہزار مربع فٹ کے قریب ہے، اس کے باوجود مسجد کے درمیان میں کوئی ستون نہیں، اس کا فانوس بھی نہایت خوبصورت اور منفرد انداز کا ہے، چھ ٹن وزنی ہے اور اس میں گیارہ سو بلب نصب ہیں، اور یہ چین کے ایک مسلمان کاریگر کی مہارت اور لطافت ذوق کا نتیجہ ہے، مسجد کی مغربی سمت میں ایک خوبصورت نیلا تالاب بنایا گیا ہے تاکہ ہوا ٹھنڈی ہو کر آئے، مسجد کے چاروں طرف اور خاص کر مشرقی جانب نہایت وسیع اور خوبصورت پارک ہے، رات کے وقت جب ہر چہار جانب روشنی جلتی ہے تو اتنا دلآویز منظر ہوتا ہے کہ نظر ہٹائے نہ ہٹے، گویا زمین کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی ہو، اس مسجد میں بنیادی طور پر خیمہ کا تصور دیا گیا، کیوں کہ قرن اول میں اسلام کی دعوت و اشاعت میں خیمہ بدوش داعیوں اور مجاہدوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔

اسی مسجد کے سامنے واقع پارک کے سبزہ زار میں جنرل ضیاء الحق شہید کی قبر ہے، لوگوں نے یہاں بھی عقیدت کے گل کھلائے ہیں، قبر پر چادر اور پھول کے علاوہ بہت سے لوگ اپنی حاجات سے متعلق عرضیاں بھی لٹکائے ہوئے ہیں، البتہ قبر بڑی حد تک سادہ سی ہے، محسوس ہوا کہ پاکستان کے عام لوگوں میں جنرل ضیاء الحق شہید کے تئیں قدردانی اور تشکر کے جذبات ہیں، ان کا احساس ہے کہ اس فوجی صدر نے ملک کو ایک نئی طاقت اور اعتماد سے سرفراز کیا ہے، اور دفاعی اعتبار سے پاکستان نے جو سفر طے کیا ہے اور افغانستان میں روسیوں کو انخلاء پر جس طرح مجبور کیا گیا، بنیادی طور پر اس کا سہرا صدر مرحوم کے سر ہے۔

ہم لوگ ۳/ اکتوبر کو اسلام آباد پہنچ گئے، جب کہ سیمینار کا آغاز ۵/ اکتوبر سے ہونا تھا،

اس لئے دودنوں اسلام آباد شہر کو دیکھنے اور ایک نظر راولپنڈی پر ڈالنے کا موقع مل گیا، راولپنڈی اور اسلام آباد جڑواں شہر ہے اور دونوں میں وہی فرق محسوس ہوتا ہے جو پرانی دہلی اور نئی دہلی کے منصوبہ بند شہری علاقوں کے درمیان ہے، راولپنڈی پرانی وضع کا شہر ہے گنجان آبادی، اونچی اونچی، نئی پرانی، ملی جلی عمارتیں، کہیں کشادہ اور کہیں تنگ سڑک، اسلام آباد اور راولپنڈی میں کئی دینی مدارس بھی ہیں، اسلام آباد میں غالباً سب سے بڑا دارالعلوم جامعہ حسینیہ فریدیہ ہے، جہاں چھ سات سو طلبہ زیر تعلیم ہیں، دورۂ حدیث اور افتاء تک تعلیم ہوتی ہے، ماشاء اللہ نوجوان اور اصحابِ ذوق مدرسین ہیں، اس جامعہ کے طلبہ اور فضلاء نے جہاد افغانستان میں بھی سرگرم حصہ لیا ہے، مولانا عبداللہ مرحوم جامعہ کے مہتمم تھے، وہ راقم الحروف کی تالیفات کی نسبت سے غائبانہ واقف تھے، نام سن کر خود تشریف لائے، ہم لوگوں کو مدعو کیا اور اساتذہ وطلبہ سے خطاب بھی رکھا، افسوس کہ ہندوستان پہنچنے کے دوسرے ہی دن یہ نامبارک خبر پڑھنے کو ملی کہ کچھ دہشت گردوں نے ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے، وہ بہت متحرک، فعال اور بااثر لوگوں میں سے تھے، اسلام آباد کی لال مسجد کے امام اور پاکستان رؤیت ہلال کمیٹی کے صدر تھے، انجمن ''سپاہ صحابہ'' سے تعلق تھا، غالباً یہی تعلق اس حادثہ کا باعث بنا۔ رحمه الله رحمة واسعة .

۵/ اکتوبر کو ''ہولی ڈے اِن ہوٹل'' کے خوبصورت اور تمام عصری سہولتوں سے آراستہ کانفرنس ہال میں ''بین الاقوامی امام ابوحنیفہؒ کانفرنس'' کا آغاز عمل میں آیا، خود صدر پاکستان نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی، جناب ملک معراج خالد سابق کارگذار وزیراعظم پاکستان نے خیر مقدمی کلمات کہے، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اس کانفرنس کے انعقاد کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ نے بہت ایمان افروز صدارتی خطبہ دیا، اور پاکستان میں قانون شریعت کے نفاذ کے حوالہ سے فقہ حنفی کی اہمیت پر روشنی ڈالی، صبح ۹ تا ۱۱ کی اس افتتاحی نشست کے بعد ساڑھے گیارہ سے کانفرنس کی علمی نشستیں شروع ہوئیں اور دوسری نشست میں جناب خالد انور وزیر قانون پاکستان نے صدارت کی، اور نشست میں

علماء کو اس جانب متوجہ کیا کہ وہ آئین کو اسلامی روح بخشنے میں ہمارا تعاون کریں، انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اسلام اور جمہوریت کے تقاضوں کو ہم آہنگ کر کے آگے بڑھنا چاہئے اور کہا کہ ہماری اصل کوتاہی یہ ہے کہ ہم عمل میں کوتاہ ہیں۔

۵ تا ۸/ اکتوبر دس علمی نشستیں ہوئیں، جن میں امام ابوحنیفہؒ کی زندگی آپ کی فقہ، فقہ حنفی کے اُصول، احادیث سے اخذ واستنباط میں فقہ حنفی کا رجحان، فقہ حنفی کی خصوصیات اور احناف کے فقہی ذخائر وغیرہ، جیسے اہم موضوعات پر مقالات پیش کئے گئے، ان مقالات کی تعداد ساٹھ سے متجاوز تھی، مقالات کی کثرت کی وجہ سے علمی نشستوں کو گروپ (الف) اور گروپ (ب) میں تقسیم کردیا گیا تھا، ہر مجلس کے اختتام پر مناقشہ کا موقع دیا جاتا اور شرکاء بحث میں حصہ لیتے، بحمد اللہ ہندوستانی وفد نے بھی مناقشات میں بھرپور حصہ لیا، ہندوستانی وفد میں جناب عبدالرحیم قریشی صاحب کا مقالہ انگریزی زبان میں تھا اور اس کا موضوع تھا ''برطانوی نوآبادیات میں مسلم پرسنل لا'' مولانا سلمان ندوی صاحب کا مقالہ ''فقہ حنفی کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب کے نقطۂ نظر'' سے متعلق تھا، مولانا عتیق احمد بستوی نے اپنے مقالہ میں ''اُصولِ فقہ میں حنفیہ کی وقیع خدمات'' پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کو واضح کیا کہ حنفیہ ہی اس فن کے موسس ہیں، مولانا فہیم اختر ندوی نے ''فقہ حنفی میں جدید مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت'' پر گفتگو کی تھی، راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں ''حدیث سے اخذ واستنباط میں حنفیہ کے طریقہ ومنہج'' کو واضح کیا تھا اور اس بات کو نمایاں کیا گیا تھا کہ جہاں اُصول روایت کے اعتبار سے نقد حدیث کی خدمت محدثین کا کارنامہ ہے، وہیں اُصول درایت کے لحاظ سے نقدِ حدیث حنفیہ کی ایسی خدمت ہے جو کسی طرح محدثین کی خدمت سے کم نہیں، بحمد اللہ ان مقالات کی پذیرائی ہوئی، اور ان پر طویل بحث ومباحثہ بھی ہوا۔

سیمینار کی زبان عربی، اُردو اور انگریزی تھی، اور تینوں زبانوں میں ساتھ ساتھ ترجمہ کا معقول انتظام تھا، بیس ممالک کے نمائندے اس کانفرنس میں شریک تھے جو ایشیاء،

یورپ اور افریقہ سے تعلق رکھتے تھے، شرکاء میں ایک اہم شخصیت جرمن مستشرق ڈاکٹر مورانی (Dr. M. Muranyi) کی تھی، ان کا مقالہ اس موضوع سے متعلق تھا کہ بین ملکی قانون (سیر) کے باب میں فقہ مالکی نے فقہ حنفی سے کیا کچھ فائدہ اُٹھایا ہے، ان کا خیال ہے کہ فقہ مالکی میں اس موضوع سے متعلق جو قوانین ہیں وہ عام طور پر امام محمد کی سیر صغیر اور سیر کبیر سے ماخوذ ہیں۔

کانفرنس کا آخری اجلاس ۸/ اکتوبر کو بعد نماز مغرب منعقد ہوا، اس اجلاس میں جناب نواز شریف وزیر اعظم پاکستان بھی شریک ہونے والے تھے، لیکن اسی سے ایک دن پہلے جنرل جہانگیر کرامت کا نزاعی بیان اور اس کے نتیجہ میں ان کا استعفیٰ آچکا تھا، جس نے ایک سیاسی ہلچل سی پیدا کر دی تھی، اسی باعث وزیر اعظم خود شریک اجلاس نہ ہو سکے، البتہ ان کی جگہ سابق وزیر اعلیٰ سندھ اور موجودہ وفاقی وزیر اعظم پاکستان جناب غوث علی شاہ اجلاس میں شریک ہوئے، اختتامی اجلاس سے پہلے تجاویز کا سیشن بھی منعقد ہوا اور متعدد اہم تجاویز منظور ہوئیں اس اجلاس میں متعدد شرکاء نے ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے کام کو سراہتے ہوئے انھیں خطوط پر پاکستان میں ایسے ادارہ کے قیام پر زور دیا اور پاکستان میں قانون شریعت کے نفاذ کے پس منظر میں اس کو زیادہ ضروری اور اہم قرار دیا۔

جو تجاویز منظور ہوئیں، ان میں ایک اہم تجویز یہ تھی کہ حکومت پاکستان اسلامی مخطوطات اور خصوصاً فقہ حنفی کے مخطوطات کی تحقیق و اشاعت کا انتظام و اہتمام کرے، اکثر شرکاء نے اس جانب متوجہ کیا تھا اور جناب نواز شریف صاحب کی طرف سے ان کے نمائندہ کی حیثیت سے وزیر تعلیم نے اس سلسلہ میں بھرپور تعاون اور مدد کرنے کا یقین دلایا، ایک تجویز کے ذریعہ علماء اور مذہبی قائدین سے خواہش کی گئی کہ وہ اختلافات سے بالاتر ہو کر مشترکہ مسائل میں اتفاق اور یک جہتی کا ثبوت دیں، اس طرح یہ بین الاقوامی چار روزہ کانفرنس اختتام کو پہنچی۔

کانفرنس کے درمیان ہی جناب محمد رفیق تارڑ صدر پاکستان کی طرف سے بیرونی

مندوبین کو ظہرانہ پر مدعو کیا گیا، ظہرانہ ایوان صدر میں ترتیب دیا گیا تھا، جو اسلام آباد شہر کے قلب میں وسیع سبزہ زار کے درمیان واقع ہے، اور متعدد خوبصورت اور بلند قامت ہال پر مشتمل ہے، ظہرانہ سے پہلے جناب صدر نے مہمانوں سے فرداً فرداً ملاقات کی، مہمان کی طرف سے عالم اسلام کے ممتاز فقیہ اور محقق ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے مختصر لیکن نہایت پرسوز اور موثر خطاب کیا، انھوں نے اپنے خطاب میں پاکستان میں قانون شریعت کے نفاذ سے متعلق حکومت پاکستان کی مساعی پر مبارک باددی اور تمام مہمانوں کی طرف سے پاکستان کے استحکام اور قیام پاکستان کے مقاصد میں کامیابی کے لئے نیک تمنائیں پیش کیں، جناب صدر بہت متواضع، منکسر المزاج اور رہن سہن میں سادہ اور بے تکلف، لیکن ذہین اور معاملہ فہم نظر آئے، انگریزی اور اُردو میں تو قدرتِ کلام ہے ہی، ان کی گفتگو سے محسوس ہوا کہ فارسی زبان اور شعروسخن سے بھی خاصی مناسبت ہے کھلا ہوا رنگ، سفید، گھنی اور کسی قدر دراز ریش، متوسط قسم کا کپڑا، قمیص اور شلوار، سر پر جناح کیپ اور سیاہ صدری، فراخ جبیں، آنکھوں سے ذہانت جھانکتی ہوئی، کم گو اور متبسم، یہ ہے صدر پاکستان کا سراپا۔

کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر پہنچے، کھانے میں اسراف اور فضول خرچی نام کو نہ تھی، سادہ یا سادہ سے کسی قدر اچھا کھانا تھا اور بس، واپس ہوتے ہوئے صدر صاحب کچھ دور چھوڑنے کو آئے اور فرداً فرداً سبھوں سے ملاقات کی، اکثر شرکاء نے اور ہم لوگوں نے بھی قانون شریعت کے نفاذ پر مبارک باد پیش کی، وہ نہایت ہی انکسار کے ساتھ کہتے رہے کہ اس میں میرا کوئی دخل نہیں، سب کچھ اللہ ہی کی توفیق سے ہے، اور لوگوں سے دُعاء کی خواہش بھی کرتے رہے۔

کانفرنس کے درمیان دو دن نماز مغرب کے بعد ہوٹل ہی کے ایک نسبتاً وسیع ہال میں کھلے اجلاس بھی منعقد ہوئے، جس سے ڈاکٹر وہبہ زحیلی (دمشق)، علامہ سید ریاض حسین، مولانا جاوید ابراہیم پراچے، مولانا گوہر رحمٰن اور مولانا عبدالستار نیازی نیز ہندوستانی وفد سے

مولانا سلمان ندوی وغیرہ نے خطاب کیا اور زیادہ تر ان خطبات کا موضوع ''مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق اور قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ، نیز امام ابوحنیفہؒ کا علم و فضل اور درجۂ و مقام اور مسلمانوں کے لئے ان کی زندگی میں سبق'' جیسے موضوعات رہے، اس اجلاس کے کامیاب انعقاد اور بہتر انتظام و انصرام میں ڈاکٹر خالد مسعود، ڈاکٹر محمد الغزالی، غلام مرتضی آزاد، ڈاکٹر محمد طفیل، جناب ممتاز لیاقت وغیرہ کا بھی بڑا اہم حصہ ہے، یہ سبھی حضرات یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں۔

۹ تاریخ کی صبح ہم لوگوں کا قافلہ اسلام آباد سے روانہ ہوا، اور ہوائی جہاز کے ذریعہ جمعہ سے پہلے ہم لاہور پہنچے، سیمینار میں لاہور سے بہت سے مندوبین شریک تھے، اس لئے تعارف تو متعدد اہل علم سے تھا اور متعدد جگہ ہم لوگ مدعو بھی تھے، لیکن اس وقت لاہور تک کے سفر میں ایک خضر طریق کی ضرورت تھی تا کہ اس اجنبی شہر میں منزل تک پہنچنا آسان ہو، اسلام آباد کے مختلف اداروں اور اہل قلم کی طرف سے کتابوں کا جو گراں قدر تحفہ دیا گیا، طبیعت کسی طرح اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی، اس لئے نہایت اہم مسئلہ ان کتابوں کے لاہور تک لے جانے کا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ اس سفر میں مولانا محمد ریاض نوری (رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)، مولانا محمد سعد صدیقی (پروفیسر پنجاب یونیورسٹی) اور پنجاب یونیورسٹی ہی کے ایک اور استاذ (جن کے نام کے سلسلہ میں اس وقت حافظہ بے وفائی کررہا ہے) کی معیت نے اس مشکل کو بھی آسان کیا، ڈاکٹر محمد سعد صدیقی، معروف عالم حدیث مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے پوتے اور مولانا عبدالمالک صاحبؒ کے لڑکے ہیں اور خود صاحب ذوق، ملنسار اور متواضع آدمی ہیں، اس نسبت کی وجہ سے ان سے خاص موانست بھی رہی۔

مولانا سعد صاحب کے ساتھ ہم لوگ لاہور ایرپورٹ سے سیدھے جامعہ اشرفیہ لاہور پہنچے، یہ لاہور کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، فکر دیوبند کا حامل ہے اور معتدل مزاج تصور کیا جاتا ہے، قریب ۳ ہزار طلبہ یہاں زیر تعلیم ہیں، جامعہ کے موجودہ مہتمم مولانا عبیداللہ صاحب قدیم

علماء میں ہیں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں ، مولانا تھانویؒ کو دیکھا ہے اور ان کے عاشقوں میں ہیں، حدیث کے اسباق پڑھاتے ہیں، شعروسخن کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں، ملنسار، خوردنواز اور بڑے مہمان نواز ہیں، جمعہ کی نماز ہم لوگوں نے ان ہی کی اقتداء میں پڑھی، اسی دن جناب نواز شریف صاحب کی کوششوں سے قومی اسمبلی میں شریعت بل پاس ہوا تھا، مولانا نے نماز کے بعد اس نشست سے وزیراعظم اور ان کے رفقاء کو دُعائیں بھی دیں۔

ہندوستان سے پاکستان جانے والوں کے لئے یا وہاں سے یہاں آنے والوں کے لئے ایک اہم مسئلہ مقامی پولس اسٹیشن میں اپنے جانے اور آنے کی خبر دینا ہے، یوں تو ہم لوگ اسلام آباد میں بھی اس مرحلہ سے گذرے تھے، لیکن چوں کہ وہاں ہم لوگ ایک حد تک خود حکومت پاکستان کے مہمان تھے، اس لئے یہ مرحلہ بہ آسانی تمام ہوا، لیکن لاہور میں بار بار آتے جاتے پولس اسٹیشن کی حاضری میں کسی قدر دشواری ہوئی، بعض دفعہ انٹلی جنس کے لوگوں سے بھی سابقہ پیش آیا اور ان کے الٹے سیدھے سوالات کے جواب بھی دینے پڑے، کاش ان دونوں ملکوں کے درمیان باہمی اعتماد بحال ہو اور معزز شہریوں کو مجرموں کی طرح جواب دہی کرنے سے نجات ملے۔

لاہور برصغیر کا ایک اہم تاریخی شہر ہے، یہاں ہم لوگوں نے جو علمی ادبی ذوق دیکھا اور ایک زندگی اور حرکت کا احساس کیا، غالباً ہند و پاک کے کسی اور شہر میں ایسی زندگی نہیں، لاہور کا اُردو بازار کتابوں بلکہ کتب خانوں کا ایک مخزن ہے، گلی کوچوں میں دورویہ کتب خانے بنے ہوئے ہیں، کتابوں سے بھرے پڑے اور اصحابِ ذوق گاہکوں سے آباد، ہم لوگ جمعہ کے کچھ ہی دیر بعد کتابوں کی اس دنیا کی سیر کے لئے نکلے، میری کتاب ''جدید فقہی مسائل'' لاہور کے پانچ چھ مکتبوں سے طبع ہو چکی ہے اور اس کے بیسیوں ایڈیشن آچکے ہیں، حلال وحرام اور طلاق وتفریق بھی لاہور ہی سے طبع ہوئی ہے، '' قاموس الفقہ'' کو کراچی کے ایک مشہور مکتبہ نے شائع کیا ہے، ان میں بعض کتابوں کی پاکستان سے طباعت کا تو مجھے علم تک نہ تھا، امام ابوحنیفہؒ

کانفرنس میں آئے ہوئے مقالات میں جب ان کتابوں کے پاکستانی مطبوعہ نسخوں کے حوالے دیکھا تو اس وقت اندازہ ہوا کہ یہ کتابیں یہاں چھپ چکی ہیں، مولانا عتیق احمد صاحب اور مولانا فہیم اختر ندوی کی بھی بعض کتابیں اور کتابوں کے ترجمے یہاں طبع ہو چکے ہیں، اس لئے اس وسیع ''کتابستان'' میں ہم لوگ غیر متعارف نہیں تھے۔

ابھی اُردو بازار میں ایک دو فرلانگ ہی گئے ہوں گے کہ کتب خانہ سید احمد شہید پر نگاہ پڑی، نام دیکھ کر ہم لوگ کتب خانہ میں داخل ہوئے، تعارف ہوا، وہیں ایک ادھیڑ عمر مخلص موجود تھے، برادرم اعوان صاحب، انھوں نے نام سنتے ہی ہم لوگوں کو پہچان لیا، خود صاحبِ ذوق اور صاحب نظر ہیں اور ایسے ہی اہل نظر دوستوں کا ایک پورا گروپ رکھتے ہیں، جن میں جناب شبیر احمد میواتی، مولانا محمد ندیم اشرفی، سلامت اللہ شیخ اور ہندوستانی رسائل و جرائد کے عاشق جناب سجاد الٰہی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بس یہیں سے گویا ہم لوگ اغوا کر لئے گئے اور بھائی ندیم صاحب کے گھر پر مقیم ہوئے، سامان بھی ان ہی دوستوں کے ذریعہ جامعہ اشرفیہ سے ان کے گھر آ گیا، پھر ان حضرات نے ایسی تواضع اور محبت کا ثبوت دیا کہ ان کو الفاظ کا جامہ پہنانا دشوار ہے، بھائی شبیر صاحب بہت صاحبِ ذوق اور سنجیدہ ومتین آدمی ہیں، اور ہندوستان کے علماء واصحابِ قلم سے اور بالخصوص حلقۂ دیوبند سے بے حد محبت رکھتے ہیں، اور سیاسی اعتبار سے مولانا فضل الرحمٰن گروپ سے قریب ہیں، سجاد الٰہی صاحب ہندوستان سے اکثر معیاری رسائل وجرائد منگاتے اور اہل ذوق تک پہنچاتے ہیں، سہ ماہی ''بحث ونظر'' پٹنہ کے بہت مداح ہیں، اور زیادہ تر ''بحث ونظر'' ہی کے واسطے سے اس حقیر سے بھی مانوس ہیں، سہ ماہی ''صفا'' حیدرآباد کا نام ان کے کانوں تک پہنچ چکا ہے، لیکن رسالہ نہیں پہنچا، اس لئے اس کے بہت مشتاق نظر آئے۔

اُردو بازار کے کتب خانے ہندوستانی مصنفین اور اہل علم کی کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں اور یہاں کی مطبوعات بہت جلد وہاں طبع ہو جاتی ہیں، اس بات سے مسرت ہوئی کہ

پاکستان کے اصحابِ ذوق ہندوستان کے اہل علم کی چیزوں کو نہایت وقعت اور منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہاں کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔

لاہور میں ۱۰/ اکتوبر کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عربی اسلامیات میں مولانا عتیق احمد صاحب اور میں خطاب کے لئے مدعو تھا، پولیس کارروائی کی سرگرانی کی وجہ سے ہمیں پہنچنے میں تاخیر ہوئی، پھر بھی طلبہ وطالبات کا اجتماع ہوا، اساتذہ اور صدر شعبہ جمیلہ شوکت صاحبہ جن کی دعوت پر ہم لوگ یونیورسٹی گئے تھے، بھی اجتماع میں شریک تھیں، ہم لوگوں نے خاص طور پر اعتدال فکر، اختلاف کو برداشت کرنے کی قوت اور زمانہ وحالات سے قانون شریعت کی ہم آہنگی جیسے موضوعات کی طرف توجہ دلائی، یونیورسٹی کا یہ شعبۂ ''مرکز الشیخ زائد'' کہلاتا ہے، جسے متحدہ عرب امارات کے سربراہ شیخ زائد نے اپنے خصوصی فنڈ سے تعمیر کرایا ہے، مرکز کی عمارت نہایت خوبصورت، بلند، وسیع اور دیدہ زیب ہے، بہت ہی بڑے احاطہ (جس کو خوبصورت پارک اور سبزہ زار نے ڈھانپ رکھا ہے) کے بیچ سنگ مرمر سے بنی ہوئی سفید اور صاف وشفاف یہ عمارت بہت ہی خوشنما معلوم ہوتی ہے۔

طلبہ وطالبات سے خطاب کے بعد اساتذہ کے ساتھ بھی ایک نشست ہوئی جس میں باہمی تعارف بھی ہوا، اور یونیورسٹی میں علمی وتحقیقی کاموں کے بارے میں بھی واقفیت حاصل ہوئی، یونیورسٹی کی مطبوعات کا گرانقدر تحفہ بھی مہمانوں کو پیش کیا گیا، جس میں ایک بیش قیمت چیز یونیورسٹی میں پیش کئے جانے والے ''دکتورہ'' کے مقالات اور ان کا تعارف ہے۔

لاہور ہی میں '' منصورہ'' واقع ہے، جس میں جماعت اسلامی پاکستان کے دفاتر اور ذیلی ادارے ہیں، یہ ایک وسیع احاطہ ہے، جس کے وسط میں ایک کشادہ اور خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے، اور چاروں طرف ایک منصوبہ کے ساتھ بنی ہوئی خوش وضع عمارتیں ہیں، اسی احاطہ میں ادارہ ''معارفِ اسلامی'' قائم ہے، اس ادارہ نے مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے دوسرے اہل قلم کی بہت سی کتابوں کو بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے، مولانا مرحوم کے دست

راست جناب میاں طفیل محمد صاحب سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان اس ادارہ کے ڈائریکٹر ہیں، میاں صاحب سے ملاقات کا موقع ملا، دبلے پتلے، کھلا ہوا رنگ، سفید ریش، سفید اور سادہ کرتا پاجامہ، بینائی کی کمزوری کی وجہ سے بہت موٹا سا چشمہ، بڑی محبت اور شفقت سے ملے اور ہندوستانی مسلمانوں کے احوال پوچھتے رہے، ہم لوگوں نے بتایا کہ حالات میں تو نشیب وفراز آتا رہتا ہے، لیکن خدانخواستہ ہندوستانی مسلمان اتنے مجبور اور مقہور نہیں جیسا کہ پاکستان میں تصور کیا جاتا ہے، اور نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت فرقہ پرست ہے۔

آج کل ''ادارہ معارف اسلامی'' ایک اہم کام یہ کررہا ہے کہ مولانا مودودی نے احادیث کی تشریح وتوضیح کے طور پر جہاں جو کچھ لکھا ہے، ان کو ''تفہیم الحدیث'' کے نام سے اکٹھا کیا جارہا ہے، مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تفہیم الحدیث کی ۳ ضخیم جلدیں آچکی ہیں، اور چوتھی جلد کا مسودہ آخری مرحلہ میں ہے، اور مزید ایک دو جلدوں کے آنے کی توقع ہے، یہ کام جناب عبدالوکیل علوی صاحب کررہے ہیں، ان سے بھی ملاقات رہی۔

اسی ادارہ نے مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی ''اسلامی عدالت'' کا بہت ہی خوبصورت ایڈیشن شائع کیا ہے، یہ کتاب اہل علم کے درمیان بہت مقبول ہے، مولانا عتیق احمد قاسمی کی ''فکر کی غلطی'' بھی لاہور کے ایک اور مکتبہ کے علاوہ اس ادارہ نے بھی شائع کیا ہے، اور پاکستان کے لئے یہ کتاب ضرورت ہے، کیوں کہ ہندوستان میں تو مولانا وحید الدین خاں کی تحریروں کو مسلمان رد کرچکے ہیں، لیکن پاکستان کے لوگ ابھی تک ان کے افکار سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں۔

لاہور میں ایک بزرگ اور ہر حلقہ میں قابل احترام شخصیت محترم قاری محمد نفیس الحسینی کی ہے، (۱) یہ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے خلیفہ ہیں، اور برصغیر کے ہی ممتاز خطاط ہیں، ان کی بہت سی تحریریں اور طغرے پڑھنے کا موقع ملا تھا، جس پر کاتب کی حیثیت سے ''نفیس'' رقم لکھا

(۱) کچھ عرصہ پہلے قاری صاحب کی وفات ہوگئی۔

ہوتا تھا، ان سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، بہت ضعیف، نرم خو اور شفیق، سادہ و بے تکلف، روشن چہرہ، سفید اور دراز ریش، لاہور کی ایک بڑی درسگاہ جامعہ مدنیہ کے قریب ہی ایک معمولی مکان میں آپ کا قیام ہے، اور یہیں دور دور سے لوگ کھینچ کھینچ کر آتے رہتے ہیں، ہم لوگوں نے عشاء کی نماز قاری صاحب کے ساتھ ادا کی، پھر مسجد ہی میں آپ نے ایک نکاح پڑھایا جو سادگی اور اتباع سنت کی جیتی جاگتی مثال تھی، جناب نواز شریف کے وزیر اعظم ہونے کے بعد سے تقریب نکاح میں پر تکلف دعوت کی قانونی طور پر ممانعت ہوگئی ہے اور اس پر سختی سے عمل بھی کرایا جا رہا ہے، لوگ اس قانون سے بڑی راحت محسوس کر رہے ہیں، کاش ہندوستان میں بھی اس طرح کی پابندی لگ جائے —— قاری صاحب سے ملاقات کے بہانے سرسری طور پر ''جامعہ مدنیہ'' کو بھی دیکھنے کا موقع مل گیا، اس مدرسہ کی بنیاد مشہور ہندوستانی عالم مولانا محمد میاں دیوبندی (مصنف علماء ہند کا شاندار ماضی وغیرہ) کے صاحبزادہ مولانا احمد میاں نے رکھا تھا، اب اس کا شمار لاہور کے بڑے مدارس میں ہے۔

لاہور کی ایک اہم شخصیت جناب ضیاء الدین لاہوری کی ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے عاشقوں میں ہیں، سرسید احمد خاں ان کے مطالعہ کا خاص موضوع ہیں، سرسید کی فکر اور نقطۂ نظر سے شدید اختلاف رکھتے ہیں، حالاں کہ خود علیگ ہیں، موصوف سے بھی ملاقات ہوئی اور دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، اپنے موضوع پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، میں نے ان سے درخواست کی کہ موجودہ حالات میں ماضی کے اختلافات کو از سر نو زندہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، سرسید کے مذہبی تصورات ایک الگ چیز ہے اور نظریۂ تعلیم ایک الگ چیز، اب خود علی گڑھ سرسید کے مذہبی تصورات سے آزاد ہو چکا ہے اور جہاں تک سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک کی بات ہے، تو اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے، لیکن محسوس ہوا کہ موصوف کو اس مسئلہ میں بڑی شدت ہے۔

پاکستان میں ایک بڑا اہم کام اُردو ''دائرۃ المعارف الاسلامیہ'' کی ترتیب کا ہوا ہے،

اس کام کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب ہیں، بحمداللہ یہ عظیم کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، ڈاکٹر صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ اس پر نظر ثانی کا کام کررہے ہیں تاکہ جو کچھ کمی رہ گئی ہو، اس کو ضمیمہ کے ذریعہ پورا کیا جائے، ڈاکٹر صاحب نے ایک دن دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، یہ بڑی اچھی ملاقات رہی، کھانا تو ایک بہانہ تھا، دیر تک ہم لوگ مختلف علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے اور ان کی خوش اخلاقی اور تواضع نے قلب پر گہرا اثر چھوڑا۔

لاہور ایک تاریخی شہر ہے، لاہور کی عمارتوں، سڑکوں اور بازاروں کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا ہے کہ گویا ہم دہلی میں ہیں، وہی مغلیہ طرز کی عمارتیں، سڑکوں اور بازاروں میں گہما گہمی، تنگ اور مشغول گلیاں، سڑکوں کے کنارے چائے خانے اور چاٹ کی دکانیں، دلی کی جامع مسجد کی طرح لاہور کی بھی شاہی مسجد ہے، جامع مسجد دہلی سے بہت مشابہ اور طرز تعمیر میں حد درجہ یکسانیت، البتہ دلی کی مسجد میں ۳ یکساں گیٹ ہیں اور لاہور کی مسجد میں صدر دروازہ ایک ہی ہے، مسجد کا صحن بہ مقابلہ دہلی کی مسجد کے زیادہ وسیع ہے اور غالباً حکومت کی توجہ کی وجہ سے لاہور کی مسجد زیادہ بہتر حالت میں نظر آتی ہے، مسجد کے سامنے اور دائیں بائیں بہت کشادہ باغات اور سبزہ زار ہیں، اس نے مسجد کے حسن کو دوبالا کردیا ہے، مسجد کے باب الداخلہ کے سامنے ہی سبزہ زار کی دوسری جانب لاہور قلعہ کا صدر دروازہ ہے، لیکن دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ نہیں جتنا کہ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان ہے۔

لاہور میں مغلیہ عہد کا تعمیر کردہ خوبصورت شالیمار گارڈن بھی ہے، جو تعمیر کرنے والوں کے لطافتِ خیال کا آئینہ دار ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب اس کی نگہداشت اور آرائش پر توجہ کم ہوگئی ہے، لاہور کی شاہی مسجد میں داخل ہونے کے لئے پہلے ایک بڑا احاطہ ہے، اس احاطہ کے دروازہ سے نکل کر جب آپ مسجد کے باب الداخلہ کی طرف بڑھیں گے تو وہیں سڑک کی بائیں جانب شاعر اسلام اور دانائے راز علامہ اقبالؒ کا مرمری مقبرہ ہے، ہم لوگ اندر گئے، فاتحہ پڑھا اور وہاں ایک خاص سکون کی کیفیت محسوس کی اور بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ گیا :

سر　آمد　روز　گارے　ایں　فقیرے
وگر　دانائے　راز　آید　کہ　ناید

لاہور میں انگریزی عہد کی عمارتیں بھی بہ کثرت ہیں، اور بڑی پُرشکوہ ہیں، شہر کے بیچوں بیچ راوی ندی سے نکلنے والی ایک خوبصورت اور پانی سے بھرپور نہر ہے، جس کے دونوں طرف قطار در قطار درخت کھڑے ہیں، گذرنے والوں کو ایسا لگتا ہے کہ راستہ کے دونوں کنارے ہاتھ باندھے سنتری ان کا استقبال کررہے ہیں، ان درختوں کے دونوں طرف صاف ستھری اور وسیع سڑکیں ہیں، یہ نہر سڑک کے حسن میں بڑا اضافہ کرتی ہے، لاہور کی قدیم اور جدید آبادی میں وہی فرق نظر آتا ہے، جیسے حیدرآباد میں نئے اور پرانے شہر میں ـــــ پاکستان بننے کے بعد اس تاریخی شہر میں جو عمارتیں بنی ہیں ان میں ایک اہم عمارت ''مینار پاکستان'' ہے، یہ بہت خوبصورت اور منفرد ڈیزائن کا مینار ہے، اونچائی بھی اچھی خاصی ہے اس کو کنول کے پھول کے ڈیزائن پر بنایا گیا ہے اور اس کے چاروں طرف خوبصورت، پختہ نہریں بھی تعمیر کی گئی ہیں، اس مینار پر تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک کی پوری تاریخ رقم ہے۔

ہم لوگ ۳ دنوں لاہور رہے اور تشنہ کامی کے احساس کے ساتھ ۱۱/ اکتوبر کی شام کراچی کے لئے روانہ ہوئے، لاہور سے کراچی کا فاصلہ تقریباً ۱۲سو کلومیٹر ہے، ہم لوگوں نے کراچی آمد ورفت کے لئے قصداً ٹرین کا راستہ اختیار کیا، تاکہ پورے پاکستان پر ایک نگاہ ڈالی جاسکے، پاکستان کا ریلوے نظام بہت فرسودہ اور ازکار رفتہ ہے اور لوگوں میں ڈسپلن کی بھی کمی ہے، لاہور سے کراچی کے لئے سب سے اچھی ٹرین ''نائٹ کوچ'' (Night Coach) سمجھی جاتی ہے، شام میں لاہور بیٹھئے اور صبح ۹، ۱۰ بجے کراچی پہنچ جایئے، یہ پوری ٹرین ایرکنڈیشن ہے اور گویا پاکستان کی ''راجدھانی'' ہے، اس ٹرین کی رفتار واقعی اچھی تھی، لیکن سیٹیں چوڑائی اور لمبائی دونوں اعتبار سے کم، پانی وغیرہ کا انتظام بھی معقول نہیں، البتہ اس بات سے خوشی ہوئی کہ جب ہم لوگوں نے نماز پڑھی تو اس کے بعد گھنٹوں نماز کا سلسلہ جاری رہا، اور مسافروں کی بہت بڑی

تعداد نے نماز ادا کی، البتہ پاکستان میں سڑکیں عام طور پر بہتر نظر آئیں، بلکہ اکثر سڑکوں پر خلیجی ممالک کی سڑکوں کا گمان ہوتا ہے۔

دوسرے دن صبح ۱۰ بجے ہم کراچی پہنچ گئے، سندھ کا زیادہ تر علاقہ ریگستانی ہے، اور کچھ یہی حال کراچی کا بھی ہے، بمبئی اور کلکتہ ہی کی طرح کراچی بھی بہت طویل وعریض شہر ہے، اوراصل اسٹیشن سے کافی پہلے کراچی کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے، البتہ ہمیں ہندوستان کے بڑے شہروں کو طرح کراچی یا لاہور کے کنارے جھگی جھونپڑی کا علاقہ نظر نہیں آیا، کراچی اسٹیشن پر میرے پھوپھی زاد بھائی جناب امیر یحییٰ اور دوسرے اعزہ موجود تھے، ان کی گاڑی سے ہم لوگ شہر کے وسطی علاقہ جمشید روڈ پہنچے اوران کے مکان پر مقیم ہوئے، کراچی بہت خوبصورت شہر ہے، عام طور پر سڑکیں بہت چوڑی اوراچھی ہیں، البتہ چوں کہ وہاں بارش بہت کم ہوتی ہے، اس لئے ڈرینج کا انتظام ناقص ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو سڑکوں پر بڑی مقدار میں پانی لگ جاتا ہے، شہر صاف ستھرا، روشن اور ہرا بھرا ہے اور پھیلا ہوا ہونے کی وجہ سے کھلی آبادی ہے، کچھ ہی محلے گنجان ہیں، کراچی شہر کو یہ وسعت چوں کہ ۱۹۴۸ء کے بعد حاصل ہوئی ہے، اس لئے بہت قدیم عمارتیں کم نظر آتی ہیں، اکثر جدید عمارتیں ہیں، اور بہت قرینے سے بنی ہوئی ہیں، صنعتی اور معاشی اعتبار سے کراچی اس وقت پاکستان کا قلب ہے، اس شہر کی غالب آبادی ہندوستان سے گئے ہوئے مہاجرین پر مشتمل ہے اور شہر کی تمام اسمبلی نشستیں ان ہی کے حصہ میں آتی ہیں۔

افسوس کہ اس وقت یہ شہر امن کے لئے ترس رہا ہے، کراچی میں رہنے والے لوگ غالبًا بدامنی کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے اسی ماحول میں تمام کاروبار زندگی جاری وساری رکھتے ہیں، لیکن ہم جیسے لوگ جو باہر سے جاتے ہیں، ایسی خبروں سے لرزاں اور ترساں رہنے پر مجبور ہیں، اس وقت وہاں سات آٹھ قتل کا ہوجانا روز کا معمول ہے، ایک دن ہم لوگ رات نو ساڑھے نو بجے شہر کے ایک حصے سے اپنی قیام گاہ کو واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ ابھی دو گھنٹہ

پہلے سامنے کی سڑک پر آدھ گھنٹہ تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا، اس نقض امن کی کیفیت کی وجہ سے بہت سے کاروباری اور صنعت کار کراچی سے رختِ سفر باندھ رہے ہیں، خدا کرے جلد بدامنی کی یہ کیفیت ختم ہو اور شہر کا امن وسکون واپس آئے۔

کراچی باوجودیکہ صنعتی اور تجارتی شہر ہے، لیکن یہاں کئی بڑے دارالعلوم بھی واقع ہیں، سب سے بڑا دارالعلوم ''دارالعلوم کراچی'' ہے، جسے مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان نے قائم فرمایا تھا، یہ شہر کے بالکل کنارے محلّہ کورنگی میں واقع ہے، اس کی عمارتیں تقریباً ایک کلومیٹر علاقہ میں پھیلی ہوئی ہیں —— مولانا محمد رفیع عثمانی موجودہ مہتمم ہیں اور مولانا محمد تقی عثمانی (جسٹس شرعیہ کورٹ) اہم ذمہ داروں میں ہیں، مولانا کے بھانجے مولانا فہیم اشرف عثمانی جو ''ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ'' کے ذمہ داروں میں ہیں، اپنے ساتھ لے کر دارالعلوم گئے، مغرب کی نماز ہم لوگوں نے وہیں ادا کی، پھر دارالعلوم کی شاندار سہ منزلہ لائبریری دیکھی، لائبریری میں کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے، کئی کتابیں جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں، یہاں موجود تھیں، لائبریری میں مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی بڑا معقول انتظام ہے، دارالعلوم کے طلبہ تخصص نے جو علمی اور تحقیقی کام کئے ہیں، ان کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔

پھر ہم لوگوں نے درسگاہوں اور طلبہ کی اقامت گاہوں کا معائنہ کیا، یہ ساری عمارتیں خوش سلیقگی کا شاہکار اور تمام عصری سہولتوں سے آراستہ ہیں، برصغیر ہندو پاک میں شاید ہی کسی درسگاہ میں دارالاقامہ کی ایسی سہولتیں مہیا ہوں، دارالعلوم کے اسٹاف کے لئے جو کوارٹرس بنائے گئے، وہ بھی بہت کشادہ اور سہولت بخش ہیں، غرض دارالعلوم کی ہر چیز سے انتظام اور سلیقہ مندی عیاں ہے اور اس میں زیادہ دخل دارالعلوم کے مہتمم اول مولانا نور احمد مرحوم اور موجودہ مہتمم مولانا محمد رفیع عثمانی کے حسن ذوق کا ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی اس وقت وفاقی شرعی عدالت کے اجلاس کی وجہ سے اسلام آباد جا چکے تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی، لیکن مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب سے ملاقات

رہی ، وہ دوبار حیدرآباد بھی آچکے ہیں ، اس وقت آنکھ کے آپریشن کی وجہ سے فریش ہیں اورڈاکٹروں نے ملاقات سے منع کررکھا ہے، ہم لوگ چاہتے تھے کہ صرف سلام جواب کر کے نکل جائیں، لیکن مولانا نے بہ اصرار بٹھایا، دیرتک گفتگو کرتے رہے، اپنی تالیفات کا ایک ایک نسخہ بھی مرحمت فرمایا ، اسلامک فقہ اکیڈمی کے کام سے وہ بہت متاثر ہیں ، بار بار اکیڈمی اور مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا ذکر خیر کرتے رہے اور ہم لوگ ان کی خوش اخلاقی اور خوردنوازی کا گہرانقش لے کر واپس ہوئے ،مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد زبیر عثمانی بھی فہیم اور صاحب ذوق نوجوان ہیں، وہ مسلسل ساتھ رہے، اور دارالعلوم کے ایک ایک شعبہ کا تفصیلی معائنہ کرایا، دارالعلوم کے احاطہ ہی میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے ، جس میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور کئی دوسرے اہل علم دل آسودۂ خواب ہیں ، تمام قبریں کچی اور سادہ ہیں ، البتہ شناخت کے لئے ناموں کا کتبہ لگا ہوا ہے، ہم لوگوں نے ان بزرگوں پر فاتحہ پڑھا اور تشنگی کے احساس کے ساتھ عشاء کے قریب وہاں سے واپس ہوئے۔

کراچی میں دوسرا بڑا ادارالعلوم ''دارالعلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن'' ہے، مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اس کی بنیاد رکھی ہے، جو اپنے وقت کے بڑے محدث اور بلند پایہ محقق تھے، مولانا کے بعد ان کے داماد ڈاکٹر حبیب اللہ مختارؒ دارالعلوم کے مہتمم ہوئے ، ان کا شمار بھی برصغیر کے بڑے اہل تحقیق میں ہوتا تھا، ''کشف النقاب فی تحقیق ما فی الباب'' حدیث پر ان کی نہایت بلند پایہ کتاب تصور کی جاتی ہے، افسوس کہ ابھی ناتکمل ہی تھی کہ مولانا شہید کر دیئے گئے اور اس طرح دنیائے علم ایک باکمال محقق سے محروم ہوگئی ، پھر مولانا بنوری کے صاحبزادے احمد بنوری اس کے ذمہ دار ہوئے ، لیکن ایک حادثہ نے ان کو بھی دنیائے فانی سے رخصت کردیا ، ان حادثات نے دارالعلوم کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، حالاں کہ ایک زمانہ میں یہ تعلیمی اعتبار سے پاکستان کی سب سے ممتاز دینی درسگاہ تھی ، لیکن اب شاید اس میں کچھ انحطاط سا آگیا ہے، یہاں کے قابل ذکر اساتذہ میں مولانا محمد یوسف لدھیانوی ہیں، جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں

اور روز نامہ ''جنگ'' کراچی میں سوال و جواب کا کالم لکھتے ہیں۔(۱)

ہم لوگ ایک دن نماز فجر کے بعد ''دارالعلوم'' گئے، اس کی عمارتیں ایک کشادہ مسجد کے چاروں طرف واقع ہے، کچھ اسباق مسجد میں بھی ہوتے ہیں، کچھ مسجد کے باہر آمدے میں، کچھ مسجد کے سامنے بنے ہوئے کمروں میں، دارالاقامہ وغیرہ اندر واقع ہے، مسجد کے احاطہ میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ، ڈاکٹر حبیب اللہ مختارؒ اور سید احمد بنوریؒ کی قبریں ہیں، چنانچہ دارالعلوم پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے قبر پر فاتحہ پڑھ کر ہم لوگ واپس ہوئے۔

اس دارالعلوم کے قریب ہی ''المجلس العلمی'' ہے، اس کا شمار پاکستان کے وقیع تحقیقی اداروں میں ہوتا ہے، بنیادی طور پر یہ ایک لائبریری ہے، جس میں اسلامیات سے متعلق قیمتی مراجع ہیں، برصغیر میں جو معیاری جرائد نکلتے رہے ہیں، جیسے ''معارف، برہان'' وغیرہ، ان کی مکمل فائل یہاں دستیاب ہے، اور اکثر علمی و تحقیقی کام کرنے والے اس مرکز سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، مولانا محمد طاسین صاحب اس ادارہ کے ڈائریکٹر ہیں، کافی سن رسیدہ اور ضعیف ہیں، ہم لوگوں کی آمد کی اطلاع دی گئی، خود تشریف لائے، چائے سے تواضع کی اور دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے، مولانا قدیم و جدید دونوں درسگاہوں کے مستفیدین میں ہیں، پاکستان کے محقق اصحابِ علم میں شمار کئے جاتے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہ چکے ہیں، نیز آپ کی متعدد کتابیں طبع ہو کر مقبول خاص و عام ہیں، اسلام کی معاشی تعلیمات پر مولانا کی تازہ کتاب ''مزارعت'' کے موضوع پر آئی ہے، جو بہت محبت کے ساتھ آپ نے ہم لوگوں کو بھی عنایت فرمائی۔

ہم لوگ اسلام آباد ہی سے کراچی یونیورسٹی میں مدعو تھے اور ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے شعبۂ عربی و اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ سے خطاب کا پروگرام بھی رکھا تھا، لیکن اتفاق ہے کہ پولیس کی رپورٹنگ کارروائی کی وجہ سے یہاں بھی ہم لوگ دیر ہی سے پہنچ

---

(۱) افسوس کہ چند سال پہلے وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔

پائے، کراچی کی گرمی اور رپورٹنگ کی جاں گسل دوڑ دھوپ نے اتنا تھکا دیا تھا کہ ہم لوگوں نے خود ہی اس پروگرام سے معذرت کردی، البتہ یونیورسٹی کے اصحابِ ذوق اساتذہ کے ساتھ مختصر گفتگو رہی، کراچی یونیورسٹی میں بھی اسلامیات کا شعبۂ ''مرکز شیخ زائد'' میں ہے، اور یہاں بھی ٹھیک اسی نقشہ کی عمارت ہے جو پنجاب یونیورسٹی میں واقع ہے اور معلوم ہوا کہ پشاور یونیورسٹی میں بھی اسی طرح کا مرکز بنایا گیا ہے، یہاں اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں کمپیوٹر آپریٹنگ اور کمپیوٹر کی فنی تعلیم بھی داخلِ نصاب ہے، اور طلبہ وطالبات اس میں خاطر خواہ دلچسپی بھی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی نئی نسل کے اُبھرتے ہوئے محقق ہیں، ابھی انھوں نے ''مسند امام ابی حنیفہ بہ روایت ابونعیم اصبہانی'' کو ایڈیٹ کیا ہے، جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت قیمتی کام ہے، اسلام آباد ''امام ابوحنیفہؒ کانفرنس'' کے موقعہ سے صدر پاکستان کے ہاتھوں اس کی رسم اجراء عمل میں آئی، ڈاکٹر صاحب معروف عالم اور محقق مولانا عبدالرشید نعمانی کے صاحبزادہ ہیں، مولانا نعمانی کا شمار اس وقت دنیا کے ممتاز علماء حدیث میں ہوتا ہے، چنانچہ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کی معیت میں ہی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یونیورسٹی کے کیمپس میں ہی ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ ہے اور اسی میں مولانا قیام پذیر ہیں، قریب ہی میں چھوٹی سی مسجد واقع ہے، اسی میں ہم لوگوں نے ظہر کی نماز ادا کی اور یہیں مولانا سے ملاقات ہوئی، کھلا ہوا رنگ، دراز گھنی اور سفید داڑھی، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، نکلتا ہوا قد، کسی قدر رحیم وشحیم جسم، نرم گفتار، نرم خو، عمر اَسّی سے اوپر لیکن حافظہ ابھی بھی جوان، اور جوانوں کو شرمندہ کرنے والا، ایسی نورانی صورت کہ دیکھ کر خدا یاد آئے —— یہ ہے مولانا نعمانی کا حلیہ!

ہم لوگ مولانا کے ساتھ ان کے قیام گاہ گئے، دیر تک مختلف موضوعات پر مولانا سے استفادہ کا موقع ملا، ہمارے رفقاء میں مولانا عتیق احمد صاحب مولانا کے سفر لکھنؤ کے موقع سے آپ سے حدیث کی اجازت حاصل کر چکے تھے، میں نے اور مولانا فہیم اختر ندوی نے بھی

اجازت حدیث کی خواہش کی، کیوں کہ مولانا کی سند بہت عالی ہے اور صرف دو واسطوں سے شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ تک پہنچتی ہے، مولانا نے نہایت مسرت کے ساتھ ہم لوگوں کو اجازت حدیث مرحمت فرمائی اور بہت ہی بلند الفاظ سند میں ہم لوگوں کے متعلق لکھے، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ ہم کوتاہ علموں کے لئے ایسے الفاظ لکھے گئے ہیں کہ کسی اور کو دکھانے میں بھی حجاب ہوگا، آپ نے ازراہِ شفقت فرمایا: یہ الفاظ اس لئے لکھے گئے ہیں کہ اگر آپ ابھی اس کے حقدار نہ ہوں تو انشاء اللہ مستقبل میں ہو جائیں گے —— حقیقت یہ ہے کہ مولانا سے ملاقات کو اگر ہم لوگوں کے لئے حاصل سفر کہا جائے تو بے جا نہ ہو۔

جن اداروں میں ہمیں جانے کا موقع ملا، ان میں ''ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، ویسے تو یہ ایک تجارتی مکتبہ ہے، لیکن معیاری اور تحقیقی کتابوں کو طبع کرنا اس نے اپنا مطمح نظر بنایا ہے، مولانا نور احمد مرحوم سابق شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی نے اس کی بنیاد رکھی تھی، مولانا کے کئی فرزند ہیں اور ماشاء اللہ سبھی صاحبِ ذوق ہیں، بڑے لڑکے مولانا رشید اشرف عثمانی نے مولانا تقی عثمانی کی تقریر ترمذی مرتب کی ہے اور اس میں خود ان کا کام بھی مولانا تقی عثمانی سے کم نہیں، مولانا قاسم اشرف عثمانی ان سے چھوٹے ہیں، جنھوں نے اسلام آباد یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کیا ہے اور وہیں استاذ ہیں، انھوں نے امام محمدؒ کی مشہور کتاب ''زیادات'' (جواب تک مخطوطہ کی صورت میں تھی) پر ۶ جلدوں میں تحقیق و تعلیق کا کام کیا ہے، جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

مولانا امین اشرف عثمانی اور مولانا فہیم اشرف عثمانی ادارۃ القرآن کے ذمہ دار ہیں، علامہ انور شاہ کشمیری کے رسائل کا مجموعہ ۴ حصوں میں شائع کیا ہے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے دستیاب اور نایاب رسائل کو بھی جمع کر رہے ہیں اور اس کا مجموعہ بھی زیر طبع ہے، (۱) جو اہل علم کے لئے بڑی قیمتی چیز ہوگی، فقہ حنفی میں ''محیط برہانی'' انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے اور صدیوں

(۱) یہ مجموعہ چھ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

گذر جانے کے باوجود اب تک طباعت واشاعت سے محروم ہے، یہ ادارہ اس کو ایڈٹ کروارہا ہے اور اُمید ہے کہ یہ کتاب ۲۰ جلدوں میں شائع ہوگی اور موجودہ کتابوں میں فقہ حنفی کا سب سے بڑا ذخیرہ ثابت ہوگی،(۱) مشہور اور قدیم حنفی فقیہ علامہ سرخسی کی بھی ایک کتاب ''المحیط'' کے نام سے ہے، جو نسبتاً مختصر ہے، اس پر بھی تحقیق کا کام ہورہا ہے، ان علمی کاموں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، ان ہی حضرات کی خواہش پر راقم الحروف نے بھی اپنی چند تحریریں طباعت کے لئے ان کو حوالہ کی ہیں، ان حضرات کی خواہش ہے کہ یہیں سے راقم الحروف کی'' قاموس الفقہ '' کی طباعت بھی عمل میں آئے۔

کراچی میں جن شخصیتوں سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک ڈاکٹر سلمان شاہجہاں پوری ہیں، یہ بھی کراچی یونیورسٹی میں استاد ہیں، ہندوستان کے اہل علم کے بڑے قدرداں اور منت شناس ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری کے عاشق اور ان پر دل وجان سے فریفتہ ہیں، مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ سید سلیمان ندوی پر بھی موصوف کی کئی تحریریں ہیں، پاکستان میں رہتے ہوئے قائد اعظم محمد علی جناح کے سخت بلکہ ادب وشائستگی کے حدود سے متجاوز ناقد ہیں، عصر تا مغرب ملاقات رہی اور بلا وقفۂ سکوت وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا بے تکلف اظہار کرتے رہے اور رخصت کرتے ہوئے اپنی تصنیفات کا تحفہ بھی ساتھ دیا، مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مختلف امراض کے مخصوص معالج ہوا کرتے ہیں، اسی طرح پاکستان میں بعض اہل قلم نے مخصوص شخصیتوں پر تنقید اور تنقیص ہی کو اپنی سوچ کا موضوع بنالیا ہے!

کراچی ہی میں علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی قبریں ہیں، جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ان قبروں کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا تھا، قبروں کے ساتھ احاطہ کی

---

(۱) بحمد اللہ اب یہ کتاب ۲۵ جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔

دیوار پر بڑے بڑے کتبے لگے ہوئے جن پر ان دونوں بزرگوں کے حالات اور خدمات کا جامع تذکرہ ہے، یہاں بھی حاضر ہونے اور فاتحہ پڑھنے کا موقع ملا —— کراچی ہی میں قائداعظم کا نہایت عالیشان اور خوبصورت مقبرہ بھی ہے، یہ مقبرہ ایک بہت بڑے پارک اور ایک کھلے میدان کے درمیان واقع ہے، اور غالباً پوری عمارت سنگ مرمر کی ہے، خواہش تھی کہ وہاں تک پہنچیں، لیکن وقت کی کمی اور شہر کے شوریدہ حالات کی وجہ سے دور ہی سے نظارہ کرنے پر اکتفاء کرنا پڑا۔

کراچی میں ہم لوگوں نے دو تین دن گذارے، بہت مصروف اور مشغول، پاکستان کے دوسرے شہروں بالخصوص کوئٹہ اور پشاور جانے کی خواہش تھی، پشاور جانے کی خواہش اس لئے بھی تھی کہ میرے مخلص دوست صاحبزادہ قاری عبدالباسط (مقیم جدہ) پشاور ہی کے رہنے والے ہیں، لیکن چوں کہ ویزا ان شہروں کا نہیں تھا اور ہندوستان جلد واپسی بھی ضروری تھی، اس لئے مجبوراً کراچی سے ہی پھر لاہور واپس آنا پڑا، لاہور میں مشہور اسلامی جریدہ ''نقوش'' کے دفتر جانے کا بڑا اشتیاق تھا، واپسی میں ایک دن کا موقع ملا، اور ہم لوگ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نقوش کے دفتر گئے، جناب محمد طفیل صاحب ''نقوش'' کے بانی تھے، انھوں نے ۲۲ ضخیم جلدوں میں نقوش کا ''رسول نمبر'' نکالا، جو بلا شبہ اسلامی کتب خانہ میں سیرت پر سب سے وسیع کتاب اور محقق اہل علم کی تحریروں کا نہایت خوبصورت گلدستہ ہے۔

اس کے علاوہ ''نقوش'' نے علامہ اقبالؒ اور مختلف ادبی شخصیتوں نیز اُردو ادب کے مختلف صنفوں پر بھی نہایت ہی قیمتی، معلوماتی اور ضخیم نمبر نکالے ہیں اور ان نمبرات نے پوری اُردو دنیا میں خراج تحسین حاصل کیا ہے، اب طفیل صاحب مرحوم کے صاحبزادے جناب جاوید طفیل صاحب اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیں، خود صاحبِ ذوق اور صاحبِ نظر ہیں اور بڑے علم نواز اور ادب نواز، اب یہ نقوش کا ''قرآن نمبر'' ۲۵ جلدوں میں نکال رہے ہیں، جن میں سے ۲ جلدیں اس وقت پریس میں ہیں اور ۴ جلدوں کا مسودہ آخری مرحلہ میں ہے، جاوید

صاحب نے ہم لوگوں سے بھی مشورے لئے اور قرآن نمبر کے لئے ہم لوگوں سے لکھنے اور لکھوانے کی خواہش کی، ان کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اس اہم نمبر کے لئے یہاں ایک مشاورت رکھنی چاہئے، جاوید صاحب نے کہا: ''جی ہاں، لیکن پاکستان کے اہل علم صرف مشورے ہی دے سکتے ہیں، معیاری اور تحقیقی کام تو بھارت کے اہل علم ہی کرتے ہیں'' —— جاوید صاحب کے اس فقرہ سے پاکستان کے اصحابِ ذوق کا عام تاثر معلوم کیا جاسکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اس بات کو وہاں زبانِ خلق پایا، جاوید صاحب نے ہم لوگوں کو رخصت ہوتے ہوئے نقوش کے موجود نمبرات کی طویل فہرست عنایت فرمائی کہ آپ اس میں سے اپنے لئے انتخاب کرلیں، ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے ایک دو رسائل پر نشان لگایا، جاوید صاحب نے فرمایا کہ آپ جتنے زیادہ رسائل کا انتخاب کریں، مجھے مسرت ہوگی، پھر تو ہم لوگوں نے متعدد رسائل انتخاب کئے، جی تو چاہتا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پورا کتب خانہ ہی اٹھالیا جائے، لیکن دوستوں اور بزرگوں کے کتابی تحائف کے بڑھتے ہوئے وزن نے مجبور کردیا کہ ''علاج تنگی داماں'' کو چھوڑتے ہوئے چند ہی کلیوں پر قناعت کیا جائے۔

جاوید صاحب بہت متاسف تھے کہ ''قرآن نمبر'' کی ۲ جلدیں پریس سے آنہ سکیں اور آپ حضرات کو پیش نہ کرسکا، ان جلدوں کے آنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا، میں نے کہا: آپ افسوس نہ کریں، اس میں غلطی خود ہم لوگوں کی ہے کہ ہم لوگ ایک ہفتہ پہلے ہی آگئے، جاوید صاحب محظوظ ہوئے اور دوسرا فقرہ کسا کہ دوسری غلطی یہ ہے کہ آئندہ ایک ہفتہ رکنے کو تیار نہیں ہیں، اور ڈاک سے رسالہ بھیجنے کا وعدہ کیا، (۱) دفتر نقوش کا مہمان خانہ بھی تمام سہولتوں سے آراستہ ہے، جاوید صاحب نے خواہش کی کہ آئندہ جب بھی ہم لوگوں کا لاہور کا سفر ہو تو یہیں قیام کیا جائے، معلوم ہوا کہ ''نقوش'' ہندوستان کے دوسرے اہل علم وادب کا بھی پڑاؤ

(۱) جاوید صاحب نے وعدہ وفا کیا اور ''قرآن نمبر'' کے کئی شمارے ڈاک کے ذریعہ روانہ فرمائے۔

ہے، بہر حال نقوش کا ''قرآن نمبر'' جب مکمل ہوگا تو یقیناً یہ اُردو کے اسلامی ذخیرہ میں نہایت وقیع اور بے نظیر اضافہ ہوگا۔

۱۶/ اکتوبر کو ہم لاہور سے دہلی کے لئے بذریعہ ہوائی جہاز چلے، لاہور کے متعدد مخلص دوستوں جناب سجاد الٰہی، جناب اعوان صاحب، جناب شبیر احمد اور جناب محمد ندیم نے لاہور ایرپورٹ سے رخصت کیا، اور گھنٹہ بھر میں ہم دہلی آپہنچے، لیکن اسلام آباد لاہور اور کراچی کے بزرگوں اور دوستوں کی باتیں اور یادیں اور بے پناہ محبت واپنائیت کا نقش آج بھی لوحِ قلب پر تازہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی لمحہ کسی دوسرے ملک میں رہنے کا احساس نہیں ہوا اور ہر جگہ خلوص اور اپنائیت کی سوغات ملی۔

پاکستان کے بارے میں میرا عمومی تاثر یہ ہے کہ یہاں لوگوں کے مزاج اور فکر میں تشدد بہت ہے، اور ہر گروہ اپنی فکر میں آخری نہایت کو پہنچا ہوا ہے، اختلاف رائے برداشت کرنے اور مختلف الفکر لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت لوگوں میں کم ہے، حالاں کہ پاکستان کو اس وقت اس کی شدید ضرورت ہے، گذری ہوئی شخصیتوں اور مخالف مکتبہ فکر کی معزز ہستیوں پر بھی تنقید ''تنقیص'' کی حدود میں پہنچ جاتی ہے، اس لئے مذہبی، سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کے درمیان بڑے فاصلے پیدا ہوگئے ہیں، حالاں کہ پاکستان میں اسلامی موضوعات پر علم وتحقیق کے کام کے لئے کافی مواقع حاصل ہیں، لیکن اس لحاظ سے علمی وتحقیقی کاموں کی سطح کم تر محسوس ہوتی ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہاں زلف سیاست نے بہت سے علماء اور محققین کو اپنا اسیر بنالیا ہے، ان کی جدوجہد کا میدان بدل گیا ہے اور سیاست میں عملی شمولیت نے ان کو جماعتوں اور افراد کا رقیب بنا دیا ہے، اس لئے ہندوستان میں علماء کو عوام میں جو وقار واعتبار حاصل ہے، پاکستان میں یہ بات بڑی حد تک مفقود ہے اور میرے خیال میں یہ بڑے خسارہ کی بات ہے۔

پاکستان کے اُردو اخبار کا پڑھنا ہم جیسوں کے لئے بہت دشوار ہے، ایک تو اخبار پر

جرائم کی خبریں چھائی رہتی ہیں اور یہ خبریں بھی اس تفصیل سے لکھی جاتی ہیں کہ جن کو پڑھنے میں حیا آتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کہیں مجرمانہ طبیعت کے لوگوں کو ان خبروں سے جرم کے نئے نئے طریقے سیکھنے کا موقع نہ مل جائے —— دوسرے اکثر و بیشتر خبریں خواہ بین الاقوامی ہوں یا ملکی، صوبائی ہوں یا مقامی، اخبارات کے پہلے اور آخری صفحوں پر شاہ سرخیوں میں درج ہوتی ہیں اور ایک ڈیڑھ سطر لکھ کر اندورونی صفحہ کا حوالہ دے دیا جاتا ہے، شاید ہی ایک جگہ کوئی خبر مکمل مل جائے، بعض اچھی خبریں جو تعلیمی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہیں، نہایت معمولی طریقہ پر چھپتی ہیں، خود ''امام ابوحنیفہؒ کانفرنس'' کی خبر ایک دو دنوں اور وہ بھی بہت معمولی انداز پر آئی۔

گو صنعتی اعتبار سے پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال نہیں، تاہم پاکستان میں بھی بہت سی صنعتیں ہیں، اور وہ ٹکسٹائل کی صنعت میں ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش ہے، پاکستان کے شہروں میں عام لوگوں کی معاشی حالت غالباً ہندوستان سے بہتر ہے، (۱) متوسط آمدنی رکھنے والے اکثر لوگ بھی موٹر نشیں ہیں، کھانے پینے رہنے سہنے کا معیار بھی اونچا ہے، البتہ حکومت کے پاس آمدنی کے وسائل کم ہیں، ایٹمی دھماکہ کی وجہ سے گو پاکستان کے لوگ بہت پر اعتماد نظر آئے؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ معاشی پابندیوں نے اس کی معیشت کو کافی متاثر کیا ہے، پھر بھی بہ حیثیت مجموعی گرانی ہمارے ملک کی نسبت سے وہاں کسی قدر کم ہے۔

افغانستان پاکستان کے پڑوس ہی میں ہے اور کثرت سے افغانستان کے طلبہ پاکستان کی دینی اور عصری تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم ہیں، لوگوں سے معلوم ہوا کہ طالبان کی آمد سے افغانستان کے لوگ بہت خوش ہیں اور ان کی تیز رفتار فتوحات کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں طالبان پہنچے، مقامی آبادی نے طالبان کا تعاون کیا، طالبان سے پہلے

---

(۱) یہ تاثر سفر کے وقت کا ہے، اب ہندوستان نے جو بہتر رفتار معاشی ترقی کی ہے، اس کے بعد غالباً صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔

افغانستان میں نظم و ضبط نام کو نہ تھا، نہ لوگوں کی جان و مال محفوظ تھی اور نہ عزت و آبرو، طالبان کی آمد اور قانون شریعت کے نفاذ کی وجہ سے بے نظیر امن و امان قائم ہوا اور اس کی وجہ سے کاروبار، تجارت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کو بھی فروغ ہوا، طالبان میں جہاں دینی مدارس کے فضلاء ہیں، وہیں کچھ عصری علوم کے ماہرین بھی ہیں، انھوں نے ڈیم اور سڑکوں کی تعمیر کے کئی مفید کام کئے ہیں اور اس وقت افغانستان پر کسی دوسرے ملک کا ایک پیسہ قرض نہیں، قریب سے ان کے احوال سن کر شدت سے اس کا احساس ہوا کہ مغربی ایجنسیاں افسانے گڑھتی ہیں اور ہندوستان کی نیوز ایجنسیاں حقائق کو دریافت کرنے کے بجائے اسی پر لبیک کہتی جاتی ہیں —— افغانستان کے سربراہ اور مختلف صوبوں کے گورنر نہایت معمولی خس پوش مکان میں مقیم ہیں اور اتنی سادہ زندگی گذارتے ہیں کہ ہمارے ملک کے متوسط سطح کے لوگ بھی ان سے زیادہ عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، یہ سن کر اور پڑھ کر وہ بات یاد آگئی جو گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی سے پہلے کہی تھی کہ اس ملک کو آزادی کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے حکمرانوں کی پیروی کرنی چاہئے۔

ہند و پاک میں غیر معمولی جغرافیائی، فکری اور لسانی نیز تہذیبی اور تمدنی قربت کو دیکھتے ہوئے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ کاش ان دونوں ملکوں کے تعلقات آپس میں سنور جائیں اور دشمنی کا رشتہ دوستی میں تبدیل ہو جائے تو بنگلہ دیش اور بھوٹان سے لے کر روس کی سرحدوں تک وسیع تر سطح پر عوام و خواص کے علمی تہذیبی اور تجارتی روابط استوار ہو سکتے ہیں، اور بہت بڑا فنڈ جو ہلاکت خیز ہتھیاروں پر خرچ ہو رہا ہے، انسانی فلاح و بہبود کے کام آ سکتا ہے، اس سے ان ملکوں کو غیر معمولی تجارتی اور معاشی فوائد حاصل ہوں گے، اور دنیا میں ایشیاء ایک غیر معمولی طاقتور اور خوش حال براعظم کی حیثیت سے اُبھرے گا، شاید برصغیر کے ہر سمجھ دار اور انسانیت دوست دل کی یہی آواز ہے!

دوسرا سفر

پاکستان کا دوسرا سفر ''بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد'' کی دعوت پر ۱۹-۲۱ مارچ ۲۰۰۵ء کو ہوا، یہ سفر ''اجتماعی اجتہاد — تصور اور ارتقاء'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کی نسبت سے ہوا تھا، اس سیمینار میں ہندوستان سے مولانا سید جلال الدین انصر عمری، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی (علی گڑھ)، ڈاکٹر فہیم اختر ندوی اور یہ حقیر شریک تھے، ان کے علاوہ بیرون پاکستان سے ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی تشریف لائے تھے، حسن اتفاق ہے کہ سیمینا کی پہلی نشست کی صدارت مولانا عمری نے فرمائی اور اختتامی نشست کی صدارت اس حقیر کے حصے میں آئی، اس سیمینار میں بہت سی نئی شخصیتوں سے بھی ملاقات ہوئی، جن میں جسٹس خلیل احمد صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس سیمینار میں میرا موضوع ''اجتماعی اجتہاد اور اس سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی خدمات'' تھا، بحمد اللہ بڑے خوشگوار ماحول میں سیمینار ہوا اور ایک دن لاہور بھی قیام کا موقع ملا، البتہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے کراچی نہیں جاسکا۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لاہور اور اسلام آباد کے ایرپورٹ (جن کا اوپر ذکر آیا ہے) اب بین الاقوامی معیار کے بن چکے ہیں اور ان میں کافی توسیع ہوئی ہے، جس وقت یہ سفر ہوا، اس وقت پرویز مشرف پاکستان پر مسلط ہو چکے تھے اور اسلام پسند لوگوں کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہند و پاک کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھائے، ان دونوں کو باہمی طور پر مفاہمت کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، نیز امریکہ اور مغرب کی نظر بد سے دونوں کو محفوظ رکھے۔

❑ ❑ ❑ ❑

ایک ہفتہ علم وفن کے گلستان ''ایران'' میں

ایران دنیا کے ان ملکوں میں ہے جو اپنی ثقافت اور فکر وفن کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ہے، دنیا کے کئی قدیم مذاہب کی پیدائش گاہ یہی خطہ ہے، آریوں سے پہلے مغان اور مہر نامی مذاہب ایران ہی میں پیدا ہوئے، پھر معروف مصلح زردتشت ایران ہی میں پیدا ہوئے، جن کی پیدائش ۶۶۰ قبل مسیح بتائی جاتی ہے، اس مذہبی پیشوا کے متبعین کی تاریخ آج بھی کتابوں میں مذکور ہے اور اب بھی ان کے متبعین پارسی مذہب کے نام سے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں، مانی اور مزدک بھی ایران میں ہی پیدا ہوئے، جن کے فلسفہ نے اپنے اپنے دور میں گہرے اثرات ڈالے ہیں، پھر بعد کے ادوار میں بابی اور بہائی مذاہب کا ظہور بھی ایران میں ہی ہوا، اس طرح ایران مختلف مذاہب کے ظہور اور ارتقاء کے لئے اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔

اسلام سے پہلے دنیا میں دو سوپر طاقتیں تھیں، جو نہ صرف اپنی قوت کے اعتبار سے ایک خاص دبدبہ اور شان وشوکت کی حامل تھیں، بلکہ اپنی تہذیب وثقافت کے اعتبار سے بھی پوری دنیا پر ان کا اثر تھا، ان میں ایک یہی ایران کا علاقہ تھا، پھر جب حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور یہ علاقہ مملکتِ اسلامی کے حدود میں آ گیا، تو یہی خطہ علوم اسلامی کا سب سے عظیم الشان مرکز قرار پایا، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، فلسفہ ومنطق اور زبان وادب میں جتنی اہم شخصیات کا نام آج ہم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، قریب قریب ان میں سے اَسّی فیصد لوگوں کا مولد ومسکن یہی علاقہ رہا ہے، اسی علاقہ میں رے واقع تھا، جہاں ابوبکر جصاص رازیؒ اور امام فخر الدین رازیؒ جیسے مفسرین قرآن پیدا ہوئے، اسی ملک میں سعدی شیرازیؒ کا وطن شیراز ہے، مولانا روم جن کی مثنوی کی دھوم مشرق سے مغرب تک ہے،

اسی کی خاک میں آسودۂ خواب ہیں، نیسا پور، خراسان اور ماوراء النہر جو معروف مردم خیز اور علم وفن سے عطر بیز خطے رہے ہیں، اسی ملک میں واقع ہیں، بخارا و سمرقند اور کوفہ و بغداد اس ملک میں نہیں، لیکن اس سے دور بھی نہیں۔

اس لئے عرصہ سے خواہش تھی کہ کبھی اس دیار تک پہنچنے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے، حسن اتفاق کہئے کہ بقرعید کے چند دنوں بعد اچانک اور بے شان وگمان میرے پاس ایرانی سفارت خانہ سے جناب قائم علی صاحب کا فون آیا، کہ حکومت ایران ''**المجمع العالمی للتقریب بین المذاهب الاسلامیه**'' کی سولہویں انٹرنیشنل کانفرنس میں آپ کو مدعو کرنا چاہتی ہے، میں نے غور کرنے کے لئے وقت مانگا، اسی درمیان پھر تہران سے فیکس کے ذریعہ پروگرام کی تفصیل بھیجی گئی، تفصیل کے مطابق ایران میں ہر سال حکومت ایران کے تحت مذاہب اسلامی میں قربت اور ارتباط پیدا کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم ولادت کی مناسبت سے ''ہفتۂ وحدت'' منایا جاتا ہے، اس میں ایک چار روزہ انٹرنیشنل کانفرنس بھی رکھی جاتی ہے، اس سال اس سلسلہ کی سولہویں کانفرنس ۱۴ تا ۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۶ تا ۱۹ مئی ۲۰۰۳ء کو تہران میں رکھی گئی ہے اور اس کا موضوع ''اسلام کی آفاقیت اور گلوبلائزیشن'' (**عالمیة الاسلام والعولمة**) طے پایا ہے، رفقاء سے مشورہ کے بعد طے پایا کہ مثبت جواب دے دیا جائے، چنانچہ دعوت کی قبولیت کا خط لکھ دیا گیا، چوں کہ ویزا اور امیگریشن کے مراحل طے کرنے کے لئے دہلی جانا تھا اور دہلی سے ہفتہ میں ایک ہی جہاز براہ راست تہران کو جاتا ہے، اس لئے ۱۴ مئی مطابق ۱۲ ربیع الاول روز چہارشنبہ کو دہلی سے تہران کے لئے روانگی عمل میں آئی۔

یہ ایران کی ایرلائنز ''ماہان'' کا جہاز تھا، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جہاز میں زیادہ تر خدمت کرنے والا مرد عملہ تھا، ایک دو خاتون ایرہوسٹس بھی تھیں، لیکن انھوں نے سیاتر لباس اور سیاہ اسکارف پہن رکھا تھا، جہاز نے جیسے ہی اُڑان بھری، مائیکروفون پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

پڑھا گیا، چارتا ساڑھے چار گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہم لوگ تہران ایرپورٹ پر اُترے، میں نے محسوس کیا کہ جہاز میں جو ایران نژاد مسافرین ہیں، وہ بہت ہی خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن ایک اچھی خاصی تعداد ہندوستانی مسافرین کی تھی، جن میں سے کچھ ایران اور زیادہ تر براہ تہران دبئ جارہے تھے، یہ بہت شور مچائے ہوئے تھے، کئی سکھ خاندان بھی جہاز میں اپنی فیملی کے ساتھ سوار تھے، یہ لوگ ایران ہی میں رہتے ہیں اور وہاں کے بہت مداح ہیں، ان میں ایک شوخ طبع نوجوان لڑکی بھی تھی، جب تہران قریب آیا، تو اس نے اپنے پرس سے ایک لمبا چوڑا اسکارف نکالا اور اس سے اپنے سر اور بال ڈھانک لئے، اس سے اندازہ ہوا کہ غیر مسلم خواتین بھی ایران میں اپنے آپ کو حجاب کا پابند رکھتی ہیں۔

تہران ایرپورٹ انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے اور تمام جدید سہولتوں سے آراستہ ہے، میں جیسے ہی جہاز سے نکلا، ابھی سیڑھی ہی پر تھا کہ جناب خوشامدی صاحب (جو ہندوستان کے ایرانی سفارت خانہ میں رہ چکے ہیں اور اُردو اچھی طرح بول لیتے ہیں) اور جناب سید جلال الدین میر آقائی (جو ''مجمع التقریب'' کے ذمہ داروں میں ہیں) وہیں تشریف لے آئے اور اپنی کار سے ایرپورٹ کے وی آئی پی ویٹنگ روم میں مجھے اپنے ساتھ لائے، یہاں کچھ گفتگو ہوئی، چائے پی گئی اور اس درمیان ایرپورٹ کا عملہ پاسپورٹ سے متعلق کاروائی مکمل کرکے پاسپورٹ اور سامان لے کر آ گیا، پھر ان حضرات نے اپنے ایک نمائندہ کے ساتھ مجھے ''ہوٹل آزادی'' بھیج دیا، ایرپورٹ اور یہ ہوٹل تہران کے دو علاحدہ کناروں پر ہیں، اس طرح ایک طائرانہ نظر پورے شہر پر پڑ گئی، تہران بہت خوبصورت، ہرا بھرا اور صاف ستھرا شہر ہے، سڑکوں کے کنارے یا تو خوبصورت اور پر شکوہ عمارتیں ہیں، یا درختوں اور پھولوں سے لدے پھدے سبزہ زار، فلائی برج کثرت سے ہیں اور ان کو بہت خوبصورتی سے ڈیزائن کیا گیا ہے، ایران کی آبادی ساڑھے چھ کروڑ ہے اور ان میں ایک کڑور تیس لاکھ اشخاص صرف تہران میں رہتے ہیں، تہران بہت طویل وعریض شہر ہے اور اس کی ایک سمت میں بلند قامت فلک بوس پہاڑیاں ہیں،

جن پر مئی کے مہینہ میں بھی برف جمی ہوتی ہے اور دور سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے پتھر پر شیشے جڑ دیئے ہوں، تہران کا موسم بھی بہت خوشگوار اور پُر بہار ہے، اس وقت جب کہ ہندوستان میں درجہ حرارت پچاس کو چھویا چاہتا ہے، تہران کا درجہ حرارت ۲۵ کے آس پاس ہے۔

ایران ستائیس صوبوں پر مشتمل ایک بڑا ملک ہے، جسے سمندر کا وسیع حصہ حاصل ہے اوراس کے پڑوس میں ہر طرف مسلم ممالک ہیں، سرکاری اور عوامی زبان فارسی ہے، مقامی طور پر بعض علاقوں میں پشتو اور کرد زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، کیہان، اطلاعات، ایران، ہم شہری، جام جم، اہم اخبار ہیں اور یہ سب فارسی میں نکلتے ہیں، اس وقت سب سے زیادہ اشاعت ''اطلاعات'' کی ہے، انگریزی میں کیہان اور تہران ٹائمس اہم اخبارات ہیں، الوفاق کے نام سے عربی میں بھی ایک روز نامہ نکلتا ہے اور کیہان کا عربی ایڈیشن اس کے علاوہ ہے، اخبار بینی کا ذوق عام ہے اور زیادہ تر اخبار تہران شہر سے نکلتے ہیں، یہاں کے لوگ عام طور پر نرم مزاج اور نرم گفتار ہوتے ہیں، ہر شخص سے مسکرا کر اور کسی قدر جھک کر ملنا نیز بار بار خیر مقدمی کلمات کہنا ان کا خاص طریقہ ہے، بازار میں زیادہ شور وشغب اور چیخ، پکار کی آواز نہیں آتی۔

ہم لوگوں کو جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، یہ ایک انٹرنیشنل کمپنی کے تحت فائیو اسٹار ہوٹل تھا، انقلاب کے بعد اسے قومیا لیا گیا اور اس کا نام 'ہوٹل آزادی' رکھا گیا، یہ تیس منزلہ ہوٹل ہے، فائیو اسٹار کی تمام سہولتوں سے آراستہ اور مفاسد سے پاک، کام کرنے والے زیادہ تر مرد ہیں، کچھ خواتین بھی ہیں، ہر کمرہ میں قرآن مجید، جائے نماز اور تسبیح رکھی گئی ہے اور سمت قبلہ کی رہنمائی بھی گئی ہے، یہ ہوٹل برف پوش پہاڑی کے دامن میں ہے اور اس علاقہ میں زیادہ تر اونچی اونچی تیس، پینتیس منزلہ عمارتیں ہیں، ایران میں کھانے کا ذوق بھی بہت عمدہ اور معیاری ہے، مرچ کا استعمال نہیں ہوتا اور دوسرے مسالہ جات بھی کم استعمال کئے جاتے ہیں، البتہ نوع بنوع کباب ایرانی ڈش کا امتیاز سمجھے جاتے ہیں، مچھلی کا بھی خاص ذوق ہے، ہوٹل میں ایک دن

مولانا رومؒ، حافظ شیرازیؒ اور شیخ سعدیؒ نیز بعض جدید ایرانی شعراء کا کلام ایک شخص نے ہلکی شہنائی کے ساتھ سنایا، اس کے لئے کوئی مستقل مجلس کی صورت نہیں تھی، بلکہ طعام گاہ کے ایک گوشے میں گیت کار اپنی لے میں اشعار سناتا رہا، لوگ اپنی اپنی جگہ کھانے، پینے میں مصروف حسبِ ذوق اشعار سنتے رہے۔

ایران میں اب بھی اشعار اور ادبی فقروں نیز نصیحت آمیز ملفوظات کا خاصا ذوق پایا جاتا ہے، مسجدوں میں، مزارات پر، ہوٹلوں میں، احاطہ کی دیواروں کے باب الداخلہ اور سائبانوں میں کثرت سے اشعار اور خوبصورت فقرے نقش کئے ہوئے ہوتے ہیں، گو کمپیوٹر ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی طرح ایران میں بھی عام ہے اور انھوں نے نستعلیق کے بجائے عربی خط کو اختیار کرلیا ہے، لیکن اس کے باوجود خطاطی کا ذوق وہاں ابھی بھی زندہ اور ترقی پذیر ہے اور ان مواقع پر مشاہدین کو خطاطی کے بہت اعلیٰ اور خوبصورت نمونے مل جاتے ہیں، فارسی زبان کی شیرینی اور حلاوت مقامات کے ناموں سے خوب عیاں ہوتی ہے، پارکوں کو بوستان، سڑکوں کو خیابان، قبرستانوں کو کسی بزرگ کے نام سے موسوم کرکے، بہشت فلاں، کہا جاتا ہے، دکانوں کے لئے بھی اچھے نام منتخب کرتے ہیں، جیسے کسی ہوٹل کا نام گلستانِ مریم، کسی کا گلشن شیراز، جہاز کے لئے ہواپیما، محلّوں کے نام بھی اچھے ہوتے ہیں، جیسے ہوٹل کے قریب جو محلّہ واقع تھا، اس کا نام جام جم، اسی طرح خوبصورت تعبیرات زبان وادب سے تعلق رکھنے والوں کے بربطِ شعور کو چھیڑ دیتی ہے، لوگ گفتگو میں بار بار شکر ادا کرنے کے عادی ہیں اور اس کے لئے ''خیلے ممنون'' نیز ''متشکرم'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

خلیجی ملکوں ہی کی طرح ایران میں بھی ٹریفک کی کثرت ہے، خصوصی بسیں جو ہوٹلوں میں یا طویل سفر کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، بہت ہی اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں اور اس میں جہاز کی تمام سہولتیں، بشمول ٹھنڈا پانی، فراہم کی جاتی ہیں، تمام بسوں میں آگے اور پیچھے دو دروازے رکھے جاتے ہیں، اگلا دروازہ مردوں کے لئے اور پچھلا دروازہ خواتین کے لئے استعمال ہوتا

ہے، کاروں کی کثرت ہے، لیکن خلیج کے اعتبار سے کمتر درجہ کی گاڑیاں نظر آتی ہیں، ایران کی ریلوے ہندوستان وغیرہ سے زیادہ معیاری ہے، پوری ٹرین ایرکنڈیشن ہوتی ہے اور تمام سہولتیں ٹرین میں مہیا ہوتی ہیں، ایک صاحب سے ریلوے کا ذکر آیا تو میں نے ذکر کیا کہ میں نے پاکستان کا سفر کیا ہے، میرا احساس ہے کہ پاکستان میں اعلیٰ درجہ کی ٹرین ہندوستان کے معمولی درجہ کی ٹرین کی بھی ہم پلہ نہیں ہوتی، وہ ہندو پاک دونوں کا سفر کر چکے تھے، انھوں نے اس کو درست قرار دیا اور کہا کہ یہی نسبت ہندوستان اور ایران کی ریلوے کے درمیان ہے، کہ ہندوستان کی اعلیٰ درجہ کی ٹرینوں کے برابر ایران کی عام ٹرینیں ہوا کرتی ہیں، اگر ریلوے لائن آبادیوں کے درمیان سے گذرتی ہوں تو وہاں لائن کے دونوں طرف مناسب فاصلہ رکھ کر دیواریں کھینچ دی گئی ہیں، تا کہ انسان یا جانور کے زد میں آنے کا اندیشہ نہیں رہے، بحیثیت مجموعی تہران میں خوش حالی کا احساس ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ شہروں پر دیہاتوں کے حالات کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال ہم چہار شنبہ کو دوپہر میں تہران پہنچ چکے تھے، یہ دن تو آرام میں گذرا، جمعرات کی صبح ہمیں سید عبدالعظیم حسنیؒ کے مرقد پر لے جایا گیا، یہ تہران کے قریب ''رے'' شہر میں واقع ہے، ''رے'' سے ذہن اس عظیم شہر کی طرف جاتا ہے جو ایک زمانہ میں علم وتحقیق کا عظیم الشان مرکز تھا، جس کی نسبت سے بہت سے محدثین وفقہاء ''رازی'' کہلاتے ہیں اور کتنے ہی بلند پایہ محدثین وفقہاء اس منبع نور سے جلوہ فگن ہوئے، یا اس کی خاک کے سپرد ہوئے، لیکن اب اس تاریخی شہر کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ''رے'' اس شہر سے مختلف ہے، سید صاحب کا مرقد صرف ایک ہزار نہیں بلکہ ۳ ہزار مربع میٹر پر مشتمل احاطہ ہے، جس میں متعدد مزارات، میوزیم، مسجد، مدرسہ اور لائبریری ہے، احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک وسیع صحن اور سبزہ زار ہے، جہاں بسوں، کاروں اور دوسری گاڑیوں کے لئے پارکنگ کی معقول سہولتیں ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اسکول کے بچے، خواتین اور نوجوان یہاں بطور تفریح بھی کثرت سے آیا کرتے ہیں، آج

بھی زائرین کا خاصا اژدحام تھا اور پورے علاقہ میں چہل پہل محسوس کی جاسکتی تھی۔

باب الداخلہ ایک بڑی اور بلند عمارت کی صورت میں ہے، اس عمارت کی پیشانی پر ''کلمة الله هي العليا'' لکھا ہوا ہے، حسن بن علی اور سید عبدالعظیم عراق کے علاقہ سے ہجرت کر کے یہاں آگئے، اسی گوشۂ عافیت سے ان کے رشد و ہدایت کا چشمہ پھوٹتا اور دور دور تک لوگوں کو سیراب کرتا تھا، یہاں اور بھی کئی مزارات ہیں، جن میں شیخ طاہر بن زین العابدینؒ اور حمزہ بن موسیٰ کاظمؒ کے مزارات بھی مرجع خاص و عام ہیں، ان دونوں مزارات کے ساتھ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ راہداریاں بنی ہوئی ہیں، جو الگ الگ جانب سے وسیع وعریض ہالوں پر ختم ہوتی ہیں، ان ہالوں کے بیچ نسبتاً چھوٹا ہال ہے، جس میں اصل مزار ہیں۔

مزار پر چاندی وسونے کی جالیاں بنی ہوئی ہیں، ان جالیوں کے اندر دبیز شیشے کی دیوار ہے، اس دیوار کے اندر قبریں ہیں، جو کامدار مخملی چادروں سے ڈھکی ہوئی ہیں، ایران میں شیشہ کے کام کا بڑا اعلیٰ ذوق ہے، ان مزارات کے گرد ہالوں راہداریوں اور چھتوں میں جو شیشہ گری کی گئی ہے، وہ اتنا نازک حسین وجمیل اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والا ہے کہ الفاظ میں ان کا نقشہ نہیں کھینچا جاسکتا، روشنی کا سیلاب انسان کے تراشے ہوئے اس حسن باکمال کو دوآتشہ کرتا ہے، یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ جو خاک میں چھپ جاتا ہے، انسان کے دل میں اس کی قدر ومنزلت زیادہ ہوتی ہے اور اَن دیکھی چیزوں سے اس کا رشتہ اعتقاد بڑھا ہوا ہوتا ہے، فقیروں اور گداگروں کو تو روپیہ، آدھا روپیہ دینا بھی گراں گذرتا ہے، لیکن مزارات پر روپیوں کی بارش ہوتی ہے، یہاں یہ منظر نسبتاً زیادہ دیکھنے کو ملا، قبر کے چاروں طرف اندر کے حصہ میں نوٹوں کا انبار سا رہتا ہے، ویسے خوشی ہوئی کہ یہاں ہندوستان وغیرہ کی طرح کاسۂ گدائی لے کر زائرین کو پریشان کرنے والے فقیروں کی بھیڑ نہیں آتی۔

مزار سے متصل ہالوں، راہداریوں اور پھر صحن کی دیواروں پر اہل بیت اور خاص کر حضرت علی رضی اللہ عنہ، امام باقرؒ اور امام جعفرؒ کے مختلف حکیمانہ اور موعظت انگیز اقوال نہایت

خوبصورتی کے ساتھ لکھے گئے ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان کے منتخب فقرے نوٹ کر لئے جائیں، لیکن قافلہ کی ہمراہی اور وقت کی پابندی کے باعث اس کا موقع نہیں تھا، یہاں لوگ ان مزارات کے ساتھ وہی کچھ کرتے ہیں، جو ہندوستان میں دیکھنے میں آتا ہے؛ بلکہ اس سے بڑھ کر، سید عبدالعظیم حسنیؒ کے مزار پر تو عورتوں کے حصہ کی طرف سے آہ و بکا کی آواز بھی خوب آرہی تھی، مزارات سے متصل جو ہال ہیں ان میں زائرین عام طور پر زیارت کے بعد نماز پڑھتے اور دُعاء کرتے ہیں، عقیدت واحترام کا تقاضا یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ کچھ دیر جالی پکڑ کر کھڑا ہوا جائے، بہر حال ہم لوگوں نے مسنون طریقہ پر چند سورتیں پڑھ کر ہاتھ اُٹھائے بغیر دُعاء کی اور ہال کے حصہ میں واپس آگئے اور جو شیعہ علماء ہمارے ساتھ تھے ان کا انتظار کرتے رہے، نیز میں اس وقت کو غنیمت جان کر دیوار پر کندہ ''اقوال زریں'' پڑھتا رہا۔

ان مزارات کا بیرونی حصہ بھی فن تعمیر کا شاہکار ہے، مرکزی عمارت کے دونوں طرف مینار ہیں اور درمیان میں گنبد ہے، میناروں کے اوپری حصہ میں سنہری برجیاں اور ان پر سنہرے ہی کلس ہیں، گنبد بڑا بھی ہے اور اونچا بھی، پھر اس کے اوپر گنبد ہی کے لحاظ سے بڑا اونچا سا کلس ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ سب کا سب سونے کا بنا ہوا ہے، واللہ اعلم، میناروں اور گنبدوں کے درمیان قمقمے لگائے گئے ہیں، اس طرح رات کے وقت جب برقی شمعیں اور قمقمے جلائے جاتے ہیں، تو یہ عمارت نیلی، ہری، زرد اور گلابی روشنیوں کے پیرہن پہن کر ایک پری پیکر کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہے، اس احاطہ میں کچھ اور گنبد بھی ہیں، جس پر خوبصورت آسمانی رنگ کی مینا کاری کی گئی ہے۔

احاطہ کے ایک حصہ میں میوزیم واقع ہے، اس میوزیم میں اس عمارت کی تعمیر اور اس کے عہد بہ عہد ارتقاء کو ماڈل کی صورت میں دکھایا گیا ہے، موجودہ توسیع ۱۳۴۹ھ کی ہے، اس میں قدیم زمانہ کے نقرئی سکے ہیں، قرآن مجید کے قدیم مخطوطات ہیں، ایک قرآن مجید چھٹی صدی ہجری کا نوشتہ ہے، بارہویں صدی کا ایک فارسی ترجمۂ قرآن بھی اس کی زینت ہے،

مشہور شیعی عالم علامہ مجلسی کی معروف کتاب ''زادالمعاذ'' کا مخطوطہ بھی ہے، اس میں بہت سے کاغذ، شیشہ اور چاندی پر لکھے ہوئے خوبصورت طغرے بھی ہیں، جو مختلف فرماں روایانِ حکومت یا اہم شخصیتوں نے وقتاً فوقتاً اس مزار کے لئے نذر کئے ہیں، یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ میوزیم میں حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم وغیرہ کی خیالی تصویریں بھی ہیں، بلکہ ایک تصویر میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ کا خیال گذرتا ہے، تصویریوں بھی جائز نہیں، لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی انبیاء، صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکابر اُمت کی شبیہ بنانے کو پسند نہیں کیا، ہندوستان میں جو بعض اہل بیت کی شبیہیں کہیں کہیں نظر آتی ہیں، غالباً وہ ایران ہی کے راستہ سے آئی ہیں۔

احاطہ کے ایک حصہ میں کتب خانہ واقع ہے، زیادہ تر فارسی کی کتابیں ہیں، عربی کی کتابیں کم ہیں، عربی کتابوں میں اہل سنت کی کتابیں بھی مناسب تعداد میں ہیں، زیادہ تر کتب شیعہ علماء کی ہیں، کتب خانہ کے ہال سے متصل ایک اور نسبتاً چھوٹا ہال ''مخطوطات'' کا ہے، میں نے مخطوطات کی فہرست حاصل کرنی چاہی، مگر معلوم ہوا کہ مرتب نہیں ہے، زیادہ تر شیعی مخطوطات ہیں، کتب خانہ کا ہال خاصا وسیع اور خوبصورت ہے، دائیں، بائیں مطالعہ کرنے والوں کے لئے وافر تعداد میں بنچ اور کرسیاں ہیں، پھر بھی درمیان میں کافی جگہ باقی رہتی ہے، ان بنچوں پر کلیۃ الحدیث کے طلباء وطالبات کے علاوہ دوسرے اصحابِ ذوق مرد وعورت بھی مصروف مطالعہ تھے۔

اسی احاطہ میں ''دانش گاہ علوم حدیث'' کے نام سے سے ایک ''کلیۃ الحدیث'' بھی قائم ہے اس کی درسگاہیں اور دارالاقامہ وغیرہ اس عمارت کے شایان شان ہیں، میں اسے دیکھنے کا بہت متمنی تھا، مگر چھٹی ہو چکی تھی اور دوسرے رفقاء جلد پہنچنے کے خواہش مند تھے، اس لئے صرف سامنے سے گذر ہوا، احاطہ میں مسجد بھی ہے، لیکن رائے ہوئی کہ ہوٹل میں آ کر نماز پڑھی جائے، البتہ آستانہ کی طرف سے مہمانوں کے لئے ظہرانہ کا انتظام تھا، اس لئے کھانا کھایا

گیا اور ہم لوگ ہوٹل واپس ہوئے۔

آج شام کا وقت علامہ خمینی کے مکان کی زیارت کے لئے رکھا گیا تھا، ہم لوگ ایک بس کے ذریعہ لے جائے گئے، مکان کے قریب تقریباً دو فرلانگ پہلے سیکورٹی کا سخت انتظام ہے اور غالباً وہ فوجی علاقہ ہے، میزبانوں نے کوشش کی کہ یہ بس وہاں سے عبور کر کے قریب تک جائے، لیکن پولیس والوں نے اجازت نہیں دی، وہاں سے ہم لوگ پیدل ہی چلے، نئے شہر کے ساتھ پرانے شہر کی جو روایت ہے، یہ اسی طرح کا علاقہ ہے جو ''جماران'' سے موسوم ہے، لیکن صاف ستھرا، ہرا بھرا، دونوں طرف ایک یا دو منزلہ مکانات، ہم لوگ چند منٹوں میں مکان پر پہنچ گئے، مکان بہت ہی سادہ اور عام سا ہے، بالائی چھت از بسطاس یا لوہے کی ہے، جس کمرہ میں علامہ خمینی کی نشست گاہ تھی وہ بھی ایک عام سا کمرہ ہے، اسی جگہ مختلف ملکوں کے بڑے بڑے عہدیداران ان سے ملاقات کرتے تھے، بطور یادگار ان کی نشست گاہ، فرش، تکیے، قرآن مجید وغیرہ اسی طرح رکھے گئے ہیں۔

مکان کے بعد چھوٹا سا صحن ہے اور سامنے ایک ہال ہے، یہ ہال اصل میں دروس اور عزاداری کے لئے ہے، ایسے ہال تہران میں کثرت سے ہیں، ان کو ''حسینی'' کہا جاتا ہے، چوں کہ علامہ خمینی کے مکان کا سائبان اونچا ہے، اس لئے ان کی رعایت سے سائبان تا ہال لوہے کا ایک برج بنا ہوا ہے، اسی کے ذریعہ اپنے مکان سے درس دینے اور وعظ کہنے کے لئے ہال تک جاتے تھے، ہال وسیع اور چوکور ہے، سادہ سی عمارت ہے، اس کے ایک کونہ میں قدآدم بلکہ اس سے بھی زیادہ اونچا اسٹیج بنایا ہوا ہے، جس پر مقرر کے لئے کرسی و مائیک وغیرہ کا انتظام ہے اور علامہ خمینی کی تصویر نمایاں طور پر لگی ہوئی ہے، نیچے فرش بچھا ہوا ہے، یہاں پندرہ بیس منٹ کا ویڈیو بھی دکھایا گیا، جو زیادہ تر انقلاب کے وقت علامہ خمینی کی آمد اور ان کے فقید المثال استقبال سے متعلق تھا، یہاں وفد کو چاکلیٹ اور کنجی کا رِنگ پیش کیا گیا، جس میں علامہ خمینی کی تصویر تھی۔

پھر ہم لوگ ہال کے نیچے تہہ خانہ میں لے جائے گئے، یہ علامہ خمینی سے متعلق نمائش گاہ ہے، جس میں ان کے بچپن، جوانی جلاوطنی کے زمانہ میں فرانس کے قیام، ایران واپسی، وفات، وفات کے بعد تہران اور قُم وغیرہ میں ہونے والی تعزیتی مجالس، نیز آبائی مکان وغیرہ کی بہت سی تصویریں ہیں، یہاں علامہ خمینی کے لکھے ہوئے خطوط، ان کے قلمی مخطوطات، ان کے نام آنے والے سربراہان مملکت کے خطوط نیز ان کی مطبوعہ تالیفات اور ان کے تراجم بھی رکھے گئے ہیں۔

بہر حال یہ تمام عمارتیں نہایت سادہ اور عام سی ہیں اور انھیں دیکھ کر تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک بوریہ نشیں درویش نے کس طرح اپنے عہد کے مضبوط ترین حکمراں (دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی پشت پناہی جس کو حاصل تھی) کا قلعہ اقتدار زمین بوس کر دیا اور تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ دل ودماغ کی حکمرانی خاک وآب کی حکمرانی سے بڑھ کر ہے، مغرب کی نماز ہم لوگوں نے اسی ہال میں ادا کی اور اپنی قیام گاہ کو واپس ہوئے۔

۱۶ مئی کو جمعہ کا دن تھا، آج کے پروگرام میں نماز جمعہ اور ۵ بجے شام سے کانفرنس کا آغاز تھا، تہران میں ایک ہی جگہ جمعہ ہوتا ہے، ہم لوگ ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل سے لے جائے گئے، جمعہ کو تعطیل رہتی ہے اور مسجد کو جانے والی تمام سڑکوں پر دور دور تک ٹریفک بند رکھی جاتی ہے، ہم لوگ وہاں پہنچے، ایک راستہ عام لوگوں کا ہے جو مسجد کے پیچھے کی طرف سے ہے، ایک راستہ سامنے قبلہ کی طرف سے ہے، سیکوریٹی کا سخت انتظام تھا اور کافی احتیاطی تدبیریں کی گئی تھیں، ان مرحلوں سے گذرتے ہوئے نماز گاہ تک پہنچا جاسکا، تین چار صفوں کے بعد لوہے کی جالیوں کا احاطہ ہے، اس کے پیچھے اسی طرح چند اور صفوں کے بعد لوہے کی جالی ہے، پھر وسیع ہال ہے اور اس ہال سے لگا ہوا ایک اور ہال خواتین کے لئے ہے، پہلے احاطہ میں بیرونی مہمانوں اور ایران کی اہم شخصیتوں کو بٹھایا گیا، اس کے بعد سیکوریٹی کے لوگ اور ایران کے دوسرے اہم لوگ بٹھائے گئے، پھر عام لوگ اور ان کے بعد خواتین، خطیب کے لئے بہت ہی اونچا

اور خوبصورت اسٹیج ہے، جس پر مائک اور پوڈیم کا نظم ہے، ڈائس کے اوپر نیچے علامہ خمینی کے بعض اقوال درج ہیں، اس کے علاوہ وہاں کے دائیں بائیں بھی بہت سے بینر لگے ہوئے تھے، جس میں اتحادِ اُمت اور حسن خلق کی دعوت تھی، یہ ملفوظات ائمہ اہل بیت، علامہ خمینی اور علامہ خامنہ ای وغیرہ کے تھے، غالبًا یہ ''ہفتہ وحدت'' کی مناسبت سے لگائے گئے تھے۔

نماز جمعہ کا یہ ہال سیدھا سادہ لوہے کے شیڈ اور لوہے کے اونچے ستونوں سے بنا ہوا ہے اور مزارات ومقابر پر جو شان وشوکت ہے، شاید اس کا سوواں حصہ بھی یہاں نہیں ہے، سمت قبلہ کے ایک کونہ پر ہونے کی وجہ سے صفیں ترچھی ہوتی ہیں، البتہ نماز گاہ کے چاروں طرف وسیع صحن اور سبزہ زار اور چمن بندیاں ہیں، نمازیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی، لیکن تہران جیسا شہر (جہاں ایک کروڑ سے زیادہ آبادی ہے) اور شہر میں صرف ایک ہی جگہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، اس لحاظ سے یہ تعداد معمولی ہی نہیں، بلکہ بہت معمولی تھی اور ہندوستان میں جمعہ کا جو اہتمام ہوتا ہے، اس لحاظ سے بہت ہی حیران کن بھی۔

پہلے لبنان سے آئے ہوئے شیخ نعیم قاسم نے خطاب کیا، یہ حزب اللہ کے نائب صدر ہیں، تقریر بہت سلیس اور سنجیدہ تھی، مسلمانوں کا اتحاد اور امریکہ کی استعماریت، خطاب کا اصل موضوع تھا، جہاں حضور ﷺ کا نام آتا، وہاں پورا مجمع زور سے ''**اللّٰهم صلى على محمد وعلى آله**'' پڑھتا، نیز علامہ خمینی اور موجودہ رہبر انقلاب علامہ خامنہ ای کا نام آنے پر بھی پورا مجمع درود نبوی پڑھتا، اس کے بعد دوسرے مقرر کھڑے ہوئے جو ادھیڑ عمر کے تھے، انھوں نے فارسی میں نہایت پر جوش تقریر کی، جب تقریر کا جوش اپنے شباب پر پہنچتا تو ''مرگ بر امریکہ مرگ بر اسرائیل'' کا نعرہ لگاتے اور یہ پورا مجمع کئی منٹ تک بڑے ہی زور وشور کے ساتھ اسی نعرہ کو دہراتا رہتا۔

آخر میں اسٹیج کے پردہ کے پیچھے سے ایک بزرگ صورت شخصیت منظر عام پر آئی، کھلتا ہوا رنگ، سفید ڈاڑھی، سفید عمامہ اور سفید عباء، یہ تھے آیت اللہ کاسانی، کلمات حمد کے بعد آیت

'' افمن اسس بنیانه علی تقوی من الله ورضوان خیر ام من اسس بنیانه علی شفا جرف هار فانهار به فی نار جهنم ، والله لا یهدی القوم الظلمین ''(التوبه:۱۰۹) پڑھی اور فارسی میں خطاب شروع ہوا، تاریخ کے مذہب سے رابطہ اور اسلام کی آفاقیت، خطاب کا موضوع تھا اور خطاب میں بار بار فلسطین وعراق اور امریکہ واسرائیل کے مسائل زیر بحث آتے تھے۔

نماز اور دُعاء کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس آ گئے، نماز گاہ میں ملفوظات سے آراستہ جو بینر لگے ہوئے تھے ان میں علامہ خمینی کے دو فقرے اس طرح نقل کئے گئے تھے :

امروز بیشتر از هر وقت محتاج بوحدت کلمه هستیم .

آج ہم ہمیشہ سے زیادہ اتحاد کے محتاج ہیں۔

مسئله فلسطین مسئله اول جهان اسلام است .

فلسطین کا مسئلہ عالم اسلام میں تمام مسائل سے مقدم ہے ۔

آج ہی پانچ بجے شام سے افتتاحی اجلاس منعقد ہونے والا تھا، چنانچہ وقت کے لحاظ سے ہم لوگ لے جائے گئے، ایران نے چند سال پہلے مسلمان ملکوں کی تنظیم ''او، آئی، سی'' کا اجلاس اپنے یہاں کیا تھا، اس کے لئے اس موقع سے شہر تہران میں ایک نہایت ہی خوبصورت اور وسیع ہال تعمیر کیا گیا تھا، اس ہال کے چاروں طرف دور دور تک چمن بندی کی گئی ہے اور انھیں فواروں سے آراستہ کیا گیا ہے، اس کے بعد گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے جگہیں بنی ہوئی ہیں، پھر اس کے بعد حفاظتی دیوار ہے، ہال کی عمارت بھی اس طرح بنی ہوئی ہے کہ مختلف اطراف سے داخلہ کے دروازے اور بلوری کمرے بنے ہوئے ہیں، ہال کے اندر مغربی جانب میں کسی قدر اونچا اسٹیج ہے، اسٹیج کچھ زیادہ بڑا نہیں، آٹھ دس اشخاص بیٹھ سکتے ہیں، اسٹیج کے سامنے اچھی خاصی جگہ دائرہ کی صورت میں خالی ہے اور چاروں طرف کرسیاں اور منبر ہیں جو زینوں کی شکل میں صف بہ صف نیچے سے اوپر کی طرف چلی گئی ہیں، ہر نشست کے ساتھ

اسپیکر اور مختلف زبانوں میں تقریر کے ترجمے سننے کے لئے مائیک کا انتظام ہے، ہال کی دیوار سے متصل گیلری بنی ہوئی ہے اور یہ گیلریاں کرسیوں سے آراستہ ہیں، چند ہی منٹوں میں ہال اور بالائی گیلری بھر گئی، ہال میں بیرونی مہمان اور اندرون ملک کے مہمانانِ خصوصی اور گیلری میں دوسرے مندوبین اور خواتین۔

اجلاس کا آغاز قومی ترانہ سے ہوا، ترانے کے بعد داعی اجلاس آیت اللہ شیخ محمد علی تسخیری اسٹیج پر تشریف لائے، وہ بہت سن رسیدہ اور کمزور ہیں اور ایک پاؤں سے معذور بھی ہیں، پاؤں گھسیٹ کر چلا کرتے ہیں، کھلا ہوا سرخ وسفید رنگ، دودھ کی سی سفید داڑھی، سفید عمامہ اور عنابی رنگ کی عباء، آواز بھی پست، گہرے علم اور وسیع مطالعہ کے حامل کئی کتابوں کے مصنف، جدہ فقہ اکیڈمی کے رکن اور سابق نائب صدر، فکر اور اظہار و بیان میں بہت ہی معتدل، اس وقت ان حدیثوں پر کام کر رہے ہیں جو اہل سنت اور شیعوں کے درمیان مشترک ہیں، ابھی تک دو جلدیں آچکی ہیں، ان روات کو بھی جمع کر رہے ہیں جن سے اہل سنت اور اہل تشیع دونوں حدیثیں قبول کرتے ہیں، شیخ تسخیری نے بہت ہی اختصار کے ساتھ مشکل سے تین چار منٹ تمہیدی کلمات کہے، آپ نے اپنے خطاب میں فروعی اختلاف سے اوپر اُٹھ کر مسلمانوں کے اجتماعی اور عالم اسلام کے سیاسی مسائل پر توجہ دینے کی تلقین کی اور ایران کے سابق صدر، ممتاز شیعہ عالم آیت اللہ اکبر ہاشمی رفسنجانی نے افتتاحی خطبہ فارسی زبان میں دیا، علامہ رفسنجانی نے اپنے خطاب میں مغربی استعماریت، علماء کی قیادت کی ضرورت اور اجتہاد و استنباط کی طرف توجہ پر زور دیا، انھوں نے اپنے خطاب میں امام مہدی کا بھی ذکر کیا، خطبہ کے اختتام پر حاضرین نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

دوسری نشست میں ایران اور بیرون ایران کے مختلف علماء کے خطابات تھے، جن میں مولوی اسحٰق مدنی المجمع العالمی للتقریب کے نائب صدر اور اُمور اہل سنت کے سلسلہ میں صدر ایران کے مشیر، قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی پاکستان، ڈاکٹر عبدالہادی،

اور انگ وزیر اعلیٰ ریاست تران جانی ملیشیاء اور شیخ محمد ناصر عبودی معاون جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اُمت اسلامیہ اور عالم اسلام کے اتحاد کے سلسلہ میں شیخ ناصر عبودی نے بڑی چشم کشا اور تجزیاتی تحریر پیش کی، اجلاس کے اختتام پر فقیہ عالم اسلامی ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی اقتداء میں نماز ادا کی گئی۔

۷ا مئی سے علمی نشستوں کا آغاز عمل میں آیا اور مقالہ نگار ومندوبین دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، ایک کا موضوع ''اسلام کی آفاقیت اور اس کی بنیادیں'' (عـالمية الاسلام و اسسها) تھا اور دوسری مجلس ثقافتی موضوعات پر تھی اور تیسری اقتصادی، سیاسی اور بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر تھی، ان تینوں مجلسوں کی تین تین نشستیں آج ہوٹل آزادی کے مختلف کانفرنس ہالوں میں منعقد ہوئیں، پہلی مجلس میں زیادہ بیرونی مندوبین تھے اور باقی دونوں مجلسوں میں زیادہ تر ایرانی علماء تھے، پہلی نشست نو تا گیارہ، مختصر وقفہ کے بعد، دوسری نشست ۱۱/۲۰ تا ۱ بجے دن اور تیسری نشست ۵ تا ۸ بجے شب منعقد ہوتی رہیں، اسلام کی آفاقیت کے موضوع پر پہلی نشست کی صدارت ڈاکٹر عبدالوہاب ابوسلیمان (مکہ مکرمہ) نے کی، اس نشست میں پانچ مقالات پیش کئے گئے، جن میں آخری مقالہ اس حقیر کا تھا، چوں کہ ہر مقالہ نگار کے لئے صرف دس منٹ کا وقت تھا اس لئے راقم الحروف نے مقالہ میں سے ''بنیادی انسانی حقوق اور اسلام'' کے حصہ کو پڑھ کر سنایا، یہ مقالہ عربی زبان اور تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے، سیمینار کی زبان عربی اور فارسی تھی اور سیمینار کے اختتام پر سوال وجواب اور مناقشہ کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

۱۸ مئی یک شنبہ کو اجلاس کی تین عمومی نشستیں رکھی گئیں، جن میں تمام مندوبین شریک تھے، ان نشستوں میں اسلام کی آفاقیت گلوبلائزیشن، اتحادِ اُمت مسلمہ کے موجودہ حالات پر خطبات تھے، دو نشستیں صبح سے دوپہر تک اور تیسری نشست شام پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک تھی، دوسری نشست جو گیارہ تا ایک بجے دن تھی کی صدارت آیت اللہ محمد واعظ زادہ خراسانی کر رہے تھے، شیخ خراسانی ایران کے بڑے علماء میں ہیں، کثیر التصنیف ہیں، پہلے مجمع

التقریب کے صدر تھے اور اب نائب صدر ہیں، اپنے اعتدال وتوازن کے لئے معروف اور غلو پسند شیعہ حضرات کے درمیان ایک حد تک بدنام ہیں، (۱) اس نشست میں میرا خطاب بھی رکھا گیا تھا، میں نے گلوبلائزیشن کے اصل ہدف اور اُمت کے اتحاد کے موضوع پر ایک مختصر سا خطبہ عربی زبان میں لکھ رکھا تھا اور بروقت کچھ فارسی میں بھی لکھ لیا تھا، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے عربی تحریر پیش کی جاسکی، فارسی تحریر پیش کرنے کے لئے موقع نہیں رہا۔

۱۹ مئی پیر کے دن شام میں پانچ تا آٹھ ایک خصوصی نشست عالم اسلام کے حالات پر رکھی گئی تھی، میں مسلسل مشغولیت اور تکان کی وجہ سے اس نشست میں شامل نہ ہوسکا، ۹ تا ۱۱ بجے آج اختتامی اجلاس تھا، جس میں قراردادیں پیش کی جانی تھی، شیخ تسخیری اس اجلاس کے صدر تھے، تلاوت قرآن کے بعد شیخ محمد رضا عجمی مفتی اعظم مسقط نے خطاب کیا، پھر افغانستان کے نمائندہ حافظ نور احمد غریق کا خطاب ہوا، اس کے بعد ڈاکٹر مرقائی ـــــ جو نوجوان اور فعال صاحبِ علم اور کانفرنس کے ذمہ داروں میں تھے ـــــ نے مجمع التقریب کی کارگزاریوں اور اس سیمینار کی تفصیلات پر روشنی ڈالی، ان کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر عربی وفارسی میں پچاس مقالات پیش کئے گئے، اخیر میں ایک مصری عالم نے قرارداد اور اعلامیہ پیش کیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ تجاویز کمیٹی نے بڑی محنت سے تجاویز مرتب کی ہیں، یہ تجاویز اسلام کی آفاقیت، مغرب کی طرف سے مسلط کی جانے والی عالمیت کے انسانی پہلو، گلوبلائزیشن کے اثرات، ان اثرات کے مقابلہ کے لئے عالم اسلام میں باہمی اقتصادی تعاون کی ضرورت، اسلامی ثقافت کے سلسلے میں مسلمانوں اور عالم اسلام کی ذمہ داریوں اور ایک قطبی نظام کے مفاسد، شخصی وریاستی دہشت گردی کی مذمت، فلسطینی انتفاضہ، عراق سے بیرونی طاقتوں کے انخلاء اور ایران پر معاشی تحدیدات کے سلسلہ میں تھیں، نیز شکریہ کی تجویز بھی تھی، جس میں

---

(۱) بعد کو نجی دروس میں واعظ زادہ خراسانی کی صحابہ اور امہات المومنین کی نسبت سے بعض ایسے شنیع کلمات سننے کو ملے کہ اس حسن ظن کا آبگینہ چور چور ہوگیا۔

حکومتِ ایران اور مجمع التقریب کا شکریہ ادا کیا گیا ہے، آخر میں شیخ تسخیری کا مختصر خطاب ہوا، جس میں انھوں نے مہمانوں، کانفرنس کے منتظمین، ذرائع ابلاغ، حکومت ایران وغیرہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اتحادِ اُمت کی ضرورت اور مشترک اُمور کے لئے اُمت کو یکجا ہو جانے پر توجہ دلائی، شیخ تسخیری کے ایک ایک لفظ سے تواضع وفروتنی کا اظہار ہوتا تھا، اس طرح یہ عظیم الشان کانفرنس جس میں ایران کے علاوہ سعودی عرب، شام، لبنان، فلسطین، لیبیا، بحرین، مسقط، مصر، پاکستان، افغانستان، روس، ہندوستان، بنگلہ دیش، ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، امریکہ، جرمنی، برطانیہ، آسٹریا، سنگال، مراقش اور مختلف اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے نمائندے شریک تھے، اختتام پذیر ہوئی۔

اس کانفرنس میں مختلف شخصیتوں، ملکوں اور تنظیموں کو نمائندگی دینے کے لئے ایک تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی ہر نشست میں صدر مجلس کے ساتھ ساتھ نائب صدر اور سکریٹری برائے جلسہ بھی رکھے گئے تھے، تمام لوگ اپنے مقالات اور خطبات لکھ کر پیش کرتے تھے اور وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے، ہر نشست اپنے وقت پر شروع ہوتی اور وقت ہی پر ختم ہوتی، مقررین اور مقالہ نگاروں کو وقت کا پابند رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی، لیکن بعض لوگ اپنی حدوں کو پھاند جاتے، ایسے مواقع پر منتظمین بعض ایرانی مقررین سے اجازت لے کر ان کا پروگرام ختم کردیتے، لیکن وقت پر نشست کو ختم کرنے کا پورا اہتمام کرتے، یہ واقعی ایک قابل تقلید عمل ہے کہ وقت پر پروگرام کا آغاز اور وقت ہی پر اختتام ہو اور مقالہ نگاروں اور مقرروں کی گفتگو اپنے موضوع اور وقت کے دائرہ میں ہو۔

۱۹ مئی کو صبح کا وقت پروگرام کی نشستوں سے خالی رکھا گیا تھا، صبح ساڑھے آٹھ تا گیارہ بجے موجودہ رہبر انقلاب علامہ سید خامنہ ای سے ملاقات کے لئے تھا اور گیارہ کے بعد علامہ خمینی کے مرقد پر حاضری تھی، چنانچہ ہم لوگ صبح ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل سے بسوں کے ذریعہ علامہ خامنہ ای کی قیام گاہ پر لے جائے گئے، جو ہوٹل سے خاصے فاصلہ پر واقع ہے، بعض

منتظمین نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ گھڑی ساتھ نہ رکھی جائے، قیام گاہ سے کئی فرلانگ پہلے ہی مہمانوں کو بس سے اُتار دیا گیا، پھر سیکورٹی کے مراحل سے گذرنے کے بعد ایک راستہ سے بیرونی مہمان اور دوسرے راستہ سے ایران کے مندوبین کو اندر لے جایا گیا، جہاں ملاقات کا نظم کیا گیا تھا، وہ ایک مستطیل، بڑا اور اونچا ہال تھا، سادہ لیکن خوبصورت، سامنے کی جانب دو منزلیں، ایک نیچے جس کے ایک طرف پردے پڑے ہوئے تھے اور دوسرا اوپر جہاں گلاس کے دروازے تھے، اوپر بھی ایک اسٹیج تھا، نیچے بھی ایک اسٹیج، اسٹیج کے نیچے دائیں بائیں ایران کے علماء وقائدین کی نشست تھی، اسٹیج کے سامنے پانچ، چھ ہاتھ کے فاصلہ سے بیرونی مہمان اور ان کے پیچھے ایران کے مدعوئین بیٹھے ہوئے تھے اور یہ سب فرش پر تھے، ڈائس پر درمیان میں اونچا سا تخت تھا اور اس پر ایک کرسی، دائیں بائیں اس سے نیچے تخت تھے، ان پر نشستی صوفے لگے ہوئے تھے، نیچے سے پردہ ہلا اور علماء وقائدین کے جلو میں موجودہ رہبر انقلاب علامہ خامنہ ای نمودار ہوئے، پورا مجمع احترام میں کھڑا ہو گیا اور ایرانی مہمانوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر، علامہ خمینی اور علامہ خامنہ ای کے نام کا نعرہ لگاتے ہوئے اور تکبیر و درود شریف پڑھتے ہوئے استقبال کیا، کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، پیچھے کی طرف اوپر کی منزل پر خواتین تھیں، درمیان میں اونچے تخت اور اس پر رکھی گئی کرسی پر علامہ خامنہ ای بیٹھے، دائیں طرف صوفے پر موجودہ صدر جناب خاتمی اور سابق صدر ہاشمی رفسنجانی اور بائیں جانب صوفے پر پارلیمنٹ کے اسپیکر اور چیف جسٹس بیٹھے ہوئے تھے، ڈائس کے عین اوپر علامہ خمینی کی تصویر لگی ہوئی تھی، موجودہ رہبر انقلاب خامنہ ای علامہ خمینی کے خاص شاگرد ہیں، جن کو انھوں نے اپنے بعد ولی فقیہ نامزد کیا تھا، علامہ خامنہ ای کی تصویروں میں عام طور پر ان کی داڑھی سیاہ ملتی ہے، لیکن اب ان کی داڑھی سفید ہو چکی ہے، کھلا ہوا رنگ، سیاہ عمامہ، سنہری رنگ کی عینک، جبہ پر ہلکی سیاہ عباء اور ہاتھ میں عصا، وقار و تمکنت چہرہ بشرہ، وضع قطع اور ایک ایک حرکت سے نمایاں، علامہ خامنہ ای کے بیٹھتے ہی قاری نے تلاوت کی، پھر تھوڑی دیر صدر خاتمی کا خطاب ہوا، اس

کے بعد بیس، پچیس منٹ علامہ خامنہ ای نے خطاب کیا، دونوں تقریریں فارسی میں تھیں اور تقریر کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں ان کے ترجمہ کا بھی نظم تھا، دونوں تقریروں کا موضوع مغربی استعماریت، عالم اسلام پر امریکہ کی چیرہ دستی، عراق میں امریکی مداخلت کی مخالفت اوراتحادِ اُمت کی ضرورت تھا، علامہ خامنہ ای نے یہ بات بھی کہی کہ اگر ہمارا ایمان قوی ہو، اللہ پر یقین اور ہماری صفوں میں اتحاد ہوتو گو ہمارے پاس فوج اور ہتھیار کی قوت کم ہے، پھر بھی ہم اعدائے اسلام کا مقابلہ کر سکتے ہیں، خطاب ختم ہوتے ہی خامنہ ای اور صدر خاتمی وغیرہ سیکوریٹی کے حصار میں اندر پہنچا دیئے گئے اور مہمان آہستہ آہستہ ہال سے باہر نکل آئے، اجلاس میں یہ بات ذرا عجیب محسوس ہوئی کہ علامہ خامنہ ای اور چند عہدہ دارانِ حکومت کرسی پر متمکن رہے اور باقی سارے لوگ جس میں عالم عرب کے بہت ممتاز علماء اور بعض وزراء حکومت بھی موجود تھے، سامنے فرش پر بیٹھے رہے، عربوں کا مزاج ہمیشہ یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ اپنے مہمانوں کو خواہ کم تر سطح کے کیوں نہ ہوں برابر میں بیٹھاتے ہیں اور یقیناً یہی اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے۔

یہاں سے ہم لوگ علامہ خمینی کے مزار لے جائے گئے، یہ تہران شہر کے بالکل کنارے خاصے فاصلہ پر ہے، اندازہ ہے کہ ۴۵ منٹ ایک گھنٹہ کا راستہ ہوگا، اس سے قریب ایک قبرستان بہشت زہراء کے نام سے ہے، اس لئے یہ علاقہ بھی بہشت زہراء کہلاتا ہے، مقبرہ، اس کے گردو پیش کی عمارتیں، باغات اور کھلے ہوئے صحن کم وبیش دو ڈھائی کیلومیٹر کے علاقہ پر محیط ہوگا، گاڑیاں عمارت کے قریب لاکر روکی گئیں، ہم لوگ ایک بڑے باب الداخلہ سے اندر آئے، یہاں دونوں طرف کسی قدر اونچے پلیٹ فارم اور نیچے راہ داری بنی ہوئی ہے، بیرونی مہمان اوپر کے پلیٹ فارم سے اور باقی لوگ نیچے کی راہ داری سے آگے بڑھے اور قبر کے قریب آکر سارے لوگ سطح زمین پر جمع ہوئے، فوجیوں نے قاعدہ کے مطابق گارڈ آف آنر پیش کیا، قبر پر نقرئی جالیاں اور ان جالیوں کے اندر شیشے نصب ہیں، صرف اتنا سا حصہ کھلا ہوا

ہے، جس سے عقیدت مند روپئے نذر کرتے ہیں، ایک طرف سے مردوں کی زیارت گاہ ہے اور دوسری طرف سے خواتین کی، اور درمیان میں عارضی دیوار کھڑی کردی گئی ہے، قبر کے چاروں طرف سے روپیوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے، معلوم ہوا کہ مختلف مزارات پر نذر کی جانے والی یہ رقوم وقف کی ملکیت ہوتی ہیں، قبر جس ہال میں واقع ہے وہ کافی طویل وعریض بھی ہے اور بلند بھی، جب دوسرے ملکوں کے سربراہ ایران آتے ہیں، تو وہ یہیں آکر بابائے قوم کی قبر پر پھول چڑھاتے ہیں، یہ عمارت اندر سے بھی بہت خوبصورت ہے، اس کی تعمیری شان وشوکت دوسرے مزارات سے کم ہے، لیکن بیرونی حصہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، عین قبر کے اوپر بڑا سا طلائی گنبد ہے اور چاروں طرف کچھ فاصلہ پر زمین سے خاصے بلند قامت مینارے بنے ہوئے ہیں، یہ مینارے پچاس، ساٹھ فٹ تو دوسری تعمیری اشیاء سے بنے ہوئے ہیں، لیکن اس سے اوپر خاصے بلند حصہ پر یا تو سونے کی چادریں ہیں، یا انھیں آبِ زر سے رنگ دیا گیا ہے، ایرانیوں کے ذوق کے تحت اگر یہ سونے کے بھی ہوں تو تعجب نہ ہونا چاہئے، پھر ان میناروں سے تھوڑے فاصلے پر برجیں بنی ہوئی ہیں، جو مزار کے چار سمتوں میں پڑتی ہیں اور برج پر بڑے نیل گول گنبد بنے ہوئے ہیں، اس طرح چاروں طرف سے کھلے ہوئے میدانوں، ان کے درمیان وسیع سبزہ زاروں اور رنگ برنگ کے سجے سجائے گلستانوں کے درمیان یہ فلک بوس، وسیع وعریض، ہمہ رنگ عمارت پہلی دفعہ آنے والے ہر شخص کو مسحور کرکے رکھ دیتی ہے۔

ایران کے موجودہ سماج میں علامہ خمینی کی خاص اہمیت ہے اور انھیں ایک مسیحا کا درجہ حاصل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے شیعہ برادری کو ایک نئی اور انقلابی فکر سے ہم کنار کیا ہے، شیعہ فرقہ کے نزدیک منصب امامت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، امام کا اہل بیت میں سے ہونا ضروری ہے اور وہ معصوم ہوتے ہیں، شیعی عقیدہ کے مطابق بارہویں امام لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہوگئے اور قربِ قیامت میں دوبارہ ان کا ظہور ہوگا، اس عقیدہ سے ان میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو اُمور امام سے متعلق ہوں، وہ امام غائب کے ظہور تک معطل رہیں گے، اسی لئے نہ

ان کے یہاں اسلامی حکومت کا تصور تھا کہ یہ امام کے وجود کا محتاج ہے، نہ جمعہ وعیدین کی نماز کا اہتمام تھا، کہ اس کے لئے سلطان کی اجازت ضروری ہے، زکوٰۃ کا وصول کرنا اصل میں امام المسلمین کا حق ہے، اس لئے زکوٰۃ بھی چھوڑ دی گئی اور جس معاشرہ میں اسلامی حکومت کا تصور نہ ہو، اس کے لئے کوئی جدوجہد نہ ہو، نماز وزکوٰۃ کا اہتمام نہ ہو، اس معاشرہ میں دینی اعتبار سے جو انحطاط پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے، اس لئے ایران اور پوری دنیا میں شیعہ فرقہ کی دین داری ’’عزاء داری‘‘ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ایران کی شاہی حکومت کے لئے یہ بات نیک فال تھی، کیوں کہ اس کی وجہ سے ان میں کوئی حرکت، جوشِ عمل اور جذبۂ جنوں پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور آمرانہ نظام حکومت میں عوام کی یہ گراں خوابی مفید مقصد ہوا کرتی ہے۔

علامہ خمینیؒ نے ایک نیا تصور ’’ولایت فقیہ‘‘ کا پیش کیا، یعنی کوئی فقیہ امام غائب کا نائب ہوسکتا ہے اور جو اُمور امام سے متعلق ہیں، انھیں نیابتاً ولی فقیہ کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس تصور کے تحت ایران میں انقلاب آیا، حکومت کی باگ وڈور مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے اثنا عشری فقہ کے مطابق ملک میں قوانین نافذ کئے، ایک ایسے نظام حکومت کی بنیاد پڑی جس میں عوامی نمائندوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن سپریم پاور ’’ولی فقیہ‘‘ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ولی فقیہ کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ ہر ولی مذہبی ارکان پر مشتمل اپنی خصوصی شوریٰ کے مشورہ سے اگلے ولی کو نامزد کرتا ہے اور اسی کے زیرِ نگرانی نظام حکومت کا جاری وساری رہتا ہے، اسی ولی کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، اسی کے حکم سے جمعہ اورعیدین کا قیام عمل میں آتا ہے، اس فکر نے ایران میں مذہب کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے، اسی لئے علامہ خمینیؒ آج ایران بلکہ تمام دنیا میں اہل تشیع کے دل کی دھڑکن بن گئے ہیں۔

ان کا نام سید روح اللہ تھا ’’خمین‘‘ نامی قصبہ میں پیدا ہوئے، اسی نسبت سے ’’خمینی‘‘ کہلائے، ایران کے مقدس مقام ’قم‘ میں تعلیم حاصل کی، شاہی نظام کے خلاف جدوجہد کی

پاداش میں بہت دنوں اپنے ہی مکان میں نظر بند رہے، پھر جلا وطن کئے گئے، کچھ دنوں عراق میں اور زیادہ عرصہ پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گذاری، انقلاب کی کوششوں میں خود جو تکلیف اُٹھائی، علاوہ اس کے اپنے بیٹے کو بھی کھودیا، یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء میں شاہ ایران جس کو دنیا کا مرد آہن تصور کیا جاتا تھا اور جس کی آمرانہ قوت وشوکت کے سامنے برے بڑے حوصلہ مند لوگوں کا پتّہ پانی ہوجاتا تھا، کو آخر اس بوڑھے، پتلے دبلے، پیر جواں ہمت کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑا اور ۱۹۸۷ء میں وہ انقلاب رونما ہوا، جس نے شاہ کی بساط حکومت کو لپیٹ کر رکھ دیا، حالاں کہ علامہ خمینی کوئی بڑے مقرر اور پُر جوش خطیب نہیں تھے، وہ مختصر، سنجیدہ اور آہستہ آہستہ تقریر کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تقریروں میں ایسی تاثیر رکھ دی تھی کہ پوری خلقت ان کے اشارے پر سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتی تھی۔

یہیں مہمانوں کے لئے ظہرانہ کا نظم تھا، ہم لوگ ظہرانہ سے فارغ ہوئے اور بس کی طرف آگئے، کچھ لوگ پہلے آگئے، ان ہی میں، میں بھی تھا، زیادہ تر لوگ ابھی کھانے میں مشغول تھے، بس کے پاس ایک افغانی نمائندہ بھی موجود تھے، مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں حنفی ہوں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، تو بہت خوش ہوئے، معانقہ کیا اور دیر تک اسی بات کا ذکر کرتے رہے، اتنے میں ملیشیا کے چند نمائندے آگئے، ان سے بھی ان کا مسلک پوچھا، جب انھوں نے کہا کہ میں شافعی ہوں، تو کہنے لگے تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لیکن ان لوگوں سے ملاقات میں کوئی گرم جوشی اور اپنائیت کا اظہار نہیں تھا، مجھے اس طرح کی باتیں بہت گراں گذرتی ہیں، محبت کی بنیاد اُخوت اسلامی اور رشتہ ایمانی ہونا چاہئے، نہ کہ حنفیت، شافعیت اور غیر مقلدیت اور مخصوص جماعتی تعلق وغیرہ، مسلمانوں نے جو اپنی محبت کے دائرے محدود کر لئے ہیں اور انھیں ایک خاص حلقہ کا پابند بنالیا ہے، یہ نہایت افسوس ناک اور نقصاندہ ہے اور وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ایسی تنگنائیوں سے باہر آئیں، ہم لوگوں نے ظہر کی نماز ہوٹل آکر ادا کی اور گیارہ بجے شب تک کانفرنس کے مختلف پروگراموں میں شریک رہے۔

۲۰ مئی کی صبح سے ہی مہمانوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہو گیا، میری واپسی آج رات دیر گئے تھی، اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے کانفرنس کے ذمہ داروں سے خواہش کی کہ ایران کے مذہبی شہر قم کی زیارت کرائی جائے، چنانچہ راقم الحروف کے علاوہ ڈاکٹر عبدالوہاب ابوسلیمان (مکہ مکرمہ)، ڈاکٹر انس شفقہ (آسٹریلیا)، ڈاکٹر عاصمی (واشنگٹن) اور رہبر سفر دو کاروں میں قم کے لئے روانہ ہوئے، قم تہران سے دوسو کیلومیٹر کے قریب ہے، ہم لوگوں کو قم پہنچنے میں دو گھنٹہ کا وقت لگا ہوگا، ایران کی سڑکیں خلیجی مما لک کی سڑکوں کی طرح کشادہ اور عمدہ ہیں، اور طویل سفر میں بھی تکان محسوس نہیں ہوتی، فلائی برج کی کثرت کی وجہ سے ٹریفک ازدحام کے باوجود زیادہ دیر رکنا نہیں پڑتا، قم میں عام عمارتیں تو سادہ سی ہیں، بلکہ بہت سی عمارتیں پلاسٹر سے عاری ہیں، لیکن مذہبی عمارتیں بڑی خوبصورت اور شوکت وشکوہ کی حامل ہیں، یہ شہر ایران کا مذہبی دارالخلافہ ہے اور ۱۹۸۷ء کے انقلاب میں بھی اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

مدارس، مزارات اور مساجد کی باوقار اور خوبصورت عمارتوں کی وجہ سے یہ شہر بڑا دلکش منظر پیش کرتا ہے، مجموعی طور پر قم میں تقریباً سو مدارس ہیں اور یہاں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد بحیثیت مجموعی چالیس تا پچاس ہزار ہے، یہاں کا سب سے قدیم مدرسہ ''مدرسہ معصومیہ'' ہے، جس میں دو ہزار سے زیادہ ایرانی طلبہ زیر تعلیم ہیں، ہم لوگ سب سے پہلے ''مدرسۃ الامام خمینی'' پہنچے، اس مدرسہ کی بنیاد خود علامہ خمینی نے رکھی ہے، یہ نہایت وسیع، خوبصورت اور مینا کاری سے مزین عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس میں دارالاقامہ، درسگاہ، کتب خانہ، انتظامی دفاتر اور مساجد کے الگ الگ کامپلکس ہیں اور سب ایک دوسرے سے منسلک ہیں، شادی شدہ طلبہ کے لئے شہر میں کوارٹرس بنے ہوئے ہیں، یہ مدرسہ بنیادی طور پر بیرون ملک کے طلبہ کے لئے قائم کیا گیا ہے، اس کی بیس شاخیں قم اور ایران کے دوسرے شہروں میں کام کر رہی ہیں، منتظمین کے بیان کے مطابق مرکزی درسگاہ میں نوے مما لک کے آٹھ ہزار طلبہ وطالبات زیر

تعلیم ہیں اور شاخوں کو لے کر اس جامعہ کے طلبہ کی تعداد بیس ہزار تک پہنچتی ہے، چوں کہ اس جامعہ کی عمر زیادہ نہیں ہے، اس لئے فضلاء کی مجموعی تعداد کل پانچ سو ہے، اس کے نظام تعلیم کو چار مراحل پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلا مرحلہ تمہیدی ہے، جس میں فارسی زبان سکھائی جاتی ہے، تا کہ آئندہ مراحل میں اسے دقت نہ ہو، پھر اس کے بعد دوسری درسگاہوں کی طرح تعلیم کے تین مراحل ہیں، ان مراحل سے گذرنے کے بعد، پھر علوم اسلامی کے مختلف شعبوں میں تخصصات ہیں، جامعۃ الامام خمینی میں جامعہ کے وائس چانسلر شیخ علی رضا المراضی نے مہمانوں کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور جامعہ کے مختلف شعبوں کا تعارف کرایا، جامعہ کی لائبریری بھی کئی لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے اور یہاں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے مراجع موجود ہیں، وائس چانسلر نے ہم لوگوں کو رخصت کرتے ہوئے کچھ تحائف بھی دیئے۔

قم کے مشہور مدارس میں سے ایک ''مدرسہ فیضیہ'' ہے، اس کے قیام پر سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، ہم لوگ مدرسۃ الامام خمینی کے معائنہ سے فارغ ہو کر اس مدرسہ میں پہنچے، اس کی عمارت بھی بہت خوبصورت اور قلعہ نما ہے اور قدیم تعمیر کے ساتھ جدید عمارتوں کا بھی اچھا خاصا حصہ ہے، اس مدرسہ میں علامہ خمینی نے بھی تعلیم پائی ہے، چنانچہ ان کے رہائشی کمرہ کو ان کی یادگار بنا دیا گیا ہے، جس میں ان کی تصویر اور ان کی زمانۂ طالب علمی کی کچھ یادگاریں ہیں، یہاں سے نکل کر ہم لوگوں نے ظہرانہ تناول کیا اور پھر سیدہ فاطمہ معصومہ کے مزار کے احاطہ میں گئے، اس کو ایران میں ''حرم معصوم'' کہا جاتا ہے، صاحبِ مزار کا نام ''فاطمہ'' ہے، یہ امام سید رضا کی بیوی اور امام کاظم موسیٰ کی بہن ہیں، مقبرہ کا بہت وسیع احاطہ ہے، دوسرے مزارات کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر شیشہ کے نازک کام سے اندرونی دیواریں اور خوش وضع رنگ برنگ کے کاموں سے بیرونی دیواریں مزین ہیں، وسیع صحن میں حوض اور فوارے بہت ہی دلکش منظر پیش کرتے ہیں، احاطۂ مزار کے باہر بڑا سا میدان ہے، جس پر پتھر کا فرش بچھا ہوا ہے، اس میدان کے ایک کنارے دکانوں کی طویل قطاریں ہیں، جو زیادہ تر تبرکات کی ہیں،

یہاں تسبیحات، ٹوپیاں، جانمازیں، مسواک، سرمہ اور قم کی خاص مٹھائی سوہان نیز خشک فروٹ ملتے ہیں، جیسے مدینہ منورہ میں حرم مقدس کے باہر اور جنت البقیع کے سامنے دوکانیں ہیں، یہاں بھی یہی منظر نظر آتا ہے اور زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

قم میں بہت سی مسجدیں ہیں، سب سے بڑی مسجد ''مصلی القدس'' کہلاتی ہے، اسی مسجد میں نماز جمعہ ہوتی ہے، یہ بہت وسیع وعریض خوبصورت نقش ونگار سے آراستہ مسجد ہے، جو بہت بڑے اور نمایاں، سنہرے گنبد سے مزین ہے، ہم لوگوں نے مسجد کو باہر ہی سے بھی دیکھا، اندر جانے کی نوبت نہیں آئی، قم کے بعض لوگوں نے بتایا کہ اس شہر کو دیکھنے کے لئے ہفتہ دو ہفتہ چاہئے، دو چار گھنٹوں میں تو اُچٹتی نظر سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا، واقعہ بھی یہی ہے کہ یہاں بہت سے ادارے اور فن تعمیر کے شہ پارے تھے کہ دل ونگاہ ان کی طرف کھینچا جاتا تھا، لیکن وقت کی اجازت نہیں تھی کہ یہاں مزید وقت گزارا جائے۔

قم میں طلبہ کی اچھی خاصی تعداد ہندوپاک اور بنگلہ دیش کی بھی ہے، ذمہ داروں نے بتایا کہ پچاس فیصد بیرونی طلبہ برصغیر اور لبنان کے ہیں، بہت سے طلبہ سے ملاقاتیں ہوئی، جو یوپی کے مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں، معلوم ہوا کہ حیدرآباد کے طلبہ بھی ہیں، لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوسکی، ایک طالب علم سے ملاقات ہوئی، ان کا تعلق نانوتہ ضلع سہارنپور سے تھا اور وہ دیوبند وعلماءِ دیوبند کی تاریخ سے بہت اچھی طرح واقف تھے، ان میں سے بعض طلبہ نے تہران آکر ملاقات بھی کی تھی، اس سفر میں ہم لوگوں کے رہبر ودلیل ایک صالح نوجوان سید حسن تھے، جو بڑی سعادت مندی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت کرتے رہے۔

ہم لوگ تقریباً چار بجے قم سے تہران کے لئے نکلے، قم سے نکلتے ہوئے شہر سے باہر باب الداخلہ بنا ہوا ہے، یہاں پٹرول پمپ، ہوٹل، تبرکات کی دوکانیں، مسجد اور حمامات وغیرہ ہیں اور اس کے قریب ہی کمروں کی لمبی لمبی قطاریں ہیں، جو سرائے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، یہ سارا اہتمام غالباً زائرین کی نسبت سے ہے، بہر حال ڈیڑھ تا دو گھنٹہ میں ہم لوگ اپنی

منزل کو واپس آ گئے، ہوٹل پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بعد مغرب ''المجمع العالمی للتقریب'' کے تحت چلنے والے ''جامعة المذاهب الاسلامية'' کو جانا ہے، ہمیں اطمینان دلایا گیا کہ یہ معائنہ مختصر وقت میں ہوگا اور آپ کو سفر کی تیاری کا موقع ملے گا، حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی اس ادارہ کو دیکھنے کا مشتاق تھا، اس لئے تھوڑی دیر آرام کر کے سامان سفر درست کیا اور پھر اس جامعہ کو جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

چوں کہ اکثر مہمان ایران سے جا چکے تھے یا جانے والے تھے، اس لئے ایک منی بس میں ہم لوگوں کو مجمع کے مرکز پر لے آیا گیا، ''جامعة المذاهب'' کا لان مختصر سا ہے، جس میں فوارہ اور پھولوں کے جھاڑ بھی لگائے گئے ہیں، یہیں پچاس ساٹھ طلبہ موجود تھے، جامعہ کے مدیر غالباً سید حسن ربانی نے افتتاحی خطاب کیا اور اپنے خطاب میں بتایا کہ علماء اہل سنت اور علماء شیعہ ہمیشہ ایک دوسرے سے علمی اعتبار سے مربوط رہے ہیں، امام جعفر صادقؒ اور امام باقرؒ سے امام ابوحنیفہؒ اور مالکؒ وغیرہ نے استفادہ کیا ہے، اسی طرح ائمہ اہل بیت اور ممتاز شیعہ علماء اکابر اہل سنت سے مستفید ہوتے رہے ہیں، ''جامعة المذاهب'' کا مقصد ان ہی رابطوں کو استوار کرنا ہے، مہمانوں کی طرف سے شیخ عبدالمنعم زین جو اصل میں لبنان کے رہنے والے ہیں، لیکن اس وقت سنگال میں ایک بڑی شیعی درسگاہ کے ذمہ دار ہیں، نے ابتدائی خطاب کیا، ان کی زبان بہت سلیس، مرصع اور لب ولہجہ طاقتور اور موثر ہے، ان کے خطاب کے بعد ڈاکٹر عبدالوہاب ابوسلیمان کا خطاب ہوا، انھوں نے مذاہب اسلامی کی باہم قربت کی ضرورت پر مختصر لیکن نہایت ہی عالمانہ خطاب فرمایا، ہم لوگوں کے اس مختصر سے قافلہ میں شام کے ایک پختہ کار عرب شاعر مصطفیٰ عکرمہ موجود تھے، انھوں نے اس موقع سے اپنی کئی نظمیں، نعتیں اور قصائد سنائے اور خوب داد حاصل کی، اخیر میں طلبہ نے عربی زبان میں خیر مقدمی نظم پڑھی اور اسی پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔

''جامعة المذاهب'' کی بنیاد موجودہ رہبر انقلاب علامہ خامنہ ای نے رکھی ہے، پہلے

اس کے صدر آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی تھے، اب آیت اللہ محمد علی تسخیری ہیں اور علامہ خراسانی ان کے نائب ہیں، اس مجمع کے بارہ ارکان ہیں، جن میں چھ ایران سے اور بقیہ، عراق، لبنان، ملیشیا، عمان، پاکستان اور امریکہ سے ہیں، زیادہ تر ارکان شیعہ ہیں، بعض اہل سنت (حنفی وشافعی) بھی ہیں اور ایک رکن کا تعلق فرقہ اباضیہ سے ہے، اس جامعہ میں عام طور پر عصری درسگاہوں کے تعلیم یافتہ فضلاء کو لیا جاتا ہے، اکثر طلبہ ایران کے ہیں اور مذہب شیعہ سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ طلباء بیرون ملک کے بھی ہیں اور بقول ذمہ داروں کے اہل سنت طلباء بھی ہیں، اس جامعہ میں علوم القرآن، حدیث، کلام، فقہ اور تصوف مستقل اور لازمی مضامین کی حیثیت سے داخل نصاب ہیں، ابتدائی دو سال طالب علم کو وہ فقہ پڑھائی جاتی ہے، جس پر اس کا عمل ہے اور بعد کے سالوں میں فقہ حنفی، فقہ شافعی اور فقہ اثنا عشری پڑھائی جاتی ہے، میں نے خود بھی وہاں کے بعض طلبہ سے گفتگو کے دوران محسوس کیا اور بعض علماء اہل سنت نے بھی بتایا کہ جو طلبہ اس درسگاہ سے پڑھ کر نکلتے ہیں، ان کی سوچ میں اعتدال وتوازن ہوتا ہے اور وہ مختلف مذاہب کا احترام کرتے ہیں۔

مجمع التقریب بین المذاهب کا مقصد بھی یہ ہے کہ مذاہب کے درمیان قربت پیدا ہو، اور فاصلے کم ہوں، کانفرنس میں پروگرام کی جو فائلیں مہمانوں کو دی گئی تھیں، اس میں سرورق کے پشت پر فارسی زبان میں آیت اللہ خامنہ ای کا یہ ملفوظ درج ہے :

> اسلام کے تمام بنیادی اُصول میں سنی اور شیعہ ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ہیں، مختلف اسلامی فرقوں کے بزرگوں اور مفکرین کے درمیان تحقیق و تبادلۂ خیال کے ذریعہ اسلامی مذاہب کے درمیان قربت کی بنیاد فراہم ہوسکتی ہے۔

یہی فکر اس اکیڈمی اور جامعہ کی بنیادی پالیسی ہے، اکیڈمی کی عمارت خیابان طالقانی میں واقع ہے، جو سات منزلہ جدید قسم کی عمارت ہے اور اس کے تحت جامعہ کی عمارت علاحدہ

ہے، واضح ہو کہ فارسی میں اس جامعہ کا نام ''دانش گاہ مذاہب اسلامی'' رکھا گیا ہے، ایران میں اسکول کی سطح کی درسگاہوں کو ''آموزش گاہ''، کالج کو ''دبیرستان'' اور یونیورسٹی کو ''دانش گاہ'' سے تعبیر کرتے ہیں، اس اکیڈمی نے بہت سی کتابیں بھی شائع کی ہیں، جن میں متعدد کتابیں اہل سنت کی بھی ہیں، مذاہب اہل سنت کی مشہور کتاب ''بداية المجتهد'' کو اس طرح شائع کیا ہے کہ حاشیہ پر ان مسائل کے بارے میں اثنا عشری فقہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی اکیڈمی کے تحت ان احادیث، روات اور احکام کو جمع کرنے کا کام ہو رہا ہے، جو اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان متفق علیہ اور قابل قبول رہے ہیں۔

جامعہ میں استقبالیہ تقریب کے بعد عشائیہ کا نظم بھی تھا اور عشائیہ بہت ہی پر تکلف تھا، عشائیہ پر شیخ مصطفیٰ عکرمہ موقع بہ موقع اپنے اشعار بھی پیش کرتے جاتے تھے اور بعض اوقات دوسرے عرب علماء سے ان کی دوستانہ نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی، کچھ لطائف و ظرائف کا سلسلہ بھی تھا، خاص کر سینگال کے نمائندہ شیخ عبدالمنعم زین کے لطائف سے ہم سب خوب خوب محظوظ ہوئے، قریب رات بارہ بجے ہم لوگ ہوٹل واپس ہوئے اور تقریباً ڈھائی بجے کانفرنس کے ایک نمائندہ کے ساتھ ہم ایر پورٹ کے لئے نکلے، وی، آئی، پی کاؤنٹر سے نکلنے کی وجہ سے دو چار منٹ میں ہی سارے مراحل طے پا گئے، چار بجے صبح جہاز کی پرواز شروع ہوئی اور ہندوستان کے وقت صبح ساڑھے نو بجے ہم دہلی کے انٹرنیشنل ایر پورٹ پر تھے۔

عام تصور یہ ہے کہ ایران میں اہل سنت کی آبادی نہیں ہے، یا ہے تو بالکل نا قابل لحاظ، مگر وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ یہ درست نہیں ہے، ایران میں کم وبیش تیس فیصد اہل سنت ہیں، اہل سنت کی زیادہ تر آبادی افغانستان سے ملے ہوئے صوبوں خاص کر بلوچستان، اور ترکی وعراق سے ملنے والے صوبوں کردستان وغیرہ میں ہے، اسی طرح ایران کا ایک علاقہ ترکمانستان سے موسوم ہے، وہاں بھی اہل سنت کی اکثریت ہے، بعض علاقوں میں تو ستّر، اسّی فیصد اہل سنت ہیں، بلوچستان کے شہر زہدان اور اس کے قرب وجوار میں اہل سنت کے مدارس

کی بڑی تعداد ہے، زہدان میں اہل سنت کی سب سے بڑی درسگاہ ''دارالعلوم زاہدان'' ہے، اس میں ایک ہزار طلبہ دارالاقامہ میں ہیں، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب نے اس ادارہ کی بنیاد رکھی ہے، جو دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں تھے، اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے۔

تقسیم ہندو پاک سے پہلے بلوچستان سے آٹھ علماء دارالعلوم دیوبند میں اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے، ان ہی حضرات کے ذریعہ ایران کے سنی علاقوں میں فروغ تعلیم اور اصلاح کا کام ہوا، تقسیم ہند کے بعد یہاں سے طلبہ عام طور پر پاکستان جانے لگے، اس وقت جامعہ حقانیہ اکوڑا ختک، جامعہ خیرالعلوم ملتان، دارالعلوم بنوری ٹاؤن، دارالعلوم کراچی اور جامعہ اشرفیہ لاہور وغیرہ کے سینکڑوں فضلاء اس علاقہ میں موجود ہیں اور اب بیسیوں مدارس میں دورۂ حدیث شریف تک تعلیم ہوتی ہے۔

اس بات سے مسرت ہوئی کہ یہاں کے علماء متحرک اور زمانہ شناس ہیں، وہ سیاست سے بھی کنارہ کش نہیں ہیں، بلکہ جو سنی ارکانِ پارلیمنٹ منتخب ہوتے ہیں، وہ علماء ہی کی تائید وایماء سے، اسی لئے 'زاہدان' جو اہل سنت کا مرکز ہے، سیاسی اثر ورسوخ کا بھی حامل ہے، عام مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کے لئے مدارس رمضان المبارک اور تعطیلات میں منتہی طلبہ کو مختلف علاقوں میں بھیجتے ہیں، وہ لوگوں کو مبادیات دین کی تعلیم دیتے ہیں اور دعوت واصلاح کا کام کرتے ہیں، ایران میں تبلیغی جماعت کا کام بھی ہوتا ہے، لیکن انھیں کچھ قانونی مشکلات درپیش ہیں، پھر بھی بلوچستان کے علاقہ میں تبلیغی کام نسبتاً زیادہ ہے، وہاں کی مصلحت کے تحت جماعت میں امارت کے بجائے شورائی نظام رکھا گیا ہے اور ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ جماعت کی باگ وڈور علماء کے ہاتھ میں ہے، اہل مدارس نے اپنا ایک وفاق بھی قائم کر رکھا ہے، اس طرح ان درسگاہوں میں باہمی ارتباط بھی پایا جاتا ہے، مدارس کا نصابِ تعلیم قریب قریب وہی ہے، جو دیوبند اور اس حلقہ کے دوسرے مدارس میں ہے، البتہ بتقاضائے احوال اس میں

تھوڑی بہت تبدیلی بھی گئی ہے۔

۱۴۱۹ھ سے ایک نیا کام دارالعلوم زاہدان نے نئے فقہی مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا شروع کیاہےاوراس سلسلہ میں '' مجمع الفقه الاسلامی لأهل السنة '' قائم کی ہے، ایران میں زیادہ تر سنی حضرات حنفی ہیں، اور کچھ تعداد شوافع کی ہے، اس نسبت سے احناف وشوافع دونوں ہی اکیڈمی میں شامل ہیں، اب تک اس اکیڈمی نے ان پانچ مسائل پر اجتماعات منعقد کئے ہیں :

۱) ایران کے مخصوص حالات میں انشورنس۔

۲) بینکوں میں قرض لینے والوں سے سروس چارج کی وصولی سود میں شامل ہے یا نہیں؟

۳) ایران میں مروج حوالہ کا طریقہ۔

۴) مشینی ذبیحہ۔

۵) شوہر کا بیوی کو ماں اور بہن کہنا اوراس سلسلہ میں اس علاقہ کا عرف۔

اس وقت اس کے ذمہ دار مولانا عبدالقادر عارفی استاذ جامعہ دارالعلوم زاہدان ہیں اورتمام علمی و دینی خدمات کے سرپرست حضرت مولانا عبدالحمید صاحب مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم زاہدان ہیں، بحمد اللہ ان حضرات نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے بھی رابطہ قائم کیا ہےاورضرورت ہے کہ ہندوستان کے علماء اور دینی مدارس سے ان حضرات کے روابط استوار ہوں۔

راقم الحروف کی ملاقات کانفرنس کے درمیان پہلی ہی نشست میں مولانا سراج الدین استاذ دارالعلوم زاہدان سے ہوئی، یہ نوجوان فاضل ہیں اور غالبًا دارالعلوم کراچی سے فضیلت حاصل کی ہے، خوش مزاج اور خوش طبع آدمی ہیں، انھوں نے میرا نام سنتے ہی پہچان لیا اور کہا کہ علماء ایران آپ کے نام سے آپ کی کتابوں کی نسبت سے واقف ہیں، اس سے مزید خوشی ہوئی اور اُنس کا احساس ہوا، پھر ان کے ساتھ کئی اہل علم مولانا احمد ناروئی، مولانا عبدالمجید مرادزہی

وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں، مولانا عبدالمجید اُردو اور فارسی دونوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، انھوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے، آج کل مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی ’’معارف الحدیث ‘‘ کا ترجمہ کررہے ہیں، بلکہ کئی جلدوں کا ترجمہ کر چکے ہیں، اور وہ شائع بھی ہو چکی ہے، مجھے بھی ان کا ایک نسخہ تحفتاً عنایت کیا، ماشاء اللہ اس کانفرنس میں ایران کے علماء اہل سنت کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد شریک تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ کمی بھی محسوس ہوئی کہ کانفرنس میں ایرانی سنی علماء میں سے مولوی اسحٰق مدنی کو نمائندگی دی گئی، جو صدر جمہوریہ ایران کے مشیر برائے اُمور اہل سنت ہیں، باقی ایران سے کسی اور سنی عالم کو غالباً خطاب کا موقع نہیں دیا گیا، حالاں کہ مقررین اور مقالہ نگاروں میں خاصی اور نمایاں تعداد مقامی علماء کی تھی۔

فکری اور مسلکی اعتبار سے بعض باتیں خوش آئند نظر آئیں، مثلاً صفوی دور سے ہی ایران میں خلفائے ثلاثہ اور صحابہ پر سب وشتم کا سلسلہ جاری تھا، یہاں تک کہ اس انقلاب سے پہلے باضابطہ ایک جلوس ’’عمر سوزنی‘‘ کے نام نکلتا تھا، جس میں نعوذ باللہ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا پتلا نذر آتش کیا جاتا تھا، لیکن انقلاب کے بعد اس ناشائستہ حرکت کو موقوف کردیا گیا، ریڈیو، ٹی وی اور عام جلسوں میں بھی صحابہ پر سب وشتم نہیں کیا جاتا، یہ اور بات ہے کہ مسئلہ امامت سے قطع نظر بھی صحابہ کی خدمات اور ان کی قربانیوں کے اعتراف کا حوصلہ ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے، ’’**ولعل الله يحدث بعد ذلك أمرا** ‘‘ لیکن بہر حال شیعی روایات کے لحاظ سے یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

اسی طرح عام طور پر شیعہ علماء قرآن مجید کو غیر محفوظ اور تحریف شدہ مانتے آئے ہیں، اسی لئے اہل تشیع کے یہاں قرآن کی تلاوت اور حفظ کا اہتمام نہیں ہے، لیکن انقلاب کے بعد علامہ خمینی اور دوسرے شیعہ علماء نے بہت تاکید کے ساتھ یہ بات کہی کہ موجودہ قرآن مجید ہی اصل قرآن ہے اور اس میں تحریف کی بات درست نہیں ہے، اس لئے آج کل ایران میں

قرآن مجید کی تعلیم اور حفظ پر بہت زور دیا جاتا ہے، ٹی وی کے ایک چینل سے مستقل طور پر قرآن مجید کی تلاوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم وتعلم سے جو دلچسپی اور رغبت ہونی چاہئے، ابھی اس کی بہت کمی ہے، کانفرنس کی مختلف نشستوں میں ایرانی قراء نے بڑی عمدہ اور دل آویز قرأت کی، ان میں سے بعض کو عالمی مقابلہ قرأت میں اور بعض کو کل ایران مقابلہ قرأت میں ایوارڈ بھی مل چکا تھا، لیکن دیکھا گیا کہ ہمیشہ قاری کے سامنے قرآن مجید کا نسخہ ہوتا ہے اور وہ دیکھ کر ہی تلاوت کرتا ہے، کم سے کم برصغیر کے لوگوں کے لئے یہ بات تعجب خیز ہوتی ہے کہ قاری زبانی قرآن مجید کی قرأت نہ کر سکے۔

تیسری اہم بات جس کا وہاں کے بعض سنی علماء نے بھی ذکر کیا، یہ ہے کہ ایک زمانہ میں اہل سنت کی عام طور پر تکفیر کی جاتی تھی، یہاں تک کہ فوج میں جو سنی ہوتے تھے، انھیں غیر مسلم تصور کیا جاتا تھا، لیکن اب یہ صورتِ حال نہیں ہے، اب شیعہ علماء برملا اس کا اظہار کرتے ہیں کہ اہل سنت بھی دائرہ ایمان میں ہیں، اسی لئے بہت سے علاقوں میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان شادی بیاہ کا تعلق بھی ہے —— یہ اہل کے بارے میں کچھ مثبت تبدیلیاں ہیں، جو یقیناً قابل تعریف ہیں، کاش ہندو پاک کی شیعہ برادری بھی ان کے افکار کو صدقِ دل سے قبول کر لے۔ وباللہ التوفیق .

ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتِ ایران اپنے سنی بھائیوں کے ساتھ مزید فراخ دلی کا رویہ اختیار کرے، پارلیمنٹ اور ملازمتوں میں اہل سنت کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ سے ہو، انھیں مذہبی تعلیم اور دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں پوری آزادی دی جائے اور تہران —— جیسے شہر جہاں بیس لاکھ سے زیادہ اہل سنت موجود ہیں —— میں انھیں اپنی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے، اگر حکومت ایران اس سلسلہ میں اہل سنت کے جذبات کا پاس ولحاظ رکھے تو یہ مذہبی رواداری اور اُخوتِ اسلامی کا حقیقی مظہر ہوگا اور اس سے اسی ملک کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔

انقلاب ایران کے مثبت پہلوؤں میں حجاب کا اہتمام بھی ہے، ایران کو ایک زمانہ میں ایشیاء کا یورپ کہا جاتا تھا اور بے حیائی اپنی آخری حدود کو پار کر رہی تھی، مجھ سے بعض سنی علماء نے بتایا کہ اگر مزید چند سال انقلاب نہ آیا ہوتو تو ایران میں عورتوں کا بے لباس سڑک پر آ جانا بھی قابل تعجب امر نہیں ہوتا، موجودہ حکومت نے سختی کے ساتھ عورتوں پر پردہ کو لازم قرار دیا ہے، اثنا عشری فقہ میں چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے، اس لئے خواتین کرتہ اور پتلون پر ایک بڑا گون نصف پنڈلی تک پہنتی ہیں اور سر پر اسکارف باندھتی ہیں، اس کے بغیر باہر نہیں نکل سکتیں، لیکن اندورن حجاب مغربی لباس ہی استعمال کیا جاتا ہے، یہ صورت حال پھر بھی سعودی عرب کے علاوہ دوسرے عرب اور خلیجی ملکوں کے مقابلہ میں غنیمت ہے۔

البتہ اس صورتِ حال سے افسوس ہوا کہ نمازوں کا اہتمام اب بھی عام ایرانیوں میں بہت کم ہے، مسجدیں عام طور پر چھوٹی چھوٹی ہیں، ان کی تعداد بھی کم ہے، عام طور پر مسجدوں پر مینارے نہیں ہیں، اس لئے شناخت میں بھی دقت ہوتی ہے، تہران جیسے شہر میں کان اذان کی آواز کو ترستے ہیں، ایک تو اہل تشیع کے یہاں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کے اجتماع کی وجہ سے نمازیں تین ہی وقت پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کا بھی اہتمام نہیں ہے، بعض حضرات سے معلوم ہوا کہ کہیں کہیں مؤذن کے بجائے اذان کا ٹیپ ریکارڈ بجانے پر بھی اکتفاء کیا جاتا ہے، خود تہران میں جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے وہ تہران شہر کے لحاظ سے ناکافی ترین جگہ ہے، اسی لئے بہ مقابلہ مسجدوں کے، مزارات کی رونق بہت زیادہ ہے، حالاں کہ حکومت لوگوں کو اس جانب متوجہ کرتی ہے، مختلف مقامات پر نماز کے لئے تاکیدیں لکھی ہوئی تھیں، خاص طور پر علامہ خمینی کا یہ ملفوظ کہ ''نماز ہی تمام نیکیوں کی کلید ہے'' اور یہ کہ ''نماز وقت پر ادا کریں، نہ وقت سے پہلے اور نہ وقت کے بعد'' بینر پر جگہ جگہ آویزاں کیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ عام لوگوں میں نماز سے بے رغبتی کی کیفیت ہے، اس صورتِ حال کو دیکھ کر روافض کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کی بات یاد آتی ہے کہ ''مساجدهم مهجورة ومقابرهم معمورة ''—

حکومت کو اس طرف مزید توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ایران اور افغانستان ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں، دونوں جگہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں، لیکن افغانستان کی حکومت زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، اس میں زیادہ دخل تو امریکہ اور مغربی طاقتوں کی ظلم وزیادتی کا ہے، مگر اس کے پیچھے کچھ اور اسباب بھی ہیں، جن کے تجزیہ کی ضرورت ہے، ان میں ایک بات یہ ہے کہ ایران نے اسلامی نظام کے دائرہ میں رہتے ہوئے جمہوری نظام قائم کیا ہے، باضابطہ الیکشن ہوتا ہے، امیدوار اپنا نام پیش کرتے ہیں، حکومت ان کے سابق اخلاقی رکارڈ کا پولیس اور عدالت کے ذریعہ جائزہ لیتی ہے، جو لوگ کسی جرم میں ملوث رہے ہوں، انھیں نا اہل قرار دیتی ہے، پھر بقیہ اُمیدوار الیکشن میں حصہ لیتے ہیں اور منتخب اُمیدواروں کے ذریعہ حکومت بنتی ہے، اس جمہوری نظام کی وجہ سے لوگ حکومت کو ڈکٹیٹر شپ خیال نہیں کرتے ہیں، افغانستان میں طالبان نے کوئی ایسا انتخابی نظام وضع نہیں کیا اور اسی کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں ایک آمرانہ حکومت کی حیثیت سے اس کی شبیہ بننے لگی۔

دوسرے ایران میں مختلف نسلی، اعتقادی گروہوں کو بھی ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی گئی ہے، حکومت میں ہر علاقہ کی نمائندگی ہے یہاں تک کہ اہل سنت کے بھی تقریباً انیس بیس ارکان پارلیمنٹ ہوتے ہیں اور ایک سنی رکن اُمور اہل سنت میں صدر مملکت کا مشیر ہوتا ہے، جسے وزیر کا درجہ حاصل ہوتا ہے، طالبان یہ نہیں کر سکے کہ ازبک، تاجک اور شیعہ گروہوں کو اپنی اقتدار میں شریک کرتے، تاکہ ان کی حکومت تمام نسلی اور مذہبی اکائیوں کے لئے قابل قبول ہوتی، اس کی وجہ سے فاصلے بڑھتے گئے اور نفرت کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں۔

تیسرے یہ تو ٹھیک ہے کہ ایک مذہبی حکومت کی زمام مذہب سے واقف عالم دین کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے، لیکن بین الاقوامی تعلقات وضروریات کے پس منظر میں حکومت کو چلانے کے لئے علوم جدیدہ کے ماہرین کی بھی ضرورت ہے، حکومت ایران نے انقلاب کے بعد عصری تعلیم کی درسگاہوں کو برقرار رکھتے ہوئے، اس کے نظام اور ماحول میں ضروری

تبدیلیاں کیں، حکومت میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو شامل کیا، اسی لئے ان کے یہاں ماہرین کا کوئی خلاء پیدا نہیں ہوا، لیکن طالبان یہ نہیں کر سکے۔

چوتھے ایران میں اسلامی نظام تدریج وحکمت کے ساتھ نافذ کیا گیا، لڑکیوں کی تعلیم گاہیں باقی رکھی گئیں، بہت سی ملازمتیں خواتین کے لئے محفوظ کی گئیں، نوجوانوں میں اندر کے جذبات اُبھارے گئے اور انھیں داڑھی رکھنے کی ترغیب دی گئی، داڑھی رکھنے پر مجبور نہیں کیا گیا، جدید ذرائع ابلاغ کے نظام کو قائم رکھتے ہوئے، اس کے ڈھانچے میں تبدیلی لائی گئی، پڑوسی ملکوں سے تعلقات کو بہتر بنانے پر توجہ دی گئی، جب کہ افغانستان میں کسی قدر عجلت اور بے اعتدالی کی راہ اختیار کی گئی، مثلاً لڑکیوں کی تعلیم یکسر روک دی گئی، ایک ایسا ملک جس میں لاکھوں عورتیں بیوہ ہیں، تمام خواتین کو بیک قلم ملازمت سے دستکش کر دینا، عصری درسگاہوں کے بجائے ہر جگہ، صرف دینی تعلیم پر اکتفاء کرنا یہ وہ اُمور ہیں جو یقیناً نیک نیتی کے ساتھ انجام دیئے گئے ہیں، لیکن شاید حکمت ومصلحت کے پہلو کو اس میں کم ملحوظ رکھا گیا ہے، بہرحال ''ایران'' اختلاف فکر ونظر کے باوجود اسلام کے دائرہ میں جمہوری نظام اور حکمت وتدریج کے ساتھ قانون شریعت کے نفاذ کی ایک اچھی مثال ہے۔

ایران کی یہ بات قابل تحسین ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی واضح اور متعین ہے، جس کی بنیاد اسرائیل کے ناجائز قبضہ اور امریکہ کے استعماری ذہن کی مخالفت پر ہے، لبنان سے اسرائیل کو نکالنے میں ایران کا نمایاں حصہ ہے، کیوں کہ ایران کی تائید سے قائم شدہ 'حزب اللہ' تحریک ہی نے اسرائیل کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا تھا، صدام نے ایران پر کسی معقول وجہ کے بغیر حملہ کیا اور تقریباً ایک لاکھ ایرانیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا، اس لئے ایران کے تعلقات صدام سے اچھے نہیں تھے، مگر اس کے باوجود جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو ایران نے کھل کر مخالفت کی اور اپنی زمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی، اسی طرح طالبان سے ایران کے تعلقات اچھے نہیں تھے، لیکن ایران نے وہاں بھی امریکی مداخلت کی مخالفت کی

اورافغانستان کے خلاف اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی، اس کے برخلاف اکثر عرب اور مسلم ممالک کا رویہ گومگو کا رہا اور انھوں نے امریکہ کو مسلم ملک پر حملہ کرنے کے لئے اپنی سرزمین بھی فراہم کردی، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اور عرب ملکوں میں کسی سربراہ سے امریکہ کا نچلے درجہ کا عہدیدار بھی بات کرلے، تو لوگ اسے اپنے لئے ایک اعزاز تصور کرتے ہیں، لیکن ایران کا معاملہ اس کے برعکس ہے، انھوں نے عوام کا اور حکمرانوں کا ایسا ذہن بنادیا ہے کہ وہ امریکہ سے تعلقات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے اور انھوں نے اس کے متبادل کے طور پر روس اور چین سے اپنے تعلقات اُستوار کئے ہیں۔

گو ایران کو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑ رہی ہے، امریکی تحدیدات اور پھر اس کی طرف سے مسلط ہونے والی آٹھ سالہ جنگ کی وجہ سے ایران کی کرنسی کی قیمت بہت گر گئی ہے، ایک ڈالر آٹھ سو ایرانی ریال کے برابر ہے، صرف ناشتہ پینتالس، پچاس ہزار ریال کا ہوجاتا ہے، لیکن ان سب کو برداشت کرتے ہوئے ایران اپنے موقف پر اٹل ہے، ویسے وہاں لوگوں کی فی کس آمدنی ابھی بھی ہندو پاک وغیرہ سے زیادہ ہے اور عام طور پر خوش حالی محسوس ہوتی ہے، —— موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اب یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ مسلم ممالک کے لئے اپنی سالمیت کی حفاظت اور مغربی استعماریت سے مقابلہ کی اس کے سواء اور کوئی راہ نہیں ہے کہ یہ اپنا ایک معاشی اور دفاعی بلاک قائم کریں، مشترکہ تدبیروں کے ذریعہ صلیبی جنگ سے نبرد آزما ہوں، اقتدار میں عوام کو شریک کریں اور اپنے باہمی اختلافات میں مسامحت اور صرف نظر سے کام لیں، کاش! عالم اسلام اس حقیقت کو محسوس کرے اور مغرب کے خوف کے بجائے خدا ترسی کی راہ اختیار کرے! کہ جو خدا سے ڈرتا ہے، سارا عالم اس سے ڈرتا ہے اور جو خدا سے نہیں ڈرتا، اسے سارے عالم سے ڈرنا پڑتا ہے۔

❑ ❑ ❑ ❑

قطر میں تین روز

خلیج کا ایک چھوٹا سا ملک جو معاشی اور دفاعی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، ''قطر'' ہے، یہ تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اور ایک طرف خشکی کی سرحدیں ہے، جو سعودی عرب اور عرب امارات سے ملتی ہیں، اس ملک کی راجدھانی دوحہ ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک شہر کچھ چھوٹے چھوٹے قصبات کے ساتھ پورا ملک ہے، چند ماہ پہلے دوحہ میں ایشیاڈ میچ ہوا تھا، اس میچ نے پوری دنیا میں اس ملک کی شہرت پہنچادی تھی، امریکہ کی سب سے بڑی فوجی تنصیب اسی ملک میں ہے، جو عالم اسلام اور بالخصوص متمول خلیجی ملکوں پر ایک لٹکتی ہوئی تلوار ہے۔

قطر کی تاریخ بہت قدیم ہے، ڈنمارک، برطانیہ اور فرانس کے آثارِ قدیمہ کی ٹیموں نے کھدائی میں ملنے والے آثار کے ذریعہ اندازہ لگایا ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح سے یہ جزیرہ نما آباد رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہی اسلام اس جزیرہ میں داخل ہو گیا تھا، یہ جزیرہ نما عرب کے اس قبیلہ کے زیر حکومت تھا، جس کے سردار منذر بن ساوی تمیمی تھے، انھوں نے اسلام کی دعوت قبول فرمائی تھی، اور اسی وقت سے یہ علاقہ اسلام سے سرفراز ہوا، اس وقت سے برابر خلافت کے زیر سایہ اس دیار کے لوگ زندگی گذارتے رہے، سولھویں صدی عیسوی میں جب اس جزیرہ نما پر پرتگالیوں کی نظر بد پڑنے لگی تو اہل قطر نے ترکوں کے ساتھ مل کر پرتگالیوں کا مقابلہ کیا اور خلافت عثمانیہ کے زیر اثر آ گیا، پھر ۱۹۱۳ء میں یہ علاقہ خلافت عثمانیہ سے آزاد ہو گیا اور برطانیہ کے زیر اثر آ گیا، یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں برطانیہ نے یہاں سے رختِ سفر باندھا اور ۱۹۷۱ء میں اس علاقہ نے ایک مستقل ریاست کی صورت اختیار کی

اورعرب امارات کا حصہ ہوگیا، جونو ریاستوں پر مشتمل تھا، اور قطر اور بحرین کے الگ ہونے کے بعد اب سات ریاستیں اس میں باقی رہ گئی ہیں، ۱۹۳۵ء ہی میں جغرافیائی سروے نے یہ بات ظاہر کردی تھی کہ قطر کے مغربی ساحلی پر پٹرول موجود ہے، اور ۱۹۴۰ء سے باضابطہ پٹرول نکلنا شروع ہوگیا، اور وہ ملک جس کا گذر بسر کپڑوں کی دستی بناوٹ، نیزہ سازی اور سمندر سے موتیوں کی تلاش پر تھا، نے ایسی اقتصادی جست لگائی کہ اب اس وقت وہ معاشی اعتبار سے دنیا کے نہایت اہم ملکوں میں ہے اور اندازہ کیا جارہا ہے کہ چند سال میں وہ فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا میں سب سے زیادہ آمدنی والا ملک بن جائے گا، یہ ملک عرصہ تک انگریزوں کے زیر اثر نیم خودمختار رہا، اٹھارہویں صدی عیسوی میں شیخ ثانی بن محمد جو قبیلۂ بنوتمیم کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے، یہاں وارد ہوئے اور انھوں نے ایک باضابطہ حکومت کی بنیاد رکھی، پھر شیخ محمد بن ثانی ۱۸۵۰ء میں حکمراں ہوئے، جب ہی سے یہ خاندان اس چھوٹے سے ملک پر حکومت کررہا ہے اور 'آل ثانی' کہلاتا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ اس ملک میں ایک سے زیادہ بار باپ کو معزول کرکے بیٹے کے حکمران بننے کا واقعہ پیش آیا ہے، موجودہ بادشاہ شیخ حمد بن خلیفہ آل ثانی ۱۹۹۵ء میں اپنے والد شیخ خلیفہ بن حمد کو معزول کرکے حکمران بنے، اس وقت ان کے والد چھٹی گذارنے فرانس گئے ہوئے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کے والد بہ مقابلہ ان کے زیادہ دیندار اور رعایا پرور تھے، یہاں بادشاہ کو امیر کہا جاتا ہے، یہ پورا ملک تقریباً دوسو میل پر مشتمل ہے۔

چھوٹا سا ملک ہونے کے باوجود کانفرنسوں اور سیمیناروں کے انعقاد کی نسبت سے اس ملک کو خاصی شہرت حاصل ہے، چنانچہ مورخہ ۲۰ تا ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء قطر کی راجدھانی دوحہ میں ''حوار بین المذاہب الاسلامیہ'' (اسلامی مذاہب کے درمیان مکالمہ) کے عنوان سے ایک عالمی کانفرنس منعقد ہورہی تھی، اس کانفرنس میں شرکت کے لئے اس حقیر کے پاس بھی دعوت نامہ آیا، اور قطر کے سفارت خانہ دہلی سے فون بھی موصول ہوا، اس کانفرنس کا مقصد موجودہ عالمی حالات بالخصوص عراق کی صورت حال کے پس منظر میں مختلف مسلمان فرقوں کے درمیان

اتحاد کا راستہ تلاش کرنا تھا، موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اور قطر میں بعض احباب اور اہل تعلق کی موجودگی کی نسبت سے اس حقیر نے دعوت قبول کرلی، چنانچہ ۱۹ جنوری کو حیدرآباد سے قطر ایئر لائنس کے ذریعہ روانہ ہوا، غالباً چار گھنٹے میں ہم لوگ دوحہ پہنچ گئے، جہاں جمعہ کی اذان ہورہی تھی، جیسے ہی جہاز سے اترے، ایئرپورٹ کی دو خاتون عملہ میرے نام کی تختی لے کر کھڑی تھیں، میں نے اپنا تعارف کرایا، حیرت ہے کہ یہ لڑکیاں عربی زبان سے بالکل واقف نہیں تھیں، زبان انگریزی اور لباس مغربی، انھوں نے مجھے انتظارگاہ میں بٹھایا، میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ لے کر امیگریشن کی کاروائی کرنے اور سامان لانے چلی گئیں اس دوران کانفرنس کے نمائندہ بھی آگئے، انھوں نے چائے وغیرہ کی پیشکش کی، لیکن میں نے معذرت کردی، میں جلد سے جلد باہر نکلنا چاہتا تھا تاکہ جمعہ کی نماز مل جائے، چنانچہ باہر آیا، یہ تینوں مجھے ساتھ لے کر ایرپورٹ سے آئے، اور قطر یونیورسٹی کی کار پر سوار کرایا، باہر نکلے تو مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبداللہ مبارک ندوی اور مولانا عطاء الرحمٰن ندوی سراپا انتظار تھے، وطن سے دور ان اہل وطن مخلصین کی ملاقات نے بہت شادکام کیا اور اجنبیت کا احساس جاتا رہا، میں ایک کار میں بیٹھا، اسی میں کانفرنس کے نمائندہ بھی ساتھ آئے، دوسری کار میں یہ حضرات آئے، بیس پچیس منٹ میں ہم شیرٹن ہوٹل پہنچائے گئے، اور رسمی کاروائی کے بعد کمرہ لے جایا گیا۔

اس دوڑ بھاگ میں اتنا وقت چلا گیا کہ نماز جمعہ نہیں ہوسکی، یہاں ایک نظام یہ ہے کہ تمام مسجدوں میں ایک ہی وقت اذان ہوتی ہے اور ایک ہی وقت جماعت، اس لئے اگر ایک مسجد میں جماعت چھوٹ گئی تو کہیں اور جماعت نہیں مل سکتی، سنا ہے کہ شروع میں تو یہ نظم کیا گیا تھا کہ کسی ایک بڑی مسجد میں اذان ہو، اور تمام مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر سے وہی اذان نشر کردی جائے، لیکن اس پر وہاں کے بعض با اثر علماء اور اہل افتاء کی طرف سے اعتراض ہوا تو حکومت نے یہ ارادہ ترک کردیا، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں جو پانچ، دس منٹ کے فرق سے مختلف مسجدوں میں نمازیں ہوا کرتی ہیں، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی شخص ایک جگہ جماعت نہیں

پائے تو دوسری جگہ جماعت کو پاسکتا ہے، کتبِ حدیث میں تحویل قبلہ کا جو واقعہ منقول ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں بھی باوجود چھوٹی سی آبادی ہونے کے مختلف مسجدوں میں اذان اور جماعت کے اوقات الگ الگ ہوتے تھے، بہر حال ہوٹل میں ہی نمازِ ظہر ادا کی گئی۔

یہ بہت ہی خوبصورت فائیو اسٹار ہوٹل ہے، جو پندرہ سولہ منزلوں پر مشتمل ہے اندر اور باہر سے نہایت آراستہ اور خوبصورت ہے ہوٹل کے اندرونی صحن میں شیشہ کی بڑی بڑی خوبصورت چھتریاں بنادی گئی ہیں، جن کے نیچے کھانے کے میزیں ہیں، یہاں شرکاء کی مناسبت سے نغمہ وموسیقی کی بزمیں بھی آراستہ ہوتی ہیں، نیچے سے اوپر کا سفر طے کرنے کے لئے کئی لفٹیں ہیں اور ہر لفٹ کا کیبل نما گلاس ہے، جس سے ماحول کا حسن دوبالا ہو گیا ہے، پھر پانی کے فوارے اور نور ونکہت کی فراوانی ہوٹل کے اندرونی ماحول کو خاص رنگ عطا کرتی ہے، ہوٹل کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کی دونوں سمتیں سمندر کے کنارے ہیں، جب آپ ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھیں تو سامنے سمندر کی موجیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں، گویا وہ آپ کی قدم بوسی کے لئے بے قرار ہیں، یہ خوش منظر ہوٹل جس علاقہ میں واقع ہے وہ یہاں کا اہم ترین علاقہ ہے، قرب وجوار میں عمارتوں کے خوبصورت فلک بوس ٹاور ہیں اور ہر ٹاور طرزِ تعمیر کے اعتبار سے ایک انفرادیت کا حامل ہے، اسی لئے اس علاقہ کو ''منطقہ الابراج'' (ٹاوروں کا علاقہ) کہا جاتا ہے۔

یہ تینوں ندوی احباب شام تک میرے ساتھ ہی رہے، مولانا رحمت اللہ ندوی میرے مخلص دوست جناب حافظ محمد ناظم صاحب کے صاحبزادے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری کے برادرزادہ ہیں، اللہ نے بڑی لیاقت اور سعادت مندی سے نوازا ہے، ندوہ کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت حاصل کی، اُردو خوب لکھتے ہیں اور عربی خوب تر، علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت عائشہؓ اور خطباتِ مدراس کا عربی ترجمہ ان کے قلم سے بیروت

سے شائع ہو چکا ہے اور اس نے اہل علم کے درمیان پذیرائی حاصل کی ہے، ابھی ان کی ایک کتاب حضرت تھانویؒ کے تذکرہ پر عربی میں شائع ہوئی ہے، یہ آپؒ کی بھرپور، جامع اور ضخیم سوانح ہے اور غالباً عربی میں پہلی دفعہ باضابطہ آپ کی شخصیت پر کتاب شائع ہوئی ہے، فی الحال قطر کے ایک عالم شیخ عبداللہ آل محمود کی بعض کتابوں پر تحقیق و تعلیق کا کام کر رہے ہیں، اور امام غزالیؒ کی ''الوجیز'' کی تحقیق و تعلیق میں معروف عالم اور فقیہ ڈاکٹر قرہ داغی کے معاون ہیں، یہ پورے سفر میں ساتھ رہے اور ان کی وجہ سے اجنبیت کا احساس نہیں رہا۔

مولانا عبداللہ مبارک ندوی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری کے صاحبزادے ہیں، صلاحیت میں بھی اور خاص کر صالحیت میں اپنے والد ماجد کے وارث ہیں، اُردو میں ان کی کئی کتابیں طبع ہو چکی ہیں، معارف القرآن سے بھی جواہر ریزے جمع کئے ہیں، جو 'نقوش معارف' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، یہ دوحہ سے کچھ فاصلہ پر ایک مسجد کے امام ہیں، میرے تین روزہ قیام کے درمیان کچھ وقفہ کو چھوڑ کر ساتھ ہی رہے، مولانا عطاء الرحمٰن ندوی کا تعلق ممبئی سے ہے، یہ مولانا ظل الرحمٰن صدیقی سابق صدر جمیعۃ علماء مہاراشٹر کے صاحبزادے ہیں، یہ اپنے والد ماجد ہی کی طرح خلیق، ملنسار اور مخلص ہیں، یہ اور مولانا رحمت اللہ ندوی شعبۂ دفاع میں ملازم ہیں۔

دوحہ کی ایک بڑی مسجد 'مسجد امام بخاری' ہے، مسجدوں کا تعمیری ذوق یہاں بھی بہت کچھ سعودی عرب سے ملتا ہوا ہے، مسجد کے اندر بھی راحت بخش اور پرسکون ماحول ہے، یہ مسجد مصروف بازار کے علاقہ میں ہے اور یوں تو برصغیر کے لوگ یہاں ہر جگہ نظر آتے ہیں؛ کیوں کہ بیرونی کارکنوں کی تعداد مقامی لوگوں سے زیادہ ہے، لیکن خاص کر اس علاقہ میں ہندو پاک اور نیپال کے لوگ بڑی تعداد میں ہیں، عشاء کے بعد احباب نے اسی مسجد میں اس حقیر کا خطاب رکھا تھا، اور عنوان تھا ''قرآن مجید اور ہماری زندگی'' چنانچہ عشاء کے بعد تلاوت ہوئی، مولانا عطاء الرحمٰن صاحب نے اس حقیر کا تعارف کرایا، اور اپنے حسن ظن کے تحت خاصے مبالغہ

کے ساتھ، اس کے بعد قریب ڈیڑھ گھنٹہ اس حقیر کا خطاب ہوا، میں نے اپنے خطاب میں حاضرین کو ان کی ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جو ان کے وطن اور ملکوں کی دینی حالت سے متعلق ہیں، خاص کر نظام مکاتب کو پھیلانے پر زور دیا، نیز ان غیر مسلم بھائیوں میں دعوت کا کام کرنے پر ترغیب دی جو مختلف ملکوں سے اس دیار میں آئے ہوئے ہیں، خطاب کے بعد بیس منٹ تک سوال و جواب رکھا گیا، حاضرین نے کچھ فقہی سوالات کئے، کچھ مسلم پرسنل لاء بورڈ سے متعلق اور کچھ سیاسی حالات کے بارے میں، اس حقیر نے زیادہ تر سوالات کے جواب دیئے اور بعض سے پہلو تہی مناسب سمجھی، یہیں مولانا عبدالحی ندوی، مولانا عبدالغفار بلوچستانی اور متعدد احباب سے ملاقات ہوئی، اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا ہم ہندوستان میں ہیں، پروگرام کے بعد مولانا رحمت اللہ ندوی کے یہاں عشائیہ کا نظم تھا، ان کے دولت خانہ پر حاضری ہوئی، ہند و پاک کے کئی علماء دسترخوان پر جمع ہوئے اور کھانے کے بعد بھی دیر تک تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہا اور رات گئے ہوٹل کو واپسی ہوئی۔

اگلے دن ۲۰ جنوری سے کانفرنس کا آغاز تھا، صبح ۱۰ بجے سے افتتاحی اجلاس شروع ہوا، شیخ عبداللہ بن حمد العطیۃ نائب وزیر اعظم دوم نے افتتاحی کلمات کہے، انھوں نے زور دیا کہ موجودہ حالات میں مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان قربت ضروری ہے، یہ تو ممکن نہیں ہے کہ تمام مکاتب فکر ایک ہو جائیں، لیکن ان میں قربت پیدا کی جا سکتی ہے، ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق وزیر اوقاف مصر نے اپنے فاضلانہ خطاب میں بتایا کہ اختلاف دراصل فکر کا تنوع ہے اور جہاں اتحاد کی گنجائش ہوگی وہاں اختلافِ افکار کا پیدا ہونا فطری بات ہے، شیخ احمد خلیلی مفتی سلطنت عمان نے زبانی خطاب کیا، انھوں نے کہا کہ یہ اُمت دنیا کی قیادت کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ اطاعت کے لئے، انھوں نے توجہ دلائی کہ اختلاف رائے دراصل تکامل کا عمل ہے، یعنی اس سے ایک دوسرے کے افکار کی تکمیل ہوتی ہے، پھر آیت اللہ محمد علی تسخیری جنرل سکریٹری مجمع التقریب بین المذاہب الاسلامیہ (ایران) نے خطاب کیا؛ چوں کہ یہ کانفرنس جامعہ ازہر مصر،

قطر یونیورسٹی اور مجمع التقریب ایران کے اشتراک سے منعقد ہوئی تھی؛ اس لئے شیخ تسخیری کی حیثیت اس پروگرام کے میزبان کی بھی تھی، انھوں نے اس حیثیت سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا، عالم اسلام پر امریکہ اور یورپ کی یلغار کے پس منظر میں انھوں نے وہ آیت پڑھی :

ان النـاس قد جمعوا لكم فاخشوهم فزادهم ايمانا وقالوا حسبنا الله ونعم الوكيل . (آل عمران:۱۷۳)

(منافقین کہتے ہیں کہ) لوگ تمہارے مقابلہ میں اکٹھا ہیں، ان سے ڈرو، یہ بات ان کے ایمان میں اور اضافہ ہی کردیتی ہے، وہ کہتے ہیں، ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

—— اور استقامت کی تلقین کی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ حقیقی دشمن 'اسرائیل' کی طرف سے عربوں کی توجہ کو ہٹانے کے لئے وہمی دشمن 'ایران' کا خوف دلا رہا ہے، ان کا خیال تھا کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اختلاف اجتہادی نوعیت کا ہے، انھوں نے اپنے خطاب کے اخیر میں حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کی نصیحت کا بھی ذکر کیا، جو وحدتِ اُمت سے متعلق تھی۔

شیخ تسخیری کے بعد (O.I.C) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلو کا خطاب ہوا، انھوں نے اپنے خطاب میں خاص طور پر اس مکہ اعلامیہ کا ذکر کیا جس پر سنی اور شیعہ علماء نے دستخط کئے تھے، اس نشست کا آخری خطاب ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی کا ہوا، ان کا خطاب نہایت ہی رواں، مؤثر، ولولہ انگیز اور پُر جوش تھا، انھوں نے اپنا خطاب اس بات سے شروع کیا کہ اب تک یہاں یہودی —— اسلامی، مسیحی —— اسلامی مکالمات منعقد ہوتے رہے، لیکن آج یہ 'اسلامی اور اسلامی، مکالمہ ہے، پھر انھوں نے کانفرنس کے عنوان پر تقریر کی، کہ مذاہبِ اسلامیہ سے تو مذاہب فقہیہ کی طرف ذہن جاتا ہے، جیسے حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، وغیرہ، حقیقت میں اس کا موضوع فرقِ اسلامیہ کے درمیان تقریب ہونا چاہئے تھا، پھر انھوں نے کہا

کہ میں آج اس کانفرنس کی نسبت سے ڈھکی چھپی بات کرنے کے بجائے کھلے الفاظ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، انھوں نے عراق کے موجودہ حالات کے پس منظر میں کہا کہ عالم اسلام میں اہل سنت اکثریت میں ہیں، اور اہل تشیع اقلیت میں، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان ملکوں میں سنی اکثریت کے درمیان شیعہ امن وراحت کی زندگی گذار رہے ہیں، وہ بہترین معاشی حالت میں ہیں، حکومت کے اونچے عہدوں پر ہیں، تعلیم میں بھی پیچھے نہیں ہیں، لیکن شیعہ آبادی میں سنی مقہوریت کی زندگی گذار رہے ہیں، جس کی مثال اس وقت عراق کی حالت ہے!

آپ نے کہا کہ اُمت عام ہے اور ہر فرقہ اُمت کا جز ہے اور موجودہ حالات میں جب کہ ہم عسکری، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی جنگ سے دوچار ہیں، ہمارے لئے وحدت اُمت ایک مذہبی فریضہ ہے، ایسا فریضہ جو احکام دین کے تحت بھی واجب ہے اور تقاضۂ احوال کے تحت بھی، آپ نے کہا: تقریب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع فکری اعتبار سے ایک دوسرے میں ضم ہوجائیں، یا کوئی فرقہ عقیدہ سے دستبردار ہوجائے؛ کیوں کہ یہ ناقابل عمل بات ہے، قابل عمل بات یہ ہے کہ دونوں حلقوں کے غالی اور انتہاء پسندوں کو الگ کردیا جائے، شیخ نے واضح طور پر ایران کا نام لیتے ہوئے کہا کہ ایران چاہے تو عراق میں نفرت کی آگ بجھا سکتا ہے اور اس وقت عراق میں جو قتل وخون ہورہا ہے، ایران اس کے لئے جوابدہ ہے، ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر فتنۂ عراق کے مقابلہ میں کھڑے ہوجائیں، شیخ نے بہت درد بھرے لہجہ میں کہا کہ ایران میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہا جاتا ہے، حالاں کہ قرآن مجید نے جو مومنوں کے درمیان اُلفت کی بات کہی ہے، الّف بین قلوبھم (انفال: ۶۳) اور مؤمنوں کے جو اوصاف بیان کئے ہیں، ان سب کے مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تھے، کون ہیں جنھوں نے اسلام کو مصر و ایران تک پہنچایا؟ کن کے ذریعہ اسلام شام، فلسطین اور روم تک پہنچا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعہ! ان محسنین اُمت کو برا بھلا کہنے کا کوئی جواز ہوسکتا ہے؟ شیخ نے سوال کیا

کہ ہم کہیں ابوبکر، عمر، عثمان، عائشہ رضی اللہ عنہم اور آپ کہیں لعنهم الله تو کیسے ہم ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں؟ آپ نے کہا کہ اہل سنت اس کے برخلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی محبت رکھتے ہیں اور اہل بیت سے بھی، کوئی سنی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ حضرت علی اور حضرت فاطمۃ الزہراء، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں بدکلامی کرے، کیوں کہ ہماری محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ہے، اس لئے اہل بیت ہوں یا صحابہ، دونوں سے ہم محبت کا تعلق رکھتے ہیں، شیخ نے تحریف قرآن کا بھی مسئلہ اٹھایا، اور کہا کہ قرآن اتحاد کی بنیاد ہے، جو اہل سنت اہل شیعہ کی تکفیر کرتے ہیں، وہ اسی لئے کہ بعض لوگ قرآن مجید کو محرّف مانتے ہیں۔

ایران کا بہت بڑا وفد کانفرنس میں شریک تھا، شیخ کا یہ خطاب ان پر اتنا بھاری پڑا کہ کانفرنس کے اختتام تک وہ معذرت ہی کرتے رہے، ڈاکٹر قرضاوی کے خطاب کے بعد شیخ تسخیری نے وضاحت کی کہ سنی اور شیعہ کا خون ایک ہی ہے، یہ سب اہل ایمان کا خون ہے اور مذاہب کے درمیان قربت کا مطلب ان کا انضمام نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ ہم مشترکہ اُمور پر ایک ساتھ مل کر کوشش کریں؛ کیوں کہ ۹۵ فیصد مسائل متفق علیہ ہیں اور پانچ فیصد مختلف فیہ، انھوں نے کہا کہ ہم سبّ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قائل نہیں ہیں، ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے امام زین العابدینؒ کا ایک مقولہ بھی نقل کیا، انھوں نے یہ بات بھی زور دے کر کہی کہ ہم قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہرگز نہیں اور امام طوسی سے لے کر آج تک تمام علماء شیعہ کا یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے، انھوں نے پھر اس بات کو دہرایا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ حقیقی دشمن کی جگہ وہمی دشمن ایران کو رکھ دے، بہر حال اسی گرما گرمی پر یہ نشست ختم ہوئی، —— اس نشست کے بعد اختتامی نشست کو لے کر آٹھ نشستیں ہوئیں، ڈاکٹر علی جمعہ محمد مفتی عام مصر، ڈاکٹر شیخ توماش مسکفیتش، مفتی پولینڈ، ڈاکٹر عبد السلام العبادی سابق وزیر اوقاف اُردن، ڈاکٹر وہبہ زحیلی سابق ڈین کلیۃ الشریعہ شام، شیخ مصطفیٰ تسیر تیش مفتی اعظم بوسنیا، ڈاکٹر عبد العزیز

تویجری جنرل سکریٹری المنظمۃ الاسلامیۃ للتربیۃ والعلوم والثقافہ (السعودیہ)، ڈاکٹر عبداللطیف آل محمود استاذ دراسات اسلامیہ بحرین، نے مختلف نشستوں کی صدارت کی، یہ اجلاس صبح دس بجے سے شب کے نو بجے تک کھانے اور نماز کے معمولی وقفہ کے ساتھ جاری رہا۔

اختتامی اجلاس ۲۲ جنوری صبح ساڑھے نو بجے شروع ہوا، آج کے اجلاس کی صدارت آیت اللہ شیخ محمد علی تسخیری نے کی، اور نظامت ڈاکٹر عائشہ یوسف منائی ڈین کلیۃ الشریعہ قطر نے، چوں کہ اسی اجلاس میں تجاویز بھی پاس ہونی تھیں، اس لئے دو ہی مقررین رکھے گئے تھے، اس نشست میں ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی استاذ کلیۃ الشریعہ، قطر یونیورسٹی نے فاضلانہ خطبہ پیش کیا اور اقلیتی فرقہ کے مسائل کو خاص طور پر واضح کیا، اسی نشست میں ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی اپنی تحریر پیش کی، پھر مختلف لوگوں نے تجاویز پیش کرنے میں حصہ لیا، مشہور مفسر قرآن شیخ محمد علی الصابونی نے کہا کہ امہات المؤمنین پوری اُمت کی ماں ہیں اور میں نے مصر میں بعض شیعوں سے اپنے کانوں سے ان کی شان میں سب وشتم کرتے ہوئے سنا ہے، ایسی باتیں قطعاً ناقابل برداشت ہیں، اس طرح کی گفتگو شیعہ سنی اختلاف کے پس منظر میں کئی لوگوں نے اپنے تجربات اور مطالعہ کے حوالہ سے کہی، کانفرنس میں مدعوئین کی تعداد ۲۱۳ تھی، جن میں سے تقریباً دوسو نمائندے شریک ہوئے، جو ۴۴ ملکوں اور امریکہ کے علاوہ تمام براعظموں سے تعلق رکھتے تھے، اور مسلکی اعتبار سے اہل سنت، شیعہ، زیدیہ اور اباضیہ فرقوں کی نمائندگی تھی، مصر، ایران، انڈونیشیا اور سوڈان سے مدعوئین کی تعداد زیادہ تھی، ہندوستان سے ڈاکٹر زاہد علی خان (علی گڑھ) کشمیر سے یو این آئی کے نمائندہ اور یہ حقیر شریک تھے۔

راقم الحروف کا مقالہ اسلامی فرقوں کو قریب کرنے میں علماء کے اہم کردار کے عنوان سے تھا، میں نے اس میں کچھ بنیادی اُمور اُٹھائے تھے، کہ تکفیر میں احتیاط کی جائے، اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے، جو اُمور حکام سے متعلق ہیں، عوام کو تلقین کی

جائے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں، جن مسلمان ملکوں میں حکمراں راہِ راست پر نہیں ہیں، ان کے خلاف پر تشدد احتجاج نہ کیا جائے، انس ومحبت کے ساتھ اصلاح کی کوشش کی جائے، تا کہ اُمت کو اختلاف وانتشار سے بچایا جاسکے۔

کانفرنس کے اختتام پر اعلامیہ جاری ہوا جو دس نکات پر مشتمل ہے، اس اعلامیہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تمام مسلمانوں کا خون، ان کے مال اور ان کی عزت وآبرو قابل احترام ہے اور فرقہ وارانہ بنیاد پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں، ان کی مذمت کی گئی، نیز یہ بھی کہا کہ نفرت کی آگ کو کم کرنے کے لئے سنی اکثریت ممالک میں شیعہ اہل سنت کو شیعہ بنانے کی تبلیغی کوششیں نہ کریں اور ایسی ہی شیعہ، سنی اکثریت ممالک میں، ایک قرارداد یہ بھی پاس ہوئی، کہ یہاں شریک تمام سنی، شیعی، زیدی، اباضی، اہل بیت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کی کسی قسم کی گستاخی کو سختی سے رد کرتے ہیں اور تمام فرقوں کے علماء سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کی قابل احترام شخصیتوں کا احترام برقرار رکھیں، اس میں ایک دفعہ عالمی علمی اکیڈمی کی تشکیل سے متعلق بھی تھی، جس میں چاروں مکاتبِ فکر کے علماء شامل ہوں، خدا کرے یہ کانفرنس صرف قرارداد تک نہ رہ جائے، بلکہ واقعات کی دنیا میں بھی اس کے اثرات محسوس کئے جائیں۔

کانفرنس میں حاضرین کے وقت کو اتنا مشغول رکھا گیا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ قطر میں کہیں اور جایا نہیں جاسکتا تھا، اس لئے مجبوراً وقت کی چوری کرنی پڑی اور درمیان میں کچھ اور پروگراموں میں جانا ہوا، ۲۰ جنوری کو مغرب کی نماز پڑھ کر مولانا رحمت اللہ ندوی دوحہ کا حسن شبانہ دکھانے کے لئے نکلے، ہر طرف خوبصورت عمارتوں، صاف ستھری سڑکوں، اور اس پر دن کی طرح روشنی کی برسات واقعی دوحہ کو خوابوں کا شہر بنا دیتی ہے، ہوٹل سے قریب ہی دیوان امیری کی پرشکوہ عمارت واقع ہے، یہی بادشاہ کا ایوان اور وزارتوں کا سکریٹریٹ ہے، یہاں سے آگے بڑھ کر ہم لوگ دوحہ کے اس علاقہ میں پہنچے جو اصل پرانا شہر تھا، یہاں حکومت

نے آثارِ قدیمہ کو زندہ کرنے کی ایک عجیب کوشش کی ہے کہ تعمیرات تو بالکل نئی ہیں، لیکن ان کو پوری طرح قدیم طرز پر ڈیزائن کیا ہے، جنھیں دیکھ کر بہت ہی پرانی عمارت کا گمان ہوتا ہے، یہاں تک کہ بانس کی چھتیں اور ٹٹی کی دیواریں بھی نظر آتی ہیں، یہ علاقہ 'سوق ایران' کہلاتا ہے، یہ بہت بڑا بازار ہے، گلیوں کے دونوں طرف بہت سی دکانیں ہیں، جن میں قدیم طریقہ پر سامان رکھے ہوئے ہیں، اسی انداز کے چائے خانے ہیں، ان چائے خانوں میں بیٹھکیں بھی ہیں، یہیں ایک ایرانی کباب کی دکان بھی ہے، جو بہت مشہور ہے، اور لوگ دور دور سے کباب کا لطف اُٹھانے یہاں آتے ہیں، مجھے بھی گرم گرم کباب کھلایا گیا، واقعی بڑے مزے کے تھے، عشاء ہم لوگوں نے یہیں ادا کی، اس کے بعد مولانا عبدالغفار بلوچی کی دعوت پر ہم مکتبۃ الشیخ احمد بن حجر آئے، کتب خانہ، کانفرنس ہال اور شیخ کی مجلس دیکھی، یہ قطر کے بڑے عالم تھے، اور ان کا اثر ورسوخ بھی بہت تھا، یہ فقہ میں فقہ حنبلی کے مقلد تھے اور عقیدہ میں سلفیت کے قریب تھے، شیخ کی بہت سی تصنیفات ہیں، اور زیادہ تر ردبدعت کے موضوع پر ہیں، ان کے اس کتب خانہ میں بھی اسلامی علوم پر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے، شیخ کے صاحبزادے شیخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبداللہ محاکم شریعہ کے صدر رہ چکے ہیں، وہ اکیڈمی کے ایک سیمینار میں شریک ہوئے تھے، اور وہاں سے حیدر آباد بھی آئے تھے، اور معہد میں بھی تشریف لائے تھے، افسوس کہ قطر سے محاکم شرعیہ کا شعبہ ہی ختم کر دیا گیا، شیخ کے دوسرے صاحبزادے شیخ ڈاکٹر فیصل بن عبداللہ آل محمود ہیں، جو اس وقت قطر کی وزارت میں ہیں۔

اس وقت اس مکتبہ کے ذمہ دار شیخ کی وصیت کے مطابق مولانا عبدالغفار بلوچی ہیں، یہ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فارغ ہیں اور بڑے ہی مخلص، ملنسار اور قدر دان طبیعت کے مالک ہیں، وہ شیخ کی شخصیت پر ایک تذکرہ مرتب کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر تحفظ ختم نبوت کا خاص جذبہ ودیعت فرمایا ہے اور قادیانیت کے خلاف گویا شمشیر برہنہ ہیں، عالم عرب میں فتنۂ قادیانیت کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں، انھیں سے

معلوم ہوا کہ مصر، فلسطین، شام اور مختلف عرب ملکوں میں بھی قادیانی فتنہ جڑ پکڑنے کی کوشش کررہا ہے، اور مغربی حکومتیں اس کی پشت پر ہیں، قطر میں بھی قادیانیوں نے خفیہ اڈہ بنایا تھا، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، انھوں نے اس فتنہ کا تعاقب کیا اور اس خفیہ مرکز کو یہاں سے ختم کرایا، نیز شیخ عبداللہ آل محمود سے ردِ قادیانیت پر کتاب بھی لکھوائی اور اس کے لئے مطلوبہ مواد فراہم کیا، مولانا بلوچی کی مختصر ضیافت کے بعد ہم لوگ مولانا رحمت اللہ ندوی کے دولت خانہ پر وارد ہوئے، چوں کہ کانفرنس میں کھانے کا نظم زیادہ تر عرب اور افریقی بھائیوں کے ذوق کے مطابق تھا، اس لئے رائے ہوئی کہ یہیں کھانا کھایا جائے۔

۲۱ جنوری کو صبح کی نشست میں شریک ہونے کے بعد ہی ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکلے، اس موقع پر مولانا رحمت اللہ ندوی اور مولانا عبداللہ مبارک ندوی ساتھ تھے، ہم لوگ پہلے ساحل سمندر ہی پر بنے ہوئے ایک مختصر خوبصورت پارک پر پہنچے، یہاں ظہر کی نماز پڑھی گئی، اور نماز کے بعد کھانا کھایا گیا، آج کل خلیجی ممالک میں ساحل سمندر کو ''کورنش'' کہا جاتا ہے جو اصل میں فرانسیسی لفظ ہے، یہاں ایک قریہ تراثیہ بنایا گیا ہے، ''تراثیہ'' سے مراد ایسا گاؤں ہے جو قدیم روایت کا حامل ہو، چنانچہ یہاں نمائش کے لئے یہ گاؤں بنایا گیا ہے، جس میں کچے مکانات ہیں، پھوس کا چھپر ہے، لالٹینیں لگی ہوئی ہیں، عربوں کی قدیم انداز کی بیٹھکیں ہیں، معلوم ہوا کہ خاص خاص موقع سے یہ گاؤں آباد کئے جاتے ہیں، اور لوگ تفریحاً یہاں آتے ہیں۔

یہاں سے ہم لوگ قطر یونیورسٹی گئے جو دوحہ کے ایک کنارے واقع ہے، ایک خاص وضع کی عمارتیں ہیں، ابھی اس یونیورسٹی میں تعلیم کے شعبے محدود ہیں، کل چار پانچ کالجس ہیں، شریعہ اور قانون، انجینئرنگ، آداب اور اقتصاد سے متعلق کلیات ہیں، طلباء بھی کیمپس میں بہت کم ہیں، کیوں کہ قطر ایک چھوٹا سا ملک ہے، جو ہندوستان کے متوسط شہر کے درجہ کے برابر ہے اور تقریباً ہر طالب علم کے پاس گاڑی ہے، یونیورسٹی کے احاطہ میں ایک خوبصورت مسجد بھی

ہے اور اسی احاطہ میں 'مرکز الخدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویہ' نامی ایک دعوتی ادارہ ہے، جس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر یوسف قرضاوی ہیں، یہاں سے ہم لوگ المعہد الدینی گئے، یہ 'لقطہ' نامی محلّہ میں ہے، یہاں ثانویہ تک کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں زیادہ تر طلبہ تو قطر کے ہیں، لیکن ایک مناسب تعداد غیر ملکی طلبہ کی بھی ہے، یہیں مولانا رحمت اللہ ندوی کے برادر خورد منت اللہ سلمہ اور مولانا عبدالحی ندوی صاحب کے صاحبزادے نعمان عبدالحی سلمہ زیر تعلیم ہیں، اس معہد میں درسگاہ اور قیامگاہ الگ الگ ہے، ہم لوگ قیام گاہ پہنچے تھے، طلبہ کے لئے رہائش کی اعلیٰ سہولتیں ہیں، میں نے اپنے رفقاء سے مزاحاً کہا کہ دارالاقامہ کو دیکھ کر طالب علمی کی طرف لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے، یہاں سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں 'منظمۃ الدعوۃ الاسلامیہ' کا دفتر ملا، مولانا رحمت اللہ صاحب اپنے ساتھ پرانے کپڑوں کا ایک بڑا تھیلہ لے کر آئے تھے، انھوں نے یہ کپڑے دفتر کے حوالہ کر دیا، معلوم ہوا کہ لوگوں کے پاس جو پرانے کپڑے اور قابل استعمال پرانی چیزیں ہوتی ہیں، وہ انھیں یہاں جمع کرادیتے ہیں، اور یہاں سے انھیں ملک و بیرون ملک غرباء میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، یہ طریقۂ کار مجھے بہتر محسوس ہوا، کاش! اس طرح کا نظم ہر علاقے کے لوگ کیا کریں تو بہت سے غریب انسانوں کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں۔

ہمارے رفقاء کی رائے ہوئی کہ ایک دفعہ گاڑی پر ہی اس علاقہ سے گذرا جائے، جسے ایشیاڈ میچ کے لئے گویا ایک شہر کی صورت بسایا گیا تھا، یہ بہت بڑا علاقہ ہے اور روشنی کا اتنا غیر معمولی نظم کیا گیا ہے کہ اگر پورے کو روشن کر دیا جائے تو یقیناً یہ پورا علاقہ بقعۂ نور ہو جائے گا، اس شہر کو موجودہ امیر قطر سے موسوم کرتے ہوئے 'قریۂ حمد بن خلیفہ آل ثانی' کا نام دیا گیا ہے، اس میں بے شمار رہائشی عمارتیں ہیں، اور چھوٹے بڑے اسٹیڈیم ہیں، اور مرکزی اسٹیڈیم خلیفہ اسٹیڈیم کے نام سے ہے، اب یہ علاقہ ایک تفریح گاہ ہے، لیکن جگہ کی وسعت کے اعتبار سے تفریح کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے، یہاں سے ہم لوگ قطر کے ایک اور ممتاز عالم شیخ عبداللہ بن ابراہیم انصاری مرحوم کے مکتبہ سے ہوتے ہوئے 'گرین مسجد' پہنچے، یہاں ہند

وپاک کے علماء نے ایک خصوصی نشست اس حقیر کے خطاب کی رکھی تھی، میں نے اپنے خطاب میں دو تین باتوں پر خصوصی توجہ دلائی، پہلی بات یہ ہے کہ علماء کی خاص ذمہ داری دین کا تحفظ ہے اور آج جب کہ اسلام پر مغرب کی طرف سے سخت فکری یلغار ہو رہی ہے، ضرورت ہے کہ علماء اپنے آپ کو اس کے مقابلہ کے لئے تیار کریں، اس کے مقابلہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم فروعی اختلافات میں اُلجھنے کے بجائے خارجی فتنہ کی طرف زیادہ توجہ دیں اور اس بات کی صلاحیت پیدا کریں کہ آج کے استدلالی اُسلوب میں ہم دین کو لوگوں تک پہنچا سکیں اور عقل ومشاہدہ اور فطرتِ انسانی سے احکام شریعت کی ہم آہنگی کو ثابت کر سکیں، اس کے لئے خاص طور پر علماء کو 'اسرارِ شریعت' کا مطالعہ کرنا چاہئے جیسا کہ امام غزالی، عزالدین بن عبدالسلام، علامہ ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ وغیرہ نے اپنے اپنے عہد میں اس خدمت کو انجام دیا ہے اور آج بھی اس پہلو پر توجہ کی ضرورت ہے۔

دوسری بات جو میں نے عرض کی وہ یہ تھی کہ علماء کو احکام شریعت کے مدارج کو سمجھنے اور ملحوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے، اس پہلو پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے افراط وتفریط پیدا ہو جاتی ہے، جو چیزیں اساسیاتِ دین اور مدارِ ایمان ہیں، ان کا درجہ اور عملی احکام کا درجہ یکساں نہیں ہے، پھر عملی احکام میں جو قطعی واجماعی ہیں ان میں اور جو اجتہادی ہیں ان میں فرق ہے، اسی طرح اجتہادی احکام میں فرائض وواجبات اور محرمات ومکروہات ایک درجہ کے نہیں ہیں، علماء جب ان احکام میں فرق نہیں کرتے تو کہیں افراط اور کہیں تفریط پیدا ہو جاتی ہے۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ سلف صالحین کے یہاں بھی بہت سے مسائل میں اختلاف پائے جاتے تھے، لیکن یہ اختلاف بھی ان کے درمیان نزاع وجدال کا باعث نہیں بنا، انھوں نے ایک دوسرے کو کافر وفاسق نہیں کہا، وہ پورے احترام کے ساتھ اختلاف رائے کرتے تھے، اسی لئے ان کا اختلاف پوری اُمت کے لئے رحمت ہے، ہمارے دور میں علماء کے اندر اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی، یہاں تک کہ فروعی مسائل میں

بھی ہم ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا کفر وایمان کا اختلاف ہو، یہ مزاج علماء کو بے وقار کرتا ہےاور اُمت میں انتشار کا باعث بنتا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اپنی معروضات پیش کی گئیں، پھر مختلف لوگوں نے سوالات کئے، جو زیادہ تر مسلم پرسنل لاء بورڈ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق تھے اور کچھ فقہی مسائل بھی تھے، یہیں حافظ عبدالمتین حیدرآبادی سلمہ بھی اپنے بعض عزیزوں کے ساتھ آ گئے، وہ ایک بڑے حادثہ کے بعد صحت مند ہوئے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے، قطر پہنچنے کے بعد ہی سے میں ان سے ملاقات کے لئے بے چین تھا، اس ملاقات نے بہت شادکام کیا، بڑی محبت سے پیش آئے، ان کے بعض اعزہ بھی ساتھ تھے، ہم لوگ مسجد سے مولانا عبدالحی ندوی کے مکان پہنچے، جہاں آج رات کے کھانے کی دعوت تھی، متعدد اہل علم دسترخوان پر جمع تھے۔

۲۲ جنوری کو ظہر تک پروگرام ختم ہوا، عزیزی مولانا رحمت اللہ سلمہ گھر سے میرے ذوق کا کھانا لے کر آ گئے تھے، کھانے اور کچھ استراحت کے بعد مختلف احباب ملاقات کے لئے آتے رہے، انہی میں دیرینہ محبّ جناب عبدالرشید صاحب اور عبدالمتین سلمہ کے برادرِ خورد عزیزی حافظ عبدالمنان سلمہ بھی ہیں، ان حضرات کی آمد سے ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں حیدرآباد ہی میں ہوں، دیر تک بات ہوتی رہی، آج رات میں عالم اسلام کے معروف صاحبِ نظر مصنف ڈاکٹر علی قرہ داغی استاذ قطر یونیورسٹی کے یہاں دعوت تھی، چنانچہ اول وقت میں عشاء کی نماز پڑھ کر مولانا رحمت اللہ سلمہ کے ساتھ وہاں حاضر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے پندرہ بیس ممتاز علماء کو مدعو کیا، ان شرکاء میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی، شام کے معروف مفسر شیخ محمد علی صابونی، عالم اسلام کے ممتاز فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی، جامعہ ازہر مصر کے کئی اساتذہ، خلیجی ملکوں کی مختلف یونیورسیٹیوں کے پروفیسر اور بعض وزراء بھی شامل تھے، بغداد کے ایک صاحب جو کانفرنس میں نہیں آ سکے تھے، وہ ایرپورٹ سے براہ راست ڈاکٹر قرہ داغی کے مکان ہی پر پہنچے، گویا اصحابِ

علم کا ایک گلدستہ تھا، زیادہ تر کانفرنس کا موضوع اور عراق کے حالات کا ذکر چھایا رہا، ڈاکٹر قرضاوی سے تنہائی میں ملاقات ہوئی اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا، یہ بڑی اچھی مجلس رہی، جس میں لطائف وظرائف بکھیرے گئے، شیخ محمد علی صابونی بہت دراز قامت اور وجیہہ رو ہیں، نیز داڑھی کے بال بالکل سفید اور ریش بھی اچھی خاصی برصغیر کے علماء کی طرح، ازہری علماء کے طرز پر عمامہ باندھتے ہیں، ان سے چٹکی لیتے ہوئے ایک عالم نے کہا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ 'آیت اللہ محمد علی صابونی' لکھنا شروع کر دیں، شیخ صابونی نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ ایران کے علماء جو اپنے نام کے ساتھ آیت اللہ لکھتے ہیں، یہ تو لوگوں کی طرف سے دی ہوئی ڈگری ہے، لیکن میرا آیت اللہ ہونا تو منصوص ہے، پھر یہ آیت پڑھی: **ومن آياته أن خلقكم من تراب ثم إذا انتم بشر تنتشرون** (روم:۲۰)۔

حالاں کہ اس مجلس کی وجہ سے بظاہر ایک دشواری پیدا ہوئی کہ جہاز کی سیٹ ختم ہوگئی اور مجھے براہ کوچین آنا پڑا، لیکن واقعہ ہے کہ یہ مجلس گویا حاصل سفر تھی، یہ بات دیکھ کر مسرت ہوئی کہ عام طور جو عرب علماء کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فکر ونظر کے سلسلہ میں متساہل واقع ہوئے، ایسا نہیں ہے۔

بحیثیت مجموعی اس وقت عالم اسلام کی بے کسی نہایت ہی قابل افسوس ہے، امریکہ اس طرح ان ملکوں پر مسلط ہے کہ اب یہ ممالک اور ان کے حکمرانوں کی مثال ایسے قیدیوں کی ہے، جن کو سونے کے پنجروں میں بند کر دیا گیا ہو، اس حال میں بھی ان کے دل آپس میں ٹوٹے ہوئے ہیں، اور اپنے بڑے دشمن کی ستم انگیزی بھی انھیں متحد کرنے سے قاصر ہے، اللہ تعالیٰ ان کے حالات کو بہتر فرمائے اور کوئی ایسا مردِ غیب پیدا ہو، جو عالم اسلام کی ان بکھری ہوئی قوتوں کو بنیانِ مرصوص بنادے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز** .

❑ ❑ ❑ ❑

پانچ روز ملیشیا میں

مشرق بعید کے ممالک میں ایک اہم ملک ملیشیا ہے، یہ دنیا کے ان ملکوں میں ہے جہاں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے حامل لوگ موجود ہیں، اس کا رقبہ ۳ لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے اور آبادی ڈیڑھ کروڑ سے متجاوز ہے، یہ ملک زیادہ تر اونچی نیچی پہاڑیوں اور ہرے بھرے جنگلات پر مشتمل ہے، یہاں سال بھر ایک ہی موسم ہوتا ہے، نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ ٹھنڈک اور تقریباً روزانہ ہی سہ پہر میں بارش ہوجاتی ہے، یہاں کا درجۂ حرارت ۳۰ کے آس پاس ہوتا ہے، یہاں کے قدرتی وسائل میں ٹن اور زرعی وسائل پام آئل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس ملک میں ۶۰ فیصد مسلمان آباد ہیں، یہ ان ملکوں میں ہے جہاں جنگ کے ذریعہ نہیں بلکہ دعوت کے ذریعہ اسلام پہنچا ہے، کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف ۴۲ سال بعد عرب تاجروں کے ذریعہ یہاں اسلام پہنچا اور دو سو سال کے عرصہ میں یہ پورا جزیرہ نما اسلام کے دامن میں آگیا، سومترا میں ایک ایسے مسلمان شخص کی قبر دریافت ہوئی ہے، جن کی وفات ۶۰ ھ میں ہوئی ہے اور یہ علاقہ ملیشیا سے قریب ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔

یہ ملک سینکڑوں سال استعمار میں رہنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں آزاد ہوا، اس وقت ملیشیا الیکٹرانک مصنوعات کے اعتبار سے دنیا کے صفِ اول کے ملکوں میں ہے اور ایک مسلمان ملک ہونے کی حیثیت سے اُمتِ مسلمہ کے لئے مایۂ افتخار کا درجہ رکھتا ہے، یہاں کی کرنسی ''رنگٹ'' کہلاتی ہے، جو سعودی ریال کے برابر ہے اور یہاں کا دارالخلافہ ''کوالالمپور'' ہے، جس کی آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے، تیسری دنیا کے ممالک میں ملیشیا کی ترقی کو مثالی سمجھا جاتا ہے، اسلامی

رشتہ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ اس ملک میں ایک اچھی خاصی آبادی ہندوستانی نسل کے لوگوں کی بھی ہے اور اس کی صنعتی وتجارتی ترقی کے باعث عرصہ سے خواہش تھی کہ کبھی اس علاقہ میں جانے کا موقع ملے اور وہاں کے احوال سے واقفیت حاصل ہو، چنانچہ جب انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کوالالمپور نے راقم الحروف کو اپنی کانفرنس منعقدہ: ۲۹، ۳۰ جون ۲۰۰۵ء میں مدعو کیا تو باوجود دوسری مصروفیات کے میں نے بڑی رغبت کے ساتھ اسے منظور کرلیا۔

میرے سفر کا آغاز حیدرآباد انٹرنیشنل ایرپورٹ سے ہوا، ٹکٹ ملیشیا ایرلائنز سے تھا، جہاز کافی کشادہ تھا، لیکن مسافر کم تھے، جہاز کے اندر اخبارات ورسائل زیادہ تر ملائی زبان میں تھے، لیکن رسم الخط رومن تھا، اصل میں ملائی زبان جاوی خط میں لکھی جاتی تھی، جو عربی سے ملتا جلتا خط ہے اور اب بھی یہ خط گاہے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن برطانوی استعماری دور میں حکومت نے رومن میں تبدیل کردیا اور اب عام استعمال اسی خط کا ہے، ایرپورٹ، بازار، دفاتر ہر جگہ اسی کا غلبہ ہے، سفر کے آغاز میں پائلٹ نے سلام سے مسافرین کا خیر مقدم کیا، اس سے مسرت ہوئی، خاتون ایرہوسٹس کا لباس بھی بہ مقابلہ دوسری ایرلائنز کے غنیمت تھا، جہاز ٹھیک وقت پر اُڑا، فضائی سفر کی روایت کے مطابق فلم یہاں بھی دیکھائی گئی، کھانا پیش کیا گیا، لیکن پکوان ملائی نہج کا تھا، اسی لئے بہ تکلف کھایا گیا، چار گھنٹوں میں یہ سفر پورا ہوا، راستہ میں ایک دو مقام پر ایسے جھٹکے کی کیفیت ہونے لگی کہ دل لرزنے لگا، مجھ سے متصل ایک غیر مسلم نوجوان کی نشست تھی، جو CA تھے، وہ پہلی بار کمپنی کے کام سے کوالالمپور جارہے تھے، جہاز کے سفر کا تجربہ نہیں رکھتے تھے، اس لئے زیادہ گھبرارہے تھے، چار گھنٹہ میں سفر طے ہوا، جب کوالالمپور پہنچنے میں نصف گھنٹہ کے قریب رہ گیا تو ایسا لگا کہ زمین پر دور دور تک روشنی کا آبشار بہہ رہا ہے، ہندوستانی وقت سے دو بج کر پندرہ منٹ پر اور مقامی وقت کے اعتبار سے پونے پانچ بجے ہلکی ہلکی بارش کے درمیان جہاز ایرپورٹ پر اُترا۔

کوالالمپور انٹرنیشنل ایرپورٹ جدید سہولتوں سے آراستہ ہے بناوٹ کے لحاظ سے اسے

شیش محل کہا جائے تو بے جا نہ ہو، غیر معمولی وسیع وکشادہ، اس قدر صاف ستھرا کہ گرد تلاش کرنے پر بھی نہ ملے، عملہ بھی بہت خلیق، مہمان نواز اور معاون، ہر شخص مسکرا کر گفتگو کرتا ملے گا، آپ کی بات نہ سمجھ پائے تو اشارہ سے سمجھ کر آپ کی ضرورت پوری کرے گا، جہاز سے اُتر کر ایک یا دو منزل نیچے امیگریشن ہے، اس سے پھر ایک منزل نیچے آئے تو سامان پہنچنے کی جگہ ہے، ہر جگہ خودکار برقی سیڑھیوں اور راستوں کی وجہ سے چلنا نہیں پڑتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے مختلف بیلٹ قائم ہیں اور بہت عمدہ قسم کے ہیں، جس سامان کے ٹوٹ جانے اندیشہ ہوتا ہے، اسے فائبر کے ایک کھلے بکس میں رکھ کر بیلٹ پر ڈالتے ہیں، اس طرح تمام چیزیں بہ حفاظت پہنچ جاتی ہیں، کسی قدر انتظار کے بعد سامان آیا، ہم سامان لے کر باہر نکلے تو ذہن میں اُلجھن تھی، کیوں کہ شہر سے ایرپورٹ ۷۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور زبان کی اجنبیت اس سے سوا ہے، وقت بالکل آغازِ فجر کا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سامنے ہی ایک نوجوان کو کھڑا پایا، جس نے میرے نام کا بینر لیا ہوا تھا، یہ نوجوان اسلامک یونیورسٹی کا ملازم ہے، اور نام ''اسماعیل'' ہے، خوش مزاج اور ہنس مکھ، میں نے کہا کہ پہلے نمازِ فجر پڑھ لیں، ایرپورٹ ہی میں ایک حصہ نماز کے لئے مخصوص ہے، یہیں نماز ادا کی گئی، پھر اس کے ساتھ یونیورسٹی کی گاڑی پر روانہ ہوئے۔

صاف شفاف کشادہ سڑکیں، دونوں طرف گہرے سبز لباس میں ملبوس درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ، خاص کر پام آئیل کے دورویہ درختوں پر جھولتی ہوئی زُلفیں بڑی خوش منظر نظر آتی ہیں، کہیں کہیں خالی زمین، لیکن اس پر بھی دوبھیوں کی سبز قالین بچھی ہوئی، شہر شروع ہونے کے بعد فلک بوس، خوب صورت اور نوع بہ نوع ڈیزائن کی عمارتیں، قریب قریب سات بجے قلبِ شہر میں واقع ''پان پیسیفک فائیو اسٹار ہوٹل'' میں پہنچایا گیا، سفر کی شب بیداری نے تھکا دیا تھا، اس لئے ضروریات سے فارغ ہو کر ہلکا ناشتہ لیا، چائے پی، نماز پڑھی اور بستر کی پناہ لی، تکان کی وجہ سے خلافِ توقع تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند آ گئی اور ظہر تک سوتا رہا۔

ٹریفک کے اعتبار سے کوالالمپور بہت ہی ترقی یافتہ شہر ہے، عام طور پر لوگوں کے پاس گاڑیاں ہیں، یہاں بہت کم امپورٹ کی ہوئی گاڑیاں نظر آتی ہیں، کیوں کہ خود ملیشیا میں بہت سہولت بخش گاڑیاں بنتی ہیں، ٹیکسیاں بہت خوبصورت رنگوں سے سنواری اور سجائی ہوئی ہوتی ہیں اور ہر جگہ اور ہر وقت دستیاب ہوتی ہیں، منی بسیں بھی ہیں، زمین پر چلنے والی ٹرینیں بھی ہیں اور یہ بھی اتنی ترقی یافتہ ہیں کہ کوالالمپور شہر سے ایرپورٹ تک کا ۷۵ کیلومیٹر کا فاصلہ محض ۲۸ منٹ میں طے کرتی ہیں، فلائی برج سے گذرنے والی میٹرو ٹرینیں بھی ہیں، جو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے گذرتی رہتی ہیں، اس کے علاوہ پہلی بار ''مونو ٹرینیں'' دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کے لئے اونچے پل بنے ہوئے ہیں، جن کے دو طرف دو موٹے بیم ہیں، بیچ کا حصہ خالی ہے، تنہا ایک بیم کے اوپر سے ٹرین گذرتی ہے، درمیان میں خلا ہے، ایک طرف سے ٹرین کے جانے کا راستہ ہے اور دوسری طرف سے آنے کا، عام طور پر یہ ٹرین صرف دو کوچ پر مشتمل ہوتی ہے اور چوڑائی بھی بظاہر کم نظر آتی ہے، خیال ہے کہ ایک ٹرین میں دو بڑی بسوں کے بہ قدر گنجائش ہوگی، یہ ہر دو تین منٹ کے وقفہ سے گذرتی ہیں۔

جناب ڈاکٹر خالد رشید صاحب کا قریب چار بجے فون آیا، آج ہی ان کی اہلیہ امریکہ سے تین ماہ پر آئی تھیں، وہ انھیں لانے ایرپورٹ گئے تھے، اس لئے دیر سے ربط کر سکے، پانچ بجے کے قریب تشریف لائے، ساٹھ کے آس پاس عمر ہوگی، علیگ ہیں اور قانون کے استاذ ہیں، پہلے نائیجریا میں استاذ تھے، پھر کوالالمپور یونیورسٹی کی دعوت پر یہاں تشریف لائے، بڑے ہی خلیق اور ملنسار، آج آپ کے ساتھ k.L مینار جانا ہوا، یہ ۴۲۱ میٹر اونچا ٹاور ہے، یکم اکتوبر ۱۹۹۶ء کو سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتر محمد نے اس کا افتتاح کیا تھا، بالکل نیچے دو منزلیں ہیں اور بالکل آخر میں پانچ منزلیں ہیں، باقی درمیان کا پورا حصہ باہر سے بند ہے اور اس میں صرف لفٹ کی آمد و رفت کا راستہ ہے، آخری منزل ٹیلی کمیونکیشن سے متعلق دفاتر پر مشتمل ہے، باقی منزلوں میں ریسٹورنٹ، ہوٹل، شاپنگ سنٹر وغیرہ ہیں اور بالکل اوپر T.V کا انٹینا ہے۔

ٹاور سے قریب قریب پورا شہر نظر آتا ہے، البتہ پھیلے ہوئے شہر کو دیکھنے کے لئے دور بین مطلوب ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ٹاور کے اوپر پہنچا، وہاں سیاحوں کے ''واک مین'' کی سہولت ہے، جو مختلف زبانوں میں ہے، ہندی میں بھی ہے، لیکن صرف نام ہندی ہے، حقیقت میں وہ اُردو ہی کا ہے، میں نے اُردو والا لیا، گائڈ اس میں بڑی عمدگی سے چاروں طرف پھیلے ہوئے خوبصورت اور تاریخی مناظر کے بارے میں بتاتا ہے اور کیسٹ کی مدد سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے، ٹاور سے نیچے بھی ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے، اس لئے نیچے کے مناظر صاف نظر نہ آتے تھے، اس ٹاور کے چاروں طرف خوبصورت پارک بنے ہوئے ہیں، جہاں مسلسل سیاحوں کی آمدورفت کا سلسلہ لگا رہتا ہے، ہم لوگ ٹاور سے نیچے اُترے اور تھوڑی دیر اس کی لابی میں بیٹھے رہے، وہیں چائے پی گئی، پھر شہر کے بعض حصوں کی سیر کرتے ہوئے ہوٹل پہنچ گئے۔

۲۹ جون کو ظہر کے بعد ڈاکٹر خالد رشید کے ساتھ مشہور ''ٹو اِن ٹاور'' جانا ہوا، یہ دو بلند قامت فلک بوس ٹاور ہیں، جن کو دنیا کی سب سے بلند ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل ہے، یہ ۱۷ منزلوں پر مشتمل ہے، انھیں اسٹیل سے بنایا گیا ہے اور ان میں بے پناہ وزن اُٹھانے اور اسے برداشت کرنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، دس ہزار سے زیادہ لوگ ان دونوں ٹاوروں میں مختلف دفاتر میں کام کرتے ہیں، نچلی چار پانچ منزلوں میں مارکیٹ ہے، جس پر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر چیز دستیاب ہے اور دنیا بھر کی مشہور کمپنیوں کے شورومس اس مارکیٹ میں موجود ہیں، ملکی اور غیر ملکی سیاحوں اور خریداروں کی بہت بڑی تعداد ہر وقت اس عمارت میں گشت کرتی نظر آتی ہے، لفٹ کے علاوہ مارکیٹ میں برقی سیڑھیوں کا بھی جدید ترین نظام ہے، درحقیقت یہ مارکیٹ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل تفریح گاہ بھی ہے اور بہت سے لوگ شاید اسی نقطۂ نظر سے یہاں آیا کرتے ہیں، اسٹیل اور گلاس اس زاویے سے لگائے گئے ہیں کہ دھوپ میں بھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں۔

یہ ٹاور جس جگہ بنایا گیا ہے وہاں برطانوی عہد میں بہت بڑا ریس کورس تھا، آزادی کے بعد یہاں ریس ختم کر دی گئی اور اس وسیع و عریض علاقہ میں دنیا کے ان دو سب سے اونچے ٹاور کے علاوہ بہت بڑا پارک بنا دیا گیا ہے، جس کے بیچ میں مصنوعی جھیل بھی ہے، اسی مناسبت سے اسے ''لیک گارڈن'' بھی کہتے ہیں، رات کے وقت خاص کر یہ ٹاور اور اس کے گرد وپیش کا بہت ہی خوبصورت نظر آتا ہے اور ٹاور میں اس طرح روشنی کا نظم کیا گیا ہے کہ گویا اندر سے روشنی پھوٹ رہی ہو، پھر چمک دار اسٹیل کی وجہ سے روشنیوں کا انعکاس اس منظر کا لطف دوبالا کر دیتا ہے، ان دونوں ٹاوروں کے زیر سایہ ایک خوبصورت مسجد بھی ہے، بہر حال اس تاریخی عمارت کی سیر کر کے ہم لوگ مغرب کے قریب ہوٹل واپس آ گئے۔

۲۹-۳۰ جون کو کانفرنس تھی، اس انٹرنیشنل کانفرنس کا عنوان تھا: ''شریعت اور سیول لا کے درمیان ہم آہنگی'' (Harmonisation of Shariah And Civil Law) —— پروگرام کے مطابق ٹھیک سوا آٹھ بجے رجسٹریشن ہوا، نو بجے مقررہ وقت کے مطابق کانفرنس کا آغاز ہوا، ایک نوجوان نے قرآن مجید کی بڑی نفیس تلاوت کی، پھر ڈاکٹر نیک احمد کمال نیک محمد ڈین آف احمد ابراہیم کالج آف لاء نے خیر مقدمی کلمات کہے، پھر چیف جسٹس آف سپریم کورٹ ملیشیا نے افتتاحی کلمات کہے، انھوں نے کانفرنس کے آغاز کے لئے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پر اپنے خطاب کو ختم کیا، اس کے بعد چائے کا وقفہ دیا گیا اور پندرہ منٹ کے بعد دوبارہ کانفرنس کا سیشن شروع ہوا، شام چھ بجے تک مختلف مقالے پڑھے گئے اور ان پر بحث ہوتی رہی، شام میں چیف جسٹس صاحب کی طرف سے ہوٹل ہی میں پر تکلف عشائیہ کا نظم تھا، دوسرے دن نو بجے سے اجلاس کا آغاز ہوا، چائے، کھانا اور نماز کے وقفہ کے ساتھ شام پانچ بجے کانفرنس اختتام کو پہنچی۔

دونوں دنوں پہلے سیشن میں کلیدی خطبات رکھے گئے تھے، پہلے دن ڈاکٹر محمد ہاشم کمالی کا خطبہ اجتماعی اجتہاد کے موضوع پر اور ڈاکٹر محمود احمد غازی کا ''پاکستان میں قانونِ شریعت اور سول لاء کے درمیان ہم آہنگی کے تجربہ'' کے موضوع پر تھا، ڈاکٹر کمالی افغان نژاد ہیں، عرصہ

تک امریکہ، کناڈا اور مختلف ملکوں میں اسلامی قانون کے استاذ رہ چکے ہیں اور اس وقت انٹر نیشنل اسلامی یونیورسٹی ملیشیا میں استاذ ہیں، اُصولِ فقہ کے موضوع پر انگریزی زبان میں ان کی متعدد کتابیں طبع ہوچکی ہیں، جو بڑی قدر ووقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، چنانچہ اس سیمینار میں بھی متعدد مقالہ نگاروں نے ڈاکٹر کمالی کے حوالہ سے اپنی بات پیش کی، ان کا خطبہ اجتہاد کے موضوع پر تھا، اس بات سے خوشی ہوئی کہ گوان کی تمام آرا سے اتفاق دشوار تھا، لیکن بڑی حد تک ان کی فکر اور تحریر میں توازن تھا، ذاتی ملاقات میں بھی متواضع اور منکسر المزاج نظر آئے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی بڑے صاحبِ ذوق اور محقق عالم ہیں، پاکستان میں شریعہ کورٹ کے چیف جسٹس، وزیرِ اُمورِ مذہبی اور وزیر اوقاف کی ذمہ داریاں ادا کرچکے ہیں اور اس وقت انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے صدر ہیں اور جنرل ضیاء الحق شہید سے لے کر پاکستان کے موجودہ حکمراں تک تقریباً سبھوں سے ان کے قریبی روابط رہے ہیں اور ان روابط کو انھوں نے بہتر دینی اور ملی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے، وہ عربی، اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں بولنے اور لکھنے کی یکساں قدرت رکھتے ہیں، انھوں نے امام محمدؒ کی ''السیر الصغیر'' کو ایڈٹ کیا ہے اور اسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے، ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں ''اسلام اور بین الاقوامی تعلقات، محاضراتِ قرآن اور محاضراتِ حدیث'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بہت ہی ملنسار، خوش مزاج، متواضع اور اہل علم کے قدرداں اور مرتبہ شناس ہیں، پاکستان کے سفر میں ایک سے زیادہ دفعہ اس کا تجربہ ہوا، ان کا خطبہ مقررہ موضوع پر تھا، دلچسپ معلومات کا حامل تھا اور علماء کے لئے باعثِ عبرت بھی تھا کہ ہماری بعض کوتاہیاں کس طرح قانونِ شریعت کی تنفیذ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں؟

دوسرے دن پہلا کلیدی خطبہ انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے ایک فاضل جج کا تھا، یہ خطبہ ملائی زبان میں تھا، دوسرا خطبہ اس حقیر کا تھا، راقم الحروف نے اپنے خطبہ میں اسلام کے بنیادی تصورِ عدل، اجتہاد کے لوازم، اجتماعی اجتہاد، تلفیق اور موجودہ مرجحہ قوانین کو قانونِ

شریعت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے خاص کر معاشرتی قوانین کے سلسلہ میں ایک نقشۂ کار پیش کیا تھا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اسے بہت سراہا گیا، ڈاکٹر غازی، ڈاکٹر کمالی اور مختلف علماء اور ججوں نے شخصی طور پر بھی ملاقات کر کے تاثر کا اظہار کیا۔

کانفرنس پان پسیفک ہوٹل کے ایک خوبصورت ہال میں منعقد ہو رہی تھی، اسٹیج مختصر رکھا گیا تھا، جس میں ہر سیشن کے مقالہ نگاروں کی نشست ہوتی تھی اور اسٹیج کے دونوں طرف بڑے اسکرین نصب تھے، جس پر پروجیکٹر کے ذریعہ مقالہ نگار کا تعارف پیش کیا جاتا تھا اور مقالہ کا انگیزی اور ملائی ترجمہ، میرا خطبہ عربی زبان میں تھا، اس کا انگریزی ترجمہ بھی اسی طرح پیش کیا گیا، اس طرح حاضرین کو مقالہ نگاروں کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بڑی سہولت ہوئی، اس کے علاوہ مقالات پہلے سے منگوا لئے گئے تھے اور انھیں مجلّہ کی شکل میں مرتب کر کے تمام شرکاء کو فراہم کیا گیا تھا، کانفرنس کی سب سے اہم بات وقت کی پابندی تھی، ہر مقرر اور مقالہ نگار کو اپنے وقت کے اندر اپنی بات ختم کرنی ہوتی تھی، کانفرنس میں خواتین بھی شریک تھیں، ملیشیا میں چہرے کے پردے کا رواج نہیں ہے اس لئے یہ خواتین اسکارف اوڑھے ہوئی تھیں، مردوں اور خواتین کی نشستوں کے درمیان جو فاصلہ ہونا چاہئے اور پردہ کا جو اہتمام برتا جانا چاہئے وہ نہیں تھا، یہ بات ہم جیسوں کے لئے گرانی کا باعث تھی، باقی جو نمائندے جدید تعلیمی حلقوں سے آئے تھے، ان کے لئے یہ کیفیت چنداں باعثِ تکدر نہیں تھی۔

۲۹ جون کو بعدِ مغرب ڈاکٹر خالد رشید اور ڈاکٹر محمود احمد غازی بھی اس حقیر کے کمرے میں آ گئے اور دیر تک علمی اور قانونی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، ڈاکٹر غازی نے پاکستان میں قانون دانوں کے لئے شریعہ اکیڈمی کی طرف سے تربیتی کیمپ رکھے جانے کا ذکر کیا، راقم الحروف نے ان سے ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے زیر نگرانی اسی طرح کا پروگرام رکھنے کی بات کی اور اس کے لئے ان سے تعاون کی خواہش کی، ڈاکٹر صاحب نے ہندو پاک کے خوشگوار ہوتے تعلقات پر خوشی کا اظہار بھی کیا اور اس بات پر متاسف بھی تھے کہ فلمی دنیا کے

لوگوں اور ناچنے گانے والوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کی بڑی سہولت حاصل ہوگئی ہے، لیکن اہل علم کے لئے ابھی بھی بدستور دشواریاں ہیں۔

۳۰ جون کو اس حقیر کے کلیدی خطبہ کے بعد ڈاکٹر خالد رشید صاحب، ڈاکٹر خالد غازی کو اور اس حقیر کو ساتھ لے کر تفریح کے لئے نکلے، کوالا لمپور سے خاصے فاصلہ پر "گنیٹنگ ہائی لینڈ" ایک تفریحی جگہ ہے، جو چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے، راستہ میں اسلامک یونیورسٹی کا وسیع کیمپس بھی پڑتا ہے، چنانچہ ہم لوگ اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت میں اس بلند پہاڑی پر پہنچے، اس کی اونچائی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں بادل پہاڑی کی سطح سے ٹکرا رہے تھے، بلکہ اس سے نیچے اڑ رہے تھے، بادل کی وجہ سے قریب کی عمارتیں بھی بہت دھندلی نظر آرہی تھیں، مجھے پہلی بار بادل کی اٹھکھیلیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، اس بلند پہاڑی پر بہت وسیع اور مسطح حصہ ہے، جہاں کئی ہوٹل بنے ہوئے ہیں، ان میں ایک ہوٹل وہ ہے جس میں چار سو کمرے بنے ہوئے ہیں اور مزید چار سو کمرے بن رہے ہیں، ڈاکٹر خالد رشید صاحب نے بتایا کہ یہ آٹھ سو کمروں پر مشتمل دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہوگا۔

یہاں کئی پارک بنے ہوئے ہیں، بچوں کے لئے کھیلنے اور تفریح کرنے کے نہ جانے کتنے سامان ہیں، جھیل بھی ہے، جس میں بوٹ اور کشتیاں چلتی ہیں، بہت سے ریسٹورنٹس ہیں، غرض کہ تفریح طبع کے لئے ایک سے ایک سامان ہیں، بڑے بڑے مارکیٹ ہیں اور عمارتیں اس طرح بنی ہیں کہ لکھنؤ کی بھول بھلیاں کو بھی شرمندہ کرتی ہیں، وہاں سے تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک دوسری مسطح پہاڑی ہے، جو اس پہاڑی سے کسی قدر نیچی ہے، درمیان میں بہت ہی گھنے جنگلات ہیں، اس پہاڑی سے اس پہاڑ تک سیاحوں کے لئے برقی ٹرالی کی سہولت میسر ہے، ٹرالیاں اچھی خاصی تعداد میں ہیں، جن کی ایک طرف سے دوسری طرف مسلسل آمد و رفت جاری رہتی ہے، ہم لوگ بھی ٹرالی میں بیٹھ کر اس دوسری پہاڑی تک گئے،

کوئی ایک گھنٹہ میں آمدورفت ہوئی ہوگی، درمیان میں ایسے گھنے جنگل ہیں کہ کہیں ایک بالشت زمین نظر نہیں آتی، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب جاپانیوں نے ملیشیا پر حملہ کیا، تو ان کے جتنے فوجی برطانوی فوج سے مقابلہ میں مارے گئے، اس سے زیادہ فوجی جنگلوں میں بھٹک کر اور ملیریا کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن گئے، پودے بھی نئی نئی قسموں کے اور بہت ہی ہرے بھرے ہیں، اس طرح چار پانچ گھنٹے اس تفریح میں گزرے اور ہم لوگ کانفرنس میں اس وقت پہنچ پائے جب اختتامی سیشن چل رہا تھا۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم لوگوں نے نماز ادا کی، پھر یونیورسٹی کے ایک اور ہندوستانی استاذ ڈاکٹر عبدالحسیب (استاذ شعبۂ قانون) کے ساتھ شہر کے بعض علاقوں اور بازاروں میں جانا ہوا، ہم لوگوں کا یہ سفر میٹرو ٹرین کے ذریعہ ہوا، یہ ٹرینیں بہت ہی سہولت بخش اور عصری سہولتوں سے آراستہ ہیں، اندازہ ہوا کہ ملیشیا میں تقریباً تمام چیزیں اندورنِ ملک تیار ہوتی ہیں اور اکثر انٹرنیشنل کمپنیوں نے وہاں اپنی صنعت قائم کر رکھی ہے، خرید وفروخت میں بہت بڑھا کر قیمت بولنے اور بھولے بھالے گاہکوں کو حسبِ موقع ٹھگ لینے کا مزاج نہیں ہے، بہت سی چیزیں بمقابلہ ہندوستان کے خاصی سستی اور بہتر دستیاب ہیں، اسی لئے سیاح حضرات بھی بڑے پیمانہ پر خرید وفروخت کرتے ہیں، ڈاکٹر عبدالحسیب پہلے ہندو یونیورسٹی بنارس میں استاذ تھے، ملنسار اور سادہ مزاج کے آدمی ہیں، بابری مسجد کی شہادت کے موقع پر عین یونیورسٹی میں ان پر حملہ کیا گیا، وہ ایک دوسرے ساتھی کے یہاں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اس کے بعد سے ہی ان کا دل اس ملازمت سے اچاٹ سا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ملیشیا میں ملازمت دلادی، اب وہاں بڑے خوش اور مطمئن ہیں اور وہاں کے لوگوں کے سلوک سے متاثر بھی۔

یکم جولائی کو میرا واپسی کا سفر تھا اور یونیورسٹی کو دیکھنا بھی تھا، یونیورسٹی سے گاڑی آئی اور میں تقریباً دس بجے ہوٹل سے روانہ ہوا، یونیورسٹی شہر سے باہر پہاڑی کے دامن میں واقع

ہے، آس پاس کا علاقہ درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور زمین کے نشیب وفراز نے بھی ایک قدرتی حسن پیدا کر دیا ہے، یونیورسٹی کی اراضی تو بہت بڑی ہے، لیکن اس کا تعمیر شدہ حصہ بھی تقریباً پانچ سوا یکڑ پر مشتمل ہے، عمارتیں بڑی ہی جاذبِ نظر اور مغربی طرزِ تعمیر کی حامل ہیں، ہر عمارت کی چھت خوبصورت، سرخ یا سبز ٹائلز کی چھپر نما ہے، شاید یہ بارش کی کثرت کی مناسبت سے ہے، یونیورسٹی کے دارالاقامہ میں دس ہزار سے زیادہ طلبہ کے قیام کی گنجائش ہے اور شادی شدہ طلبہ کے لئے فیملی کوارٹر کا بھی نظم ہے، اس یونیورسٹی میں صرف اسلامی علوم ہی کے شعبے نہیں ہیں، بلکہ قانون، سائنس اور دوسرے شعبہ جات بھی ہیں، یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم بنیادی طور پر انگریزی ہے، لائبریری میں ابھی کتابیں نسبتاً کم ہیں، ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں، یونیور سٹی کا کیمپس بہت ہی صاف ستھرا اور خوشگوار ماحول کا حامل ہے، پارک، پانی کے حوض اور ان میں فوارے، روشنی کا معقول انتظام یونیورسٹی کے حسن کو دوبالا کرتا ہے، تقریباً سو ممالک کے طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، زیادہ تعداد ملیشیا کے علاوہ انڈونیشیا، تھائی لینڈ، جاپان، چین، سنگاپور، برونائی اور بعض افریقی ممالک کے طلبہ کی ہے، اساتذہ زیادہ تر ملائی ہیں، کچھ غیر ملکی بھی ہیں، جن میں چند کا تعلق ہندوستان سے ہے۔

ہم لوگوں کو لاء کالج نے مدعو کیا تھا، اس فیکلٹی میں عام قانون کے علاوہ لاء آف شریعہ بھی پڑھایا جاتا ہے، اسلامی معاشیات کا بھی خصوصی شعبہ ہے، یہ یونیورسٹی ملیشیا میں قانونِ شریعت کی ترویج میں اپنا اہم علمی کردار ادا کر رہی ہے۔

ڈاکٹر خالد رشید اور ڈاکٹر عبدالحسیب صاحبان کے ساتھ سرسری طور پر کیمپس دیکھنے کا موقع ملا، چوں کہ یہ زمانہ وہاں تعلیم گاہوں کی چھٹی کا ہے، اس لئے طلبہ کی بھیڑ بھاڑ نظر نہیں آئی، ہم لوگ جمعہ سے پہلے وہاں سے واپس ہوئے، ہوٹل سے چیک آؤٹ کرایا اور نمازِ جمعہ کے لئے بھاگے، ہوٹل کے قریب ہی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی، نماز سے فارغ ہو کر ڈاکٹر خالد رشید صاحب کی گاڑی میں ایرپورٹ پہنچا، ایرپورٹ سے متصل پارکنگ پانچ منزلہ ہے،

ایک گاڑی کی جگہ خالی تھی اور کسی قدر فاصلہ پر ایک گاڑی پارکنگ کے انتظار میں کھڑی تھی، وقت کی کمی کا تقاضہ یہ تھا کہ جلد سے جلد ہم لوگ گاڑی کھڑی کریں اور آگے کی طرف بڑھیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان صاحب کو پارکنگ کا موقع دیا، معلوم ہوا کہ یہاں اس بات کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے کہ جو شخص پہلے سے موجود ہو پہلے اسے موقع دیا جائے اور اس کے خلاف کرنے کو بہت برا سمجھا جاتا ہے، اس لئے لوگ از خود اس کا اہتمام کرتے ہیں، کاش ہندوستان میں بھی لوگوں میں یہ مزاج پیدا ہوجائے۔

پھر ہم لوگ لفٹ کے ذریعہ ایرپورٹ کی اس سہ منزلہ پر پہنچے جہاں امیگریشن کرانا تھا اور بورڈنگ کارڈ حاصل کرنا تھا، بہت ہی آسانی کے ساتھ چند منٹوں میں یہ کارروائی انجام کو پہنچی، ذرا بھی دشواری کا احساس نہیں ہوا، بورڈنگ کارڈ دیتے ہوئے کارکن نے بتایا کہ آپ کا جہاز AC سے اڑے گا، آپ نیچے سے ٹرین پکڑلیں، میں نیچے آیا، نیچے بھی بہت بڑے پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے، دکانوں اور ریستورانوں نے ایک خوبصورت مارکیٹ کا منظر پیدا کردیا تھا، وہیں پلیٹ فارم ہے اور مختلف ٹرمنل کے لئے الگ الگ ٹرینوں کا انتظام ہے، جو ہر دو چار منٹ پر آتی اور جاتی رہتی ہیں، پلیٹ فارم پر لکھی ہوئی نشاندہی کے مطابق ٹرین میں سوار ہوگیا اور ٹرمنل پر اترا، وہاں بھی ایرپورٹ سے متعلق بہت بڑی عمارت ہے اور تمام سہولتوں سے آراستہ، وہیں گیٹ نمبر AC سے ہم لوگ داخل ہوئے اور حیدرآباد آنے والے ملیشیا ایرلائنز میں سوار ہوگئے، صرف جو سامان ہاتھ میں تھا اسے اسکرین میں ڈالا گیا، باقی کوئی اور چیکنگ نہیں ہوئی، نہ معلوم اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں چیکنگ کا کوئی زیادہ ترقی یافتہ نظام موجود ہے یا وہ لوگوں پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں؟ اس طرح جہاز کا سفر کرنے والا بار بار Q میں کھڑے ہونے اور تھکا دینے والی کارروائیوں سے گزرنے سے دوچار نہیں ہوتا، کاش ہمارے یہاں بھی ایسا نظام بن سکے، ورنہ تو جہاز کا سفر کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسافر ایک مجرم ہے جس کی بار بار تفتیش ہورہی ہے، جہاز ٹھیک وقت پر اُڑا اور مقررہ وقت کے مطابق حیدرآباد ایر

پورٹ پر اُترا، لیکن یہاں تقریباً نصف گھنٹہ جہاز کورن وے ہی پر رُکے رہنا پڑا اور مسافر اُلجھن سے دوچار رہے، پھر ہم لوگوں کی ایرپورٹ کے ٹرمنل تک رسائی ہوسکی۔

ملیشیا میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں، ملائی، انگریزی، چینی، تمل وغیرہ، لیکن رابطہ کی زبانیں دو ہیں: ملائی اور انگریزی، ملائی سرکاری زبان ہے اور اس زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ موجود ہیں، عربی، انگریزی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں، چنانچہ وزیر اعظم کو پردھان منتری اور بادشاہ کو راجہ کہتے ہیں، ملائی زبان جاوی خط میں لکھی جاتی تھی، جو عربی خط سے قریب ہے، لیکن یورپین فاتحین نے اس زبان کو رومن خط میں رواج دینا شروع کیا اور اب زیادہ تر رومن خط میں ہی ملائی عبارتیں لکھی جاتی ہیں، کہیں کہیں عربی رسم الخط میں بھی سائن بورڈ مل جاتے ہیں، اس سے مغربی قوموں کے تعصب کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ وہ جہاں گئے انھوں نے مقامی زبانوں کو یا ان کے رسم الخط کو بجبر تبدیل کرنے کی کوشش کی، اخبارات ملائی اور انگریزی دونوں زبانوں میں نکلتے ہیں، میرے کمرہ میں جو انگریزی اخبار آتا تھا، اس کے صفحات: ۴۸ تھے اور ۴۸ صفحات ہی کا ضمیمہ، گویا ۹۶ صفحات کا اخبار، ضمیمہ سب سے بڑا تجارت کا ہوتا ہے۔

اس بات سے خوشی ہوئی کہ ملیشیا میں بہت تیزی سے جدید علوم کو ملائی زبان میں منتقل کرنے کا کام کیا گیا ہے، اس لئے میڈیکل، انجینئرنگ اور دوسرے فنون کی تعلیم بہ سہولت ملائی زبان میں ہوتی ہے اور اکثر درس گاہوں میں ذریعۂ تعلیم ملائی ہے، لیکن اس کے ساتھ لوگ انگریزی زبان سے بھی عام طور پر واقف ہیں اور اگر آدمی انگریزی زبان سے واقف ہو تو اسے اپنے مدعا کے اظہار میں کہیں کوئی وقت پیش نہیں آتی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور بشمول اسلامیات کے یہاں تمام مضامین انگریزی ہی میں پڑھائے جاتے ہیں، یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس زبان میں اسلامی لٹریچر اچھی خاصی مقدار میں موجود ہے، علماء عام طور پر عربی زبان سے بھی واقف ہیں اور لوگ جب ملائی اور انگریزی تقریر کے

درمیان آیات واحادیث یا عربی عبارتوں کے اقتباس پڑھتے ہیں تو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

زبان کا اثر نام پر بھی ہے، بہت سے مسلمانوں کے نام بھی ہندی اور سنسکرت زبانوں میں ہیں، جیسے یونیورسٹی کی ایک پروفیسر صاحبہ کا نام تھا: ''مہارانی فاطمہ''، اسی طرح ملائی زبان میں بھی بہت سے نام رکھے جاتے ہیں اور بعض ناموں سے مذہب کا اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

ملیشیا میں کئی ایسی باتیں دیکھنے کو ملیں جو بڑی سبق آموز اور عبرت خیز ہیں :

● پہلی چیز وہاں کا نظم اور ڈسپلن ہے، ایسا لگتا ہے کہ نظم وضبط لوگوں کی طبیعت میں داخل ہوگیا ہے، ٹرین ہو، بس ہو یا کوئی اور موقع ہو ہر جگہ آنے والے لوگ ازخود لائن میں لگ جاتے ہیں اور چاہے ان کو وقتی نقصان ہوجائے، لیکن دوسروں کو پیچھے کرکے خود آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے، ٹریفک کی صورتِ حال یہ ہے کہ ایک سے ایک گاڑیاں خود ملیشیا میں بنتی ہیں، وہاں گاڑیاں امپورٹ کرنے کی نوبت بہت کم آتی ہے، لیکن پانچ روز میں کہیں ہم نے ٹریفک پولیس نہیں دیکھی، ہر شخص ضابطے کے مطابق اپنی قطار میں رہتے ہوئے گاڑی چلاتا ہے، زرد سگنل میں دو تین سکنڈ باقی رہتے ہوئے ہی لوگ رُک جاتے ہیں، زرد سگنل کا انتظار نہیں کرتے، پیدل چلنے والوں کی بے حد رعایت کی جاتی ہے، جہاں آہستہ چلنے کی ہدایت ہوتی ہے وہاں لوگ خود گاڑی آہستہ چلاتے ہیں، ہارن کی آواز سننے میں نہیں آتی، لوگ ایک دوسرے سے بہت نرمی کے ساتھ اور ہلکی آواز میں گفتگو کرتے ہیں، سڑکوں پر چلتے اور بازاروں میں گھومتے ہوئے کہیں کوئی شخص دوسرے سے تیز آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں ملے گا، لوگ دفاتر پر آنے میں وقت کی پوری پابندی کرتے ہیں، چند منٹ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی، یہ ڈسپلن ان کی زندگی کا جزء بن چکا ہے اور غالباً یہی ان کی تیز رفتار ترقی کا اصل راز ہے۔

● دوسری چیز امن وامان ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہاں پولیس ہے ہی نہیں، سوائے ایک

آدھ جگہ کے کہیں پولیس نظر آتی، اس ملک میں خواتین کثرت سے ملازمت کرتی ہیں، سڑکوں پر ٹول ٹیکس وصول کرنے کے لئے، پارکنگ میں، ریلوے اسٹیشن اور ایرپورٹ پر دکانوں میں، ہر جگہ خواتین کارکنان خدمت انجام دیتی ہیں، خواتین کا لباس بھی پینٹ اور شرٹ ہے، خاص کر چائنیز لڑکیوں کا لباس بہت چست اور عریانیت پر مبنی ہوتا ہے، مسلمان لڑکیاں کسی قدر نیچا کوٹ استعمال کرتیں ہیں اور اسکارف بھی باندھتی ہیں، سیاحوں کی ریل پیل ہوتی ہے، جس میں ایشیاء سے امریکہ تک کے سیاح ہوتے ہیں اور ان کا لباس عام طور پر مغربی انداز کا ہوتا ہے۔

لیکن پورے ملک میں امن وامان کی فضا ہے، لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور سیاحوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات جس طرح برصغیر میں پیش آتے ہیں وہاں شاذ و نادر ہی ایسی شکایتیں سامنے آتی ہیں، حالاں کہ وہاں مختلف قومیتوں کے لوگ ہیں، مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی نمائندگی کرنے والے لوگ موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے، ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کرتا ہے اور اپنے طریقہ پر زندگی گزارتا ہے، اسی امن وامان کا نتیجہ ہے کہ وہاں بہت بڑی تعداد میں سیاح کی آمد ورفت ہوتی ہے، گزشتہ سال ہندوستان میں تین ملین سیاح آئے، اس کو ملک میں نیک شگون سمجھا گیا، حالاں کہ ہندوستان میں تاریخی مقامات اور قدرتی تفریحی مناظر کی کثرت ہے، جب کہ ملیشیا میں سالانہ پندرہ ملین سیاح آتے ہیں، گویا جتنی اس ملک کی آبادی ہے اتنے سیاح بھی یہاں آیا کرتے ہیں اور اس سے ملک کو غیر معمولی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

● شاید ان ہی وجوہ سے اس ملک نے ایشیاء میں غیر معمولی ترقی کی ہے، یہ ملک بمقابلہ ہندو پاک کے دس سال بعد آزاد ہوا، ملیشیا پہلے پرتگیزیوں کی غلامی میں رہا، پھر ڈچوں کی اور آخر میں انگریزوں کی، لیکن اس ملک کو اچھے رہنما ملے، تنکو عبدالرحمٰن نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دَور میں ملیشیا میں ترقیاتی کاموں کی ابتداء کی اور مشہور ماہر معاشیات مہاتر محمد کے

بیس سالہ وزارتِ عظمیٰ کے عہد نے اس کی ترقی کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا، اب ڈاکٹر عبداللہ احمد بداوی وزیر اعظم ہیں، جو جامع ازہر کے فضلاء میں ہیں اور ملک کو ترقی کی راہ پر بدستور آگے بڑھا رہے ہیں، اس ملک میں تعلیم کی شرح اسّی فیصد سے آگے بڑھ گئی ہے، لوگوں کی اوسط عمر ۷۰ سال کے قریب ہے، ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں اندرونِ ملک تیار کی جاتی ہیں، دیسی ٹکنالوجی کے ذریعہ بڑے بڑے ترقیاتی کام انجام پا رہے ہیں۔

● سڑکیں نہایت عمدہ، صاف وشفاف اور کشادہ ہیں، سفر اور آمد ورفت کی بے حد سہولتیں میسر ہیں، بسیں بھی ہیں، زیرِ زمین ٹرینیں، زمین کے اوپر چلنے والی ٹرینیں، میٹرو ریل اور مونو ریل، سبھی سہولتیں حاصل ہیں، یہودیوں نے اس ملک کی معیشت کو متاثر کرنے کی بہت کوشش کی اور اس کا کچھ نقصان بھی ہوا، لیکن ملیشیا کے بلند ہمت اور حوصلہ مند لوگوں نے اس کا بھی مقابلہ کیا اور اگر مسلم ممالک کا تجارتی بلاک قائم ہوجائے تو اُمید ہے کہ ملیشیا کی معیشت اور بھی تیز رفتار ترقی کرے گی۔

● دینی نقطۂ نظر سے مجھے اس ملک کی جو چیز بہت بھائی وہ ان کی اختیاری دین داری ہے، کئی قومیتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے لباس اور وضع میں مغربی تہذیب کا غلبہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہاں کے مسلمانوں نے اپنے اسلامی رنگ کو باقی رکھا ہے، مسلمان عام طور پر داڑھی رکھتے ہیں، گو ملائی نسل کے لوگوں کو بہت ہلکی داڑھی ہوتی ہے، مسلمان لڑکیاں اسکارف کا استعمال کرتی ہیں اور جو زیادہ دیندار خواتین ہیں وہ کسی قدر لمبے کرتے ڈھیلے تہبند اور بڑے اسکارف کا استعمال کرتی ہیں، نمازوں کا بھی اہتمام ہے، مسجدیں آباد ہیں، نیز دفاتر، بازار، ایرپورٹ وغیرہ ہر جگہ ایک ہال نماز اور اس کی ضروریات کے لئے مخصوص ہوتا ہے، جس کو ملائی زبان میں ''سورہ'' کہتے ہیں، ہوٹلوں میں بھی اس کا انتظام ہے۔

● برضغیر کی طرح منظم تو نہیں لیکن چھوٹے چھوٹے مدارس وہاں بھی موجود ہیں، یونیورسیٹیوں میں بھی اسلامیات کے شعبے ہیں اور ان میں بمقابلہ برصغیر اور یورپ کی یونیور

سیٹیوں کے زیادہ بہتر بنیادوں پر اسلامیات کی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے۔

● ملیشیا میں ساٹھ فیصد ملائی مسلمان ہیں، تیس فیصد چینی اور دس فیصد ہندوستانی نسل کے لوگ ہیں، جو زیادہ تر تمل ہیں، لیکن قانونی طور پر ملک کا اصل مذہب اسلام ہے اور دوسرے مذہبی گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے، ایک اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے ملک میں اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے سلسلے میں تدریجی کوششیں ہورہی ہیں، پرسنل لاء پہلے سے نافذ ہے، معاہداتی اور مالیاتی قوانین کو بھی شریعت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسلام کے تعزیری قوانین کا بحالتِ موجودہ نفاذ وہاں دشوار ہے اور ان قوانین کی تنفیذ بہ تدریج ہی عمل میں آسکتی ہے، شریعہ کورٹ قائم ہے، جس میں عائلی مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں اور اس کورٹ کو جرائم پر چھ کوڑے تک جسمانی تعزیر کی بھی اجازت ہے۔

● اس سلسلے میں ملیشیا کی ایک قابل تقلید پیش رفت اسلامی اُصولوں پر بینک اور انشورنس نظام کی تشکیل ہے، ملیشیا نے غیر سودی اُصولوں پر ''بینک اسلام'' کے نام سے بینک قائم کیا ہے، اب ملیشیا میں دو غیر سودی بینک قائم ہیں اور خلیجی ممالک کے تین بینکوں کو بھی انھوں نے مدعو کیا ہے، اس کے علاوہ دوسرے بینکوں میں بھی غیر سودی سرمایہ کاری کی سہولت موجود ہے، اسی طرح انشورنس کے قمار آمیز نظام کے متبادل کے طور پر ''نظام تکافل'' قائم ہے، یہ تعاونی انشورنس کی صورت ہے، جو قمار سے خالی ہے اور شرعی بنیادوں پر کام کررہا ہے۔

● سودی بینک عام طور پر چودہ ساڑھے چودہ فیصد تک سود دیتے ہیں، لیکن غیر سودی بینک ساڑھے انیس فیصد تک سرمایہ کاروں کو نفع دے رہے ہیں، اسی لئے اسلامی بینک اور اسلامی تکافل کمپنی میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حصہ داروں کی بھی کثرت ہے اور اس طرح ملیشیا کا بینکنگ نظام نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک آئیڈیل نظام ہے، کاش دوسرے مسلم ممالک بھی اس سے سبق حاصل کریں۔

● ملیشیا کی ایک قابل تقلید چیز ''تابونگ حاجی'' ہے، ملائی زبان میں بینک کو ''تابونگ'' کہتے ہیں، اس بینک کی تاریخ یہ ہے کہ ملیشیا اور انڈونیشیا میں حج کا ذوق بہت زیادہ ہے، بلکہ اس خطہ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ دین دار حضرات حج کرنے کے بعد ہی شادی کرتے ہیں، اس کے لئے لوگ بہت پہلے سے پیسے جمع کیا کرتے تھے، چنانچہ وہاں کے ایک ماہر معاشیات انگ گوعزیز کو یہ خیال ہوا کہ اگر عازمین حج کی یہ رقم جمع کر کے اس کی سرمایہ کاری کی جائے، تو کم عرصہ میں سرمایہ کاروں کو حج کی رقم حاصل ہوسکتی ہے اور انھیں معاشی فوائد بھی حاصل ہوسکتے ہیں، اسی جذبہ اور خیال کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں اس بینک کی بنیاد رکھی گئی۔

● چنانچہ یہ بینک بہت ہی کامیابی کے ساتھ سرمایہ کاری کرتا ہے اور حج کا انتظام کرتا ہے، اس کی بڑی بڑی بلڈنگیں ہیں، ہوٹل ہیں، خود اس بینک کی مرکزی عمارت کوالالمپور کے نہایت ہی اہم علاقہ میں واقع ہے اور دور سے آسمان کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے، اب بینک نہ صرف حجاج کو اخراجاتِ سفر مہیا کرتا ہے، بلکہ مقاماتِ مقدسہ میں اپنے حجاج کے لئے قیام کا بہترین نظم بھی کرتا ہے اور حجاج کی تربیت کی ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہوتا ہے، چنانچہ جن لوگوں نے حج کیا ہے، انھوں نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ ملائی حجاج حرمین شریفین میں انفرادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، بہت ہی مہذب، لڑائی جھگڑے سے گریزاں، نمازوں میں صف اول کا اہتمام کرنے والے، عبادت اور دُعاء میں اشتغال، غالبًا یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے، ملیشیا گورنمنٹ نے اس بینک کے لئے باضابطہ قانون پاس کیا ہے، معلوم ہوا کہ اس سال سعودی وزارتِ حج کا وفد ملیشیا کے دورہ پر آیا تھا، تاکہ وہ اس بینک کے طریقۂ کار اور مثالی انتظام کا مشاہدہ کرے اور سعودی حکومت چاہتی ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو بھی اسی طرز پر حجاج سے متعلق انتظام وانصرام کا مشورہ دے۔

● عالم اسلام کے لئے ملیشیا میں ایک اہم نمونہ اس کی جمہوریت بھی ہے، یہ ملک ۱۳ صوبوں پر مشتمل ہے، ہر صوبہ کا ایک بادشاہ ہے، یہ سلاطین پانچ سال کی مدت میں اپنے میں

سے ایک شخص کو پورے ملک کا بادشاہ منتخب کرتے ہیں، یہ سلاطین آئینی سربراہ کی حیثیت سے رکھتے ہیں، ملک کے بادشاہ کو تقریباً وہی اختیارات حاصل ہیں جو ہندوستان میں صدر جمہوریہ کو حاصل ہوتا ہے اور ریاستی سلاطین گورنر کے درجہ میں ہوتے ہیں، زیادہ اختیارات وزیر اعظم کو حاصل ہیں، جو انتخاب کا سامنا کرتا ہے۔

ملک میں کثیر جماعتی پارلیمانی نظام ہے اور اپوزیشن پارٹی بھی ہے، لیکن اپوزیشن پارٹیاں تعمیری رول ادا کرتی ہیں اور مختلف کمیونٹی کی نمائندگی کرنے والی سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر حکومت چلاتی ہیں، سیاسی جماعتوں کو چندہ لینے کی ممانعت ہے، انھوں نے مختلف ثمر آور یونٹوں میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے، ان کے بڑے بڑے ہوٹل ہیں، عالی شان کمپلیکس ہیں، جن کے ذریعہ پارٹی کو فنڈ حاصل ہوتا ہے، پھر الیکشن میں نہ تو پوسٹر بازی ہے نہ جلسے، نہ ریلیاں، نہ شور و ہنگامہ، بلکہ اُمیدوار رائے دہندوں سے انفرادی ملاقاتیں کرتے ہیں، اس لئے انتخابات میں اخراجات بہت کم ہوتے ہیں اور چوں کہ اُمیدواروں کو الیکشن جیتنے کے لئے پیسے خرچ کرنے نہیں پڑتے اس لئے سیاسی سطح پر کرپشن نہیں ہے اور سیاسی سطح پر کرپشن نہ ہونے کی وجہ سے عوامی زندگی میں بھی بظاہر کرپشن نہیں ہے، ایسی جمہوریت ترقی پذیر ممالک کے لئے واقعی ایک نمونہ ہے۔

البتہ یہ بات بہت کھٹکتی رہی کہ اس ملک میں شراب کی دکانیں بکثرت ہیں، ہوٹلوں اور بازاروں کے علاوہ ایرپورٹ اور ملیشین ایرلائنز میں بھی فراوانی کے ساتھ شراب ملتی ہے، ایک مسلم ملک میں شراب کی یہ ارزانی دیکھ کر دل پر چوٹ پڑتی ہے، البتہ ہوٹلوں میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جن ہوٹلوں میں شرعی ذبیحہ ملتا ہے وہاں ''حلال'' کا بورڈ لگا ہوتا ہے اور جن ہوٹلوں میں غیر شرعی ذبیحہ یا حرام اشیاء ملتی ہیں ان پر ''حرام'' کا بورڈ ملتا ہے اور "Non For Muslim" بھی لکھا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح جوا گھر پر بھی "Non For Muslim" کا بورڈ آویزاں ہے اور معلوم ہوا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے نام یا لباس سے پہچانا جائے تو انھیں یہاں داخل ہونے

نہیں دیا جاتا، نہیں معلوم اس پر کس حد تک عمل ہے؟

ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ملیشیائی ٹی وی میں بمقابلہ ہندوستان اور مغربی ملکوں کے بے حیائی اور بے حجابی کے مناظر نسبتاً کم پائے جاتے ہیں، وہاں جرائم کی سطح کے کم ہونے میں شاید اس کا بھی دخل ہو، بہر حال ایک خوشگوار تاثر کے ساتھ راقم الحروف اس ملک سے واپس ہوا اور اس تاثر کی وجہ اسلامی اقدار کی رعایت کے ساتھ معاشی ترقی اور مستحکم جمہوری نظام ہے، اللہ تعالیٰ اس اسلامی ومشرقی ملک کو مغرب کی نظر بد سے محفوظ رکھے۔

❑ ❑ ❑ ❑

بحر ہند کے ایک جنت نظیر جزیرہ میں چند دن

نومبر کی کوئی خنک رات ہوگی، کہ فون کی ایک لمبی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو یہ افریقہ کی ایک یورپین کالونی ''جزیرہ ری یونین'' سے تھا اور فون کرنے والے نے اپنا نام: ''انس لالہ'' بتایا، موصوف نے اسلام کے اُصول قانون کی ایک اہم بحث عادت اور عبادت کے فرق سے متعلق سوال کیا، گفتگو سے ان کا علو مذاق اور موضوع سے متعلق ان کا مطالعہ ظاہر ہو رہا تھا، جو کچھ سمجھ میں آیا، جواب دیا گیا، پھر چند دنوں میں ان کی جانب سے ہی یہ بحث فیکس کے ذریعہ موصول ہوئی، جس میں علامہ شاطبیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی گفتگو کا خلاصہ تھا، اور تطبیق کے طور پر جو مثالیں دی گئی تھیں، ان میں کئی میری حقیر تالیف ''جدید فقہی مسائل'' کے حوالہ سے مذکور تھیں، اس بحث کو دیکھ کر فکر و مذاق کی ہم آہنگی اور قربت کا بھی احساس ہوا، اس کے بعد غالباً رمضان المبارک میں پھر فون آیا، یہ فون بحر ہند کے اس جزیرہ میں آنے کی دعوت تھی، میں نہ اپنے اس نادیدہ محبّ و مخلص سے آشنا تھا اور نہ اس ملک سے واقف، اس لئے میں نے مبہم سا جواب دینے پر اکتفاء کیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ہفتہ دو ہفتہ کے بعد پھر فیکس آیا، اس میں ہندوستان سے لے کر افریقہ اور فرانس تک کا پورا جغرافیائی نقشہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، اور اس میں اس جزیرہ کی نشاندھی کی تھی، پھر اس جزیرہ کے بارے میں تاریخی اور جغرافیائی حالات بھی مذکور تھے، اس سے موصوف کی بیدار مغزی اور فہم و شعور کا اندازہ ہوا، اس کے بعد پھر مشکل سے چند روز گذرے ہوں گے، کہ ایک ضخیم سا لفافہ موصول ہوا، اس میں اسپانسر لیٹر، ضروری کاغذات، ویزے کے لئے مطلوبہ اشیاء کی تفصیل اور ''ری یونین'' میں خطبات کے موضوعات، نیز یہاں جو مسائل لوگوں کو

درپیش ہیں، ان کی مختصر وضاحت وغیرہ بھیجی گئی تھی، خطبات کچھ علماء کی مجالس کے لئے اور کچھ عوام کی مجالس کے لئے تھے، لیکن موضوعات سبھی علمی نوعیت کے تھے، اپنی بساط کو دیکھتے ہوئے یوں بھی اس میں تأمل ہوا اور خاص کر جب معلوم ہوا کہ عوام کے مجمع کے لئے بھی علمی موضوعات ہی رکھے گئے ہیں، تو مزید تأمل ہوا اور میں نے اگلی بار فون پر کہا کہ شاید میری آمد سے آپ کا حسن ظن پورا نہ ہو اور جس مقصد کے لئے آپ دعوت دے رہے ہیں، اس مقصد کی تکمیل نہ ہونے پائے، لیکن موصوف کے اصرار پر بہر حال عزمِ سفر کر ہی لیا۔

پہلے ویزا لگنے میں تاخیر اور پھر ہندوستان کے بعض پروگرام کی وجہ سے بار بار تاریخِ سفر بدلنی پڑی اور آخر ۲۴ اپریل کو میں حیدرآباد سے بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا، بمبئی ایرپورٹ پر عزیزی مولانا عبدالاحد فلاحی پہلے سے موجود تھے، اور شہر پہنچنے تک کوکن سے عزیزی مولانا عمر بن یوسف فلاحی (استاذ جامعہ حسینہ، کوکن) بھی آگئے، سوءِ قسمت کہ اس شب بمبئی بند بھی تھا، اگر یہ عزیزان ساتھ نہ ہوتے تو شاید جہاز کے وقت میرا پہنچنا بھی ممکن نہ ہوتا، ۲۵ اپریل کی صبح ساڑھے آٹھ بجے ''ایر ماریشش'' سے روانگی عمل میں آئی، ماریشش افریقہ کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، لیکن فرانس اور برطانیہ کے تحت رہ چکا ہے، اس لئے ایرپورٹ کے ماحول سے ہی اس خطہ کی مغرب زدگی کا بہت کچھ احساس ہو چکا تھا، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ ''ایر ماریشش'' نسبتاً ایک ترقی یافتہ ہوائی کمپنی محسوس ہوئی، قرینہ وسلیقہ میں ممتاز، سروس بہتر، مسافرین کے لئے بار بار مشروبات اور کھانے کا نظم، انڈین ایرلائنز کی طرح ویڈیو کا دربار عام نہیں کہ خواہی نہ خواہی دیکھنا پڑے، اور خواب وسکون بھی غارت ہو، بلکہ ہر سیٹ کے سامنے علاحدہ ویڈیو سیٹ اور استفادہ کا علاحدہ انتظام، حسب خواہش دیکھنے والے دیکھیں اور آرام کرنے والے آرام کریں، تقریباً چھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہم لوگ ماریشش ایرپورٹ پر پہنچے۔

یہاں دو، تین گھنٹوں کے توقف کے بعد ''ری یونین'' کا جہاز ملا، یہ اتنا چھوٹا جہاز تھا کہ آج تک ایسے جہاز میں سفر کا تجربہ نہ ہوا تھا، ایک منی بس سمجھ لیجئے، صرف ۲۴ سیٹوں کا جہاز،

نصف گھنٹہ میں ہمارا جہاز ''ری یونین'' کے شہر سینٹ ڈینیس کے ایر پورٹ پر تھا، جزیرہ کی آبادی کی نسبت سے ایر پورٹ بھی چھوٹا ہی ہے، بڑی دشواری زبان کی تھی، یہاں فرنچ زبان کا چلن ہے اور چوں کہ تجارتی، سرکاری اور تعلیمی تمام ضروریات اس زبان سے پوری ہو جاتی ہیں، اس لئے انگریزی بھی بہت کم بولی جاتی ہے، ہمارے یہاں تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں انگریزی زبان سے واقفیت ایک ضروری امر سمجھا جاتا ہے، مگر یہاں ایسا نہیں ہے، اہل فرانس کو اپنی زبان کی حلاوت پر بڑا ناز ہے اور تاریخ کی دیرینہ تلخیوں کی بنا پر انگریزی سے ایک گونہ رقابت بھی۔

لیکن میری مشکل یوں آسان ہوئی کہ مولانا خلیل احمد رادت اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر اندر آ گئے، ایر پورٹ کے صحن سے اندر آتے ہی مولانا پر نظر پڑی اور ضروری کاروائی کے بعد ہم لوگ باہر آ گئے، ملک کے سربرآوردہ علماء مولانا سعید انگار صدر مرکز اسلامی، مفتی محمود درگاہی (جو فتاویٰ میں پورے ری یونین کا مرجع ہیں)، عزیزی مولانا محمد بھگت اور مختلف علماء سے ملاقات ہوئی، انھیں میں ایک پتلے دبلے، دراز قامت، خوش رنگ، متواضع ومنکسر المزاج اور تبسم ریز نوجوان عالم دین بھی تھے، تعارف پر معلوم ہوا کہ یہی 'مولانا انس لالہ فلاحی' ہیں، ری یونین میں کئی پشت سے ہیں، فلاح دارین گجرات میں تعلیم حاصل کی، اس لئے اُردو بھی اچھی بولتے اور لکھتے ہیں، عربی کا بھی اچھا ذوق ہے، انگریزی سے بھی خاصی مناسبت ہے اور فرنچ تو مادری زبان ہے، ماشاءاللہ کم عمری کے باوجود فرنچ میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ بارک اللہ فی علمه و زاد فی حسناته.

ری یونین کم وبیش دوسو مربع میل کے رقبہ پر مشتمل نہایت ہی سرسبز وشاداب اور ہرا بھرا جزیرہ ہے، کہا جاتا ہے کہ ۲۰ سے ۳۰ لاکھ سال پہلے بحر ہند میں تقریباً ساڑھے چار ہزار میٹر گہرا ایک آتش فشاں تھا، جو اُبل پڑا اور اسی کے لاووں سے سمندر میں ایک جزیرہ پھیلتا گیا، یہ آتش فشاں بارہ ہزار سال پہلے بند ہو گیا اور اس کے قریب ہی دوسرا آتش فشاں اُبھرا، جو اب تک

جاری ہے، یہاں تک کہ دس بارہ سال پہلے ری یونین کے شہر سینٹ پال (St Paul) میں سمندر کا کچھ حصہ خشکی میں تبدیل ہوگیا، اس طرح آتش فشاں اس جزیرہ کے لئے ایک رحمت ثابت ہوا کہ یہی اس کے وجود میں آنے کا بھی باعث ہوا اور اس کے پھیلنے کا بھی، یہ پورا جزیرہ ایک پیالہ کی طرح ہے، یعنی چاروں طرف سمندر اور سمندر سے ملا ہوا ہر چہار جانب میدانی علاقہ، پھر چاروں طرف سے پہاڑی اور بیچ میں میدانی سلسلہ، اس لئے اس کو پہاڑ اور سمندر کا دہرا حسن فطرت حاصل ہے، ملک میں چاول، گیہوں وغیرہ کی کاشت تو نہیں ہوتی، لیکن گنے کی کاشت بڑی مقدار میں ہوتی ہے اور ہر طرف گنے کے ہرے، بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آتے ہیں، کچھ ترکاریاں ہوجاتی ہیں، پھلوں میں آم، موسمی وغیرہ کے علاوہ لیچی بڑی مقدار میں ہوتی ہے، بعض خوشبودار پودے بھی ہوتے ہیں، جن سے عطر کشید کیا جاتا ہے، جو اس خطہ اور فرانس وغیرہ میں بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بہت پہلے یہ اور اس کے قرب وجوار کے جزائر مدغاسکر، ماریشش وغیرہ کا جہاز رانوں نے پتہ چلایا، اور وہ یہاں آئے، لیکن شاید ان کو یہاں کا موسم راس نہیں آیا اور یہاں سے واپس ہوگئے، پھر پرتگالی آئے اور وہ بھی چلے گئے، اس کے بعد فرانسیسی آئے اور انھوں نے یہاں قیام کیا، اہل فرانس کی آمد کے بعد سے ہی یہاں کی تاریخ ملتی ہے، اس سے پہلے کے حالات نہیں ملتے، دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس نے بحر ہند کے کئی جزائر پر قبضہ کرلیا تھا، ان میں سے مدغاسکر اور جزائر قمر شامل تھا، اب بعض نے آزادی حاصل کرلی ہے، ری یونین ۱۹۴۷ء تک فرانس کی کالونی بنا رہا، ۱۹۴۷ء میں فرانس نے اس کا الحاق کرلیا، اس طرح اب یہ فرانس کا حصہ ہے، یہاں کے باشندوں کے پاس فرانس کا پاسپورٹ ہے، فرانس میں ان کو بسنے اور فرانس کے الیکشن میں حصہ لینے کے حقوق حاصل ہیں، اور وہ تمام رعایتیں بھی جو فرانس اپنے باشندوں کو دیتا ہے، اس لئے یہ جغرافیائی اعتبار سے افریقہ میں اور سیاسی اعتبار سے یورپ میں واقع ہے۔

۲۶ اپریل سے خطبات کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ آج ری یونین کے مرکزی شہر ''سینٹ وینیس'' میں مدرسہ ہدایت النساء کے زیر اہتمام خواتین سے خطاب تھا اور خطاب کا موضوع رکھا گیا تھا: ''اسلام اور خواتین''، خواتین کی بڑی تعداد اس اجلاس میں شریک تھی، اسلام میں خواتین کا مقام اور ان کے حقوق پر چالیس منٹ کا خطبہ ہوا، اس کے بعد نصف گھنٹہ یا اس سے زیادہ بہنوں کے سوالات کے جوابات دیئے گئے، سوال وجواب سے احساس ہوا کہ یہاں اسلام کے بارے میں خواتین کا مطالعہ بہتر ہے، اور اسلامی اور مغربی ثقافت کے تصادم کی وجہ سے انھیں بعض شکوک وشبہات بھی پیدا ہوتے ہیں، جن کا ازالہ ضروری ہے، اس مدرسہ کے ذمہ دار مولانا یعقوب ملا ہیں، خواتین کے اس پروگرام کا اہتمام آپ ہی نے کیا تھا۔

شہر کے تجارتی مرکز میں نہایت کشادہ، خوبصورت، اور تمام سہولتوں سے آراستہ مسجد ''نور الاسلام'' ہے، جسے ''شیش محل'' کہا جائے تو بے جا نہیں، اس مسجد کے ہال میں ''اسلام کے اُصولِ تجارت'' پر ایک خطبہ آج ہی نماز عشاء کے بعد ہوا، جس میں مردوں اور خواتین کی بہت بڑی تعداد شریک تھی، راقم الحروف نے اسلام کے قانون تجارت کے بارے میں بنیادی قواعد پر روشنی ڈالتے ہوئے، تجارت سے متعلق جدید مسائل پر گفتگو کی، پھر سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا اور تجارت کی نت نئی شکلوں کے بارے میں بہت سے سوالات کئے گئے۔

۲۷ اپریل کو جمعہ تھا، جمعہ سے پہلے شہر کی اسی مرکزی جامع مسجد میں مختصر خطبہ تھا، چنانچہ خطبۂ جمعہ میں پڑھی جانے والی مشہور آیت، جس میں عدل واحسان کا حکم دیا گیا ہے، کو اس حقیر نے موضوع بنایا اور عرض کرنے کی کوشش کی کہ عدل کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا کا نظام عدل پر قائم ہے نہ کہ مساوات پر، اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مغرب نے خاص کر خواتین کے مسئلہ میں بڑی ٹھوکر کھائی ہے —— ری یونین کا ایک شہر ''سینٹ پال'' ہے، یہاں ایک بزرگ شیخ سلیمان موغولیا رہتے ہیں، یہ سلسلہ چشتیہ میں مجاز ہیں، اور پاکستان کے ایک بزرگ مولانا حبیب کبریاء مرحوم کے خلیفہ ہیں، شہر کی مرکزی مسجد میں آپ کا قیام ہے، اس مسجد کا محل وقوع

بہت خوبصورت ہے، مسجد سے متصل ایک بڑا چرچ ہے، مسجد سے متصل شیخ نے مدرسہ حبیبیہ کے نام سے ایک درسگاہ بنوائی ہے، جس کے ذمہ دار مولانا محمد اسماعیل ندوی ہیں، مدرسہ کی عمارت بھی دیدہ زیب اور خوبصورت ہے، یہ مسجد اور مدرسہ گویا خانقاہ ہیں، طالبین دور، دور سے آتے ہیں، ہفتہ اور اتوار کی شب میں متوسلین کا ہجوم ہوتا ہے، ماشاء اللہ شیخ، سادہ مزاج اور متبع سنت ہیں، علماء سے محبت فرماتے ہیں، فرنچ ہی بولتے اور سمجھتے ہیں اُردو زبان سے واقف نہیں، موصوف کے اہل تعلق میں ہندوستانی، پاکستانی، عربی النسل، یورپین اور کالے سبھی ہیں، یہاں عشاء کے بعد تزکیہ واحسان کے موضوع پر خطاب رکھا گیا تھا، جو کچھ سمجھ میں آیا، عرض کیا گیا، شیخ نے کچھ مسائل بھی دریافت کئے، یہاں گو مختصر قیام رہا، لیکن شیخ کی سادگی اور ان کے متعلقین کی دینی اور ایمانی کیفیت دیکھ کر طبیعت بہت مانوس ہوگئی۔

۲۸ اپریل کا وقت بہت ہی مشغول ومصروف گذرا، آج سارے پروگرام سینٹ ڈینس (Sf Denis) ہی میں تھے، صبح میں شمالی ری یونین کے علماء کا اجتماع تھا، اس میں خطاب کا موضوع تھا ''نئے مسائل اور ان کے حل کا طریقہ'' — نماز ظہر کے بعد مولانا خلیل احمد راوت کی دعوت پر مدرسہ انس بن مالک میں نوجوانوں سے خطاب تھا، ''راوت'' ری یونین میں ان خاندانوں میں ایک ہے، جو وہاں کی تجارت پر چھایا ہوا ہے، مولانا جامعہ فلاح دارین ترکیسر گجرات کے مہتمم ہیں، اور یہاں بھی انھوں نے طلبہ وطالبات کے لئے ان اوقات میں تعلیم کا نظم رکھا ہے، جو ان کی اسکول کی تعلیم سے فارغ اوقات ہیں، راقم الحروف نے اس اجتماع میں اس بات کو خصوصی موضوع بنایا کہ دین سے صرف آخرت کی کامیابی متعلق نہیں، بلکہ یہ دنیا میں بھی ہماری ضرورت ہے، خطبہ کے بعد نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے بکثرت سوالات کئے، زیادہ تر سوالات ان پروپیگنڈوں سے متعلق تھا، جو مغرب میں اسلام کے بارے میں کئے جاتے ہیں، طالبان کے موجودہ طرز عمل کے بارے میں بھی متعدد سوالات کئے گئے۔

اس پروگرام کے معاً بعد شہر کی ایک اور بڑی درسگاہ "مدرسہ تعلیم الاسلام" —— جہاں تقریباً اسکولوں اور کالجوں کے ڈیڑھ ہزار لڑکے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں —— میں طلبہ وطالبات کے اولیاء اور والدین سے خطاب رکھا گیا تھا، ری یونین کے تہذیبی پس منظر میں نوجوان اور ان کے اولیاء کے کردار کی بڑی اہمیت ہے اور چوں کہ اولیاء اپنے بچوں پر کوئی سختی نہیں کر سکتے، نہ ان کی سرزنش نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے اولیاء کے سامنے بڑے پیچیدہ مسائل ہوتے ہیں، جن کو حکمت وتدبیر ہی سے حل کیا جاسکتا ہے، چنانچہ خطبہ کا موضوع "بچوں کی تربیت اور اس کے اسلامی اُصول" رکھا گیا تھا۔

خطاب کے بعد ڈھیر سارے سوالات آئے، جن سے اندازہ ہوا کہ جو ماں، باپ اپنے بچوں کو دین پر قائم رکھنا چاہتے ہیں، ان کو کیسی مشکلات کا سامنا ہے؟ اس مدرسہ کے ذمہ دار مولانا معصوم ملا ہیں، جو برطانیہ کے ایک دارالعلوم سے فارغ ہیں، اس لئے انگریزی اور فرنچ زبان سے بہتر طور پر واقف ہیں، فکر میں توازن بھی ہے اور سعی ومحنت کا جذبہ بھی۔

اس شہر کی دوسری بڑی مسجد "مسجد المدینہ" ہے، آج عشاء کے بعد مردوں اور خواتین سے اسی مسجد کے ہال میں خطاب تھا، اور خطاب کا موضوع تھا کہ "احکام شرعیہ میں کیا کسی ایک مجتہد کی تقلید ضروری ہے؟ اور کیا حالات اور زمانہ کے تحت قدیم فقہاء کی آراء میں کوئی تغیر بھی ہوسکتا ہے؟" اس خطبہ میں بھی علماء اور دانشوروں، نیز نوجوان اور خواتین کی اچھی خاصی شرکت تھی، خطبہ کے بعد دیر تک خطبہ کے موضوع اور دوسرے احکام فقہیہ کے متعلق سوال وجواب کا سلسلہ رہا۔

۲۹ اپریل کو اتوار کا دن تھا، آج ری یونین کے ایک اور ساحلی شہر 'سینٹ آندرے' (St Andre) کی مرکزی مسجد میں دعوت وتبلیغ کے کام کرنے والوں کا پورے جزیرہ کی سطح پر خصوصی اجتماع تھا، جس میں نماز فجر کے بعد اس حقیر کا بیان رکھا گیا، چنانچہ ایمان، عمل صالح اور تواصی بالحق کے عنوان پر اللہ کی توفیق کے مطابق کچھ باتیں کہی گئیں، علماء کا تقاضا تھا کہ علماء

کے سوال و جواب کے لئے مخصوص ایک علاحدہ نشست رکھی جائے، چنانچہ ظہر تک شمالی ری یونین کے علماء کے لئے ایک خصوصی نشست رکھی گئی، جس میں مختلف احکام شرعیہ پر تبادلۂ خیالات کیا گیا، پھر اخیر میں اس حقیر نے مغربی معاشرہ کے مسائل کے پس منظر میں علماء کی ذمہ داریوں کی بابت کچھ عرض کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ نہ احکام منصوصہ میں مداہنت درست ہے اور نہ ان مسائل میں جمود جو کسی مخصوص عہد کے عادات اور عرف پر مبنی ہوں۔

ری یونین کا بندرگاہی شہر ''لی پورٹ'' (Le Port) ہے، یہاں کی مرکزی مسجد کے ہال میں آج عشاء کے بعد خطاب تھا، جس کا موضوع تھا ''فتویٰ — اہمیت اور ضرورت'' — خشک موضوع ہونے کے باوجود بحمد اللہ علماء کے علاوہ نوجوانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود تھی، تقریباً پون گھنٹہ راقم الحروف نے خطاب کیا پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، اور دیر گئے مجلس ختم ہوئی۔

آج ہم لوگوں کے لئے ناشتہ کا اہتمام جناب ایوب سلیمان نے کیا تھا، موصوف کا مکان سینٹ آندرے (St Andre) کی ایک خوبصورت پہاڑی پر واقع ہے، مکان کے گرد خوبصورت نوع بنوع پھولوں پر مشتمل باغیچہ ہے، اسی پُر فضاء اور خاموش ماحول میں ہم لوگوں نے ناشتہ کیا اور پھر یہاں سے ری یونین کے مشہور تفریحی مقام پر جانا ہوا، جس کے نام کے بارے میں اس وقت ذہن بے وفائی کر رہا ہے، لیکن جس کا قدرتی حسن و جمال اب بھی گویا آنکھوں میں ہے، مولانا اسماعیل سیدات ندوی کے ساتھ ہم روانہ ہوئے، راستہ میں دائیں، بائیں ہر طرف سبز دوپٹوں میں ملبوس، ہری، بھری سرو قد پہاڑیوں پر ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا، ان ہی پہاڑیوں کے دامن سے جابجا دودھ کی طرح سفید و شفاف آبشار بہہ رہے تھے، جن کی سامعہ نواز گنگناہٹ سے ایک سماں سا بندھ رہا تھا، اور ان آبشاروں کی وجہ سے جابجا چھوٹی، چھوٹی جھیلیں یا نہریں بھی بن گئی تھیں، ہم لوگ پہاڑوں کی مناسبت سے بل کھاتی ہوئی سڑکوں سے گذرتے ہوئے اور کچھ چھوٹے، چھوٹے شہروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے سب

سے اونچی پہاڑی پر پہنچے، یہاں طویل القامت درختوں کا ایک ہجوم سا تھا، اس زمین پر سبز اور نرم دوبھیاں اس طرح بچھی ہوئی تھیں کہ گویا قدرت نے سبز قالین بچھا دی ہے، یہاں رنگ برنگ کے خوبصورت بڑے پتوں والے پھول بھی بکثرت اور نہایت قرینہ کے ساتھ لگے ہوئے تھے، سامنے گہری وادیاں تھیں جس میں کہیں دو بالشت بھی سبزہ سے خالی زمین نظر نہیں آئی اور ان پہاڑوں کے سینے پر جا بجا آبشار مچلتے نظر آتے تھے، سبک خرام ہواؤں کا قافلہ مستقل گذرتا اور ہر طرف خنکی بکھیرتا جاتا، ان سبزہ زاروں پر سورج کی سنہری کرنیں بھی بڑا حسین منظر پیدا کر رہی تھیں۔

اس پہاڑی پر درخت کے اتنے گھنے سائے ہیں کہ درختوں کے جھرمٹ کے درمیان کہیں دھوپ نظر نہیں آتی، اس میں جا بجا لکڑی کے بینچ اور میز ہیں اور کہیں کہیں پتھروں کو جوڑ کر چولھے بنا دیئے گئے ہیں، تفریح کرنے والوں کے قافلے آتے ہیں، یہیں پکنک مناتے ہیں اور پورا دن گذار کر واپس جاتے ہیں، میں نے ان خوبصورت درختوں، ان کی گھنی چھاؤں، اور پھیلے ہوئے سبز مخملی میدانوں نیز تا حد نگاہ گہری سرسبز وشاداب وادیوں اور اس پر رواں دواں آبشار کی لہروں کو دیکھا، تو خیال ہوا کہ خدا نے اس حقیر دنیا کو اتنا کچھ سجایا اور سنوارا ہے اور اس میں نگاہ کے سرور اور دل کی فرحت کے اتنے سامان رکھے ہیں، تو جنت جو عیش وعشرت کی اصل جگہ اور مسرت وشادمانی کا اصل مقام ہے، وہ کس قدر خوبصورت اور حسین ہوگی؟ اگر انسان دنیا کے ان تفریحی مقامات کو نگاہ عبرت کھول کر دیکھے تو وہ دنیا میں آخرت کو پا سکتا ہے۔

۳۰ اپریل کو مجھے شمالی ری یونین سے جنوبی ری یونین کی طرف جانا تھا، برادرم جناب محمد اسلم، —— جنھوں نے پیرس یونیورسٹی سے علم الاجتماع میں ڈاکٹریٹ حاصل کیا ہے اور ری یونین میں مسلم نوجوانوں کا ایک جریدہ نکالتے ہیں جو فرانسیسی زبان میں ہے —— وہ اور جناب یاسین صاحب نیز ایک بزرگ دوست حافظ امین الدین ہمارے ساتھ تھے، ہم لوگ پہلے، سینٹ گیلس (St Gilles) پہنچے، یہاں ہم لوگوں نے سمندر کے ساحل پر وہاں کا مشہور مچھلی

گھر دیکھا، جس میں رنگ برنگ کی چھوٹی بڑی، خوبصورت مچھلیاں پانی میں رکھی گئی ہیں، ان کی شکل وصورت میں بھی خاصا تفاوت ہے، سمندر میں پائے جانے والے مختلف قسم کے ’’مرجان‘‘ کے نمونے بھی اس میں رکھے گئے ہیں جس سے خوبصورت زیورات بنتے ہیں، اور جس کا خود قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، اس میوزیم میں شارک نامی مچھلیاں بھی ہیں، جو آدم خور ہوتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ مچھلی ۱۰ میٹر تک لمبی ہوتی ہے، ہم لوگوں نے شارک کے بچے دیکھے جو ڈیڑھ، دو میٹر لمبے تھے۔

یہیں سمندر کے کنارے مختلف قسم کے بوٹس بھی ہیں، جو سمندر میں تفریح کا بہترین ذریعہ ہیں، اس میں ایک خاص قسم کے بوٹ وہ ہیں، جس کا عرشہ پانی کے اوپر اور بیٹھنے والوں کی نشستیں کئی میٹر پانی کے اندر ہوتی ہیں، ان کی دیواریں مضبوط اور شفاف گلاس کی ہیں، اس لئے سمندر کے اندر کی اشیاء صاف طریقہ پر نظر آتی ہیں، ہم لوگ اس میں تقریباً نصف گھنٹہ رہے اور کئی کیلومیٹر اندر گئے، اس کشتی میں سے سمندر کے اندر گہری کھائیاں، کہیں کہیں پہاڑ کی چوٹیوں جیسا فراز، لال، پیلی، نیلی، کالی، زعفرانی، چاندی کی طرح سفید، چوڑی اور گول، بڑی اور چھوٹی مچھلیاں نظر آتی تھیں، جگہ جگہ سطح سمندر سے پیوست مرجان، گویا قدرت کی ایک سے ایک نشانیاں، جنھیں دیکھ کر خدا کی قدرت پر یقین بڑھے اور جسے جان کر اللہ کی تخلیق اور اس کا کمال شنیدہ کے بجائے دیدہ ہوجائے، خدا نے کیسی نوع بنوع اور رنگ برنگ کی مخلوق پیدا کی ہے، پھر سمندر کی متلاطم موجوں کے درمیان ان کے رزق کا سروسامان کیا ہے، اور کیسی کیسی قیمتی اشیاء کو سمندر کے آغوش میں محفوظ کر رکھا ہے، ہر مخلوق دوسری مخلوق سے جداگانہ، ہر ایک کا رنگ دوسرے کے رنگ سے مختلف، ہر ایک کی خوراک دوسرے کی خوراک سے الگ، ان حیرتناک مناظر کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آیا: ’’سبحانک ربنا ما خلقت ھذا باطلاً‘‘۔

پندرہ، بیس منٹ کے بعد ہی دوران سر اور متلی کا احساس ہونے لگا اور میں عرشہ پر آ گیا، جہاں فرانسیسی ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا، سمندریات کے بارے میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں،

وہ مختلف مچھلیوں، سمندر کے اندر پیدا ہونے والے درختوں، مختلف سنگی ٹکروں اور سمندر کے اندر زمین کے نشیب وفراز اور جا بجا گہری کھائیوں کے بارے میں ہم لوگوں کو بیش قیمت معلومات فراہم کرتا رہا، بہرحال آدھ گھنٹے کے اس آبی سفر کے بعد ہم لوگ ساحل پر واپس آئے اور آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

ہماری منزل سینٹ پال (St Paul) نامی شہر تھا، جو جنوبی علاقہ کا سب سے اہم شہر ہے، یہاں نماز عشاء کے بعد ''مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات'' کے موضوع پر خطبہ تھا، یہ موضوع وہاں کے حالات کی روشنی میں بہت ہی اہم ہے، کیوں کہ اس جزیرہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت کم ہے، عام طور پر آبادیاں مخلوط ہیں، کئی عیسائی گھروں کے درمیان ایک، آدھ مسلم خاندان آباد ہے، اس لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قریبی تعلقات اور ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت کا رواج ہے، اس خطبہ میں بھی مردوں اور عورتوں کا قابل لحاظ اجتماع تھا، خطاب کے بعد لوگوں نے کثرت سے ایسے سوالات کئے، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات اور تہذیبی اُمور میں غیر مسلموں سے مشابہت سے متعلق تھے، حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے حالات کو براہ راست دیکھنے اور ان کے سوالات سننے کے بعد بہت سے ایسے گوشے ہمارے سامنے آئے جس نے ہمارے لئے غور وفکر کی نئی راہیں کھولیں۔

یکم مئی کو ساڑھے دس بجے 'دار العلوم اشرفیہ اسلامیہ' میں ہمارا خطاب رکھا گیا تھا، یہ دار العلوم ایک بلند قامت اور پُر فضاء پہاڑی پر واقع ہے، جب ہم لوگ سینٹ پال (St Paul) کے نشیبی حصہ سے گذر رہے تھے تو کسی قدر گرمی محسوس ہو رہی تھی، لیکن ایک، دو گھنٹہ کے بعد کالے کالے بادل ان اونچی، اونچی پہاڑیوں سے ٹکرانے لگے، معلوم ہوا کہ یہاں روزانہ ہی دو پہر کے بعد بادل چھا جاتے ہیں، اور قریب قریب روز بارش ہوتی ہے، دار العلوم میں مردوں اور خواتین کا بہت بڑا مجمع تھا، تقریباً سات، آٹھ سو مرد تھے، یہ وہاں کے لحاظ سے بہت بڑی

تعداد سمجھی جاتی ہے، حاضرین میں علماء اور جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی اچھی خاصی تعداد تھی، یہ اس جزیرہ میں اعلیٰ اسلامی اور عربی تعلیم کی واحد درسگاہ ہے، جس میں جزیرہ ری یونین کے علاوہ فرانس الجزائر، مراکش، مدغاسکر اور جزائر قمر وغیرہ کے طلباء ہیں، طلبہ میں حنفی، مالکی اور شافعی تینوں مذاہب سے تعلق رکھنے والے لڑکے ہیں، نصاب تعلیم میں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ذریعہ تعلیم عربی زبان میں اور ابتدائی کتابوں کے اسباق فرنچ زبان میں ہوتے ہیں، نصابِ تعلیم ہندوستان کے مروجہ درس نظامی سے کسی قدر مختلف ہے، یہ دارالعلوم کئی ایکڑ کی وسیع زمین میں واقع ہے، اصل میں یہ ملیٹری ہاسٹل تھا، جس میں فوجیوں کی رہائش گاہیں اور ان کی ضروریات کے مطابق عمارتیں تھیں، دارالعلوم کے ذمہ داروں نے بہت ہی خطیر رقم دے کر اسے حاصل کرلیا ہے، جو کئی بڑے ہال، تمام عصری سہولتوں سے آراستہ کچن اور رہائشی کمروں پر مشتمل ہے، ہر کمرہ میں تین یا چار پلنگ طلبہ کے ہیں، اور اسی سے مربوط حمام اور دوسری سہولتیں ہیں، برصغیر کے مدارس کی طرح یہ دارالعلوم بھی ذمہ داروں کے حوصلہ و ہمت کی زندہ مثال ہے، کیوں کہ اس زمین کی خریداری کا معاملہ نہایت ہی کسمپرسی کی حالت میں طے کیا گیا تھا، لیکن اب اس کی قیمت کی ادائیگی قریب التکمیل ہے، میں نے دارالعلوم اور اس کا ماحول دیکھ کر ذمہ داروں سے کہا کہ یہ مغربی ثقافت کے اس جزیرہ میں اسلامی ثقافت کا ایک الگ جزیرہ ہے، جناب انور صاحب اس دارالعلوم کے صدر ہیں، اور مولانا ابراہیم ڈوڈا کیا (فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی) اور مولانا زکریا گنگات (فاضل دارالعلوم، جنوبی افریقہ) دارالعلوم کے تازہ دم، حوصلہ منداور نوجوان منتظمین اور کرتا دھرتا ہیں۔

یہاں ظہر سے پہلے مجھ سے علم دین اور علم دنیا کے باہمی ارتباط پر خطاب کے لئے کہا گیا تھا، میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں علم دین اور علم دنیا کے نام سے علم کی کوئی تقسیم نہیں پائی جاتی، بلکہ اسلام کی نظر میں علوم دو طرح کے ہیں، علم نافع اور علم غیر نافع، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ سائنس ضروریات زندگی فراہم کرتی ہے اور دین ان کو استعمال کرنے

کا طریقہ بتلاتا ہے، اس لئے یہ دونوں علوم ایک دوسرے کا تکملہ ہیں، نہ کہ ایک دوسرے کی ضد؛ اس لئے سائنس اور ٹکنالوجی جس قدر ترقی کرے گی، دین اور علم دین کی ضرورت اسی قدر بڑھتی جائے گی۔

دارالعلوم ہی میں نماز ظہر کے بعد جنوبی ری یونین کے علماء کی نشست بھی رکھی گئی تھی، جس میں اکثر معمر و نوجوان علماء شریک تھے، یہ مختلف درسگاہوں کے فضلاء تھے، یہ نشست عصر تک جاری رہی اور سوال وجواب کا سلسلہ رہا —— آج شب میں جزیرہ کے ایک اور شہر سینٹ جوزف (St Joseph) جانا ہوا، یہاں عشاء کے بعد مردوں اور خواتین کا ایک عمومی اجتماع تھا، جس میں خطاب کے لئے موضوع رکھا گیا تھا: ''دین اور اتباع دین سے مراد'' —— مسلسل سفر، خطاب اور ملاقاتوں نے تھکا کر رکھ دیا تھا، اس لئے میں نے مختصر گفتگو پر اکتفاء کیا۔

۲؍مئی کو سینٹ پیر (St Pierre) جانا ہوا، یہاں عصر کے بعد نوجوانوں سے خطاب تھا، انبیاء کی دعوتوں کے فروغ میں نوجوانوں کا کیا کردار رہا ہے اور اس ملک کے حالات کے تناظر میں مسلمان نوجوانوں کو کیا کردار ادا کرنا چاہئے؟ اس پر روشنی ڈالی گئی، پھر مغرب بعد ہم لوگ سینٹ لیویس (St Lovis) گئے، یہاں عشاء کے بعد ''مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور موجودہ حالات'' پر خطاب تھا، یہاں بھی مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد موجود تھی، اور خطاب کے بعد کافی دیر تک سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔

جزیرہ کا ایک اہم شہر سینٹ پیر (St Pierre) ہے، ۳؍مئی کی تاریخ ہمارے میزبانوں نے اس شہر کے لئے مخصوص رکھی تھی، یہاں ظہر سے پہلے خواتین سے خطاب کا موقع ملا، جس کا موضوع تھا، ''اسلام اور عورتوں کے حقوق اور سماجی زندگی میں ان کا دائرۂ کار'' —— ظہر کے بعد اسلامی مرکز ری یونین کا معائنہ اور مرکز کے ذمہ داروں سے گفتگو تھی، یہ مرکز شہر کی عظیم الشان جامع مسجد سے متصل ایک خوبصورت عمارت میں قائم ہے، اسی مرکز سے مسلمانوں کے معاشرتی مسائل —— نکاح وطلاق، خلع وغیرہ —— کے معاملات طے ہوتے ہیں، اور رؤیت

ہلال کا اعلان ہوتا ہے، مولانا سعید انگار مرکز کے صدر ہیں، اور مولانا اسحاق گنگات اس کے فعال ذمہ داروں میں ہیں، مرکز نے اسلامی موضوعات اور خاص کر بچوں کی نصابی ضروریات کے لئے فرانسیسی زبان میں متعدد کتابیں شائع کی ہیں اور فرنچ زبان میں یہاں سے ایک ماہنامہ بھی ''الاسلام'' کے نام سے نکلتا ہے، ادارہ بہت سے نومسلموں اور قدیم مسلمانوں کو جو فرنچ زبان بولتے ہیں، اپنی طرف سے مفت کتابیں فراہم کرتا ہے، یہ اس کی خدمت کا نمایاں پہلو ہے، میں نے ترسیل کتب کا رجسٹر دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگوں نے اس اسلامی سنٹر سے استفادہ کیا ہے، عصر بعد جزائر القمر کے کالے مسلمانوں کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا، یہ لوگ سیاہ فام عرب نسل سے تعلق رکھتے ہیں، لباس پوشاک میں عربیت باقی ہے، لیکن ان میں سے چند ہی لوگ اب عربی زبان سے واقف ہیں، عام طور پر انھوں نے فرنچ زبان کو اختیار کر لیا ہے، اس نشست میں مردوں کے علاوہ پردہ میں بہت سی خواتین بھی موجود تھیں، مختصر ملاقات اور تعارف کے بعد عملاً یہ مجلس سوال و جواب میں تبدیل ہوگئی اور لوگوں نے بکثرت وہاں کے حالات کے پس منظر میں سوالات کئے، یہ حضرات چوں کہ مالکی اور شافعی ہیں، اس لئے اس کو ملحوظ رکھ کر انھیں جواب دیا گیا۔

آج عشاء کے بعد شہر کی کشادہ اور بہت ہی خوبصورت، جامع مسجد کے ہال میں خطاب تھا اور اس خطاب کا موضوع بھی ''مسئلہ تقلید'' ہی تھا، پروگرام میں مرد اور خواتین دونوں شریک تھے، اور حسب معمول لوگوں نے کافی سوالات کئے اور دیر گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا —— ہمارے میزبان خاص مولانا انس لالہ کا اصل شہر تاسپوں (Tampon) ہے، آج جمعہ کی نماز یہیں ادا کی گئی، چنانچہ جمعہ سے پہلے یہاں مختصر خطاب ''تقویٰ'' کے موضوع پر ہوا، عصر کے بعد ایک خصوصی نشست خواتین کے سوال و جواب کے لئے رکھی گئی، اس میں خواتین بڑی تعداد میں شریک ہوئیں اور انھوں نے بہت سے سوالات کئے، یہ سوالات زیادہ تر سماجی زندگی میں عورتوں کے دائرہ کار، پردہ، لباس و پوشاک اور مغربی ثقافت کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہونے

والے تہذیبی مسائل سے متعلق تھے، آج عشاء کے بعد تجار اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے خطاب تھا، جس میں اصل موضوع ''تجارت اور سرمایہ کاری کے اُصول'' تھا، اس پروگرام میں بھی مردوں اور عورتوں کی شرکت تھی، فرانسیسی قوانین کی وجہ سے تجارت اور کاروبار میں بمقابلہ ہندوستان کے وہاں زیادہ پیچیدگیاں ہیں، اس پس منظر میں بہت سے سوالات اُٹھتے ہیں، البتہ بینکوں نے وہاں بعض ایسی صورتیں بھی فراہم کی ہیں، جس میں سودی قرض سے بچا جاسکتا ہے، اور براہ راست بینک سے سامان خریدا جاسکتا ہے، یہ ایسی صورت ہے جو شرعاً جواز کے دائرہ میں آتی ہے۔

۵مئی کو احباب نے ری یونین کے بلند قامت اور ہولناک کوہ آتش فشاں کو دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا، ہم لوگ تامپو سے چلے اور سینٹ پال (St Paul) ہوتے ہوئے مختلف پہاڑی راستوں سے گذر کر اس مقام پر پہنچے، جہاں ابتداءً آتش فشاں واقع تھا اور جو بہت عرصہ پہلے بند ہو چکا ہے، یہ علاقہ بالکل خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر مشتمل ہے، آگ کے لاوے پھوٹنے کی وجہ سے جگہ جگہ گہری اور خوفناک کھائیاں ہیں، پتھر یا تو سیاہ ہیں، یا پکی اینٹوں کی طرح سرخ اور جلے ہوئے کوئلے کی طرح ہلکے اور کمزور، یہ ایک بہت وسیع علاقہ ہے جو کسی زمانے میں آتش فشاں کا مرکز تھا، یہاں سے آگے گذر کر ریت سے بھری ہوئی وادی ہے، جس کو پار کر کے ہم لوگ دوسرے پہاڑی سلسلہ پر چڑھے، اس حصہ میں کچی سڑک ہے، یہ چڑھائی کا سلسلہ اس پہاڑی پر ختم ہوتا ہے، جو اس وقت زندہ آتش فشاں ہے، اور موقع بہ موقع اُبلتا رہتا ہے، آتش فشاں کے مرکز سے کسی قدر دور احاطہ کر دیا گیا ہے، سیاح اسی احاطہ کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر اس لرزا دینے والے مناظر کو دیکھتے ہیں، ابھی دو تین ماہ پہلے بھی آتش فشاں ابل پڑا تھا، جس وقت آگ کے لاوے اُبلتے رہتے ہیں، اس وقت کئی کیلومیٹر دوری سے اس منظر کو دیکھنا ممکن ہوتا ہے، دور دور تک شعلہ بداماں پتھر کے ٹکرے گرتے رہتے ہیں، جب ہم لوگ گئے، تو پگھلے ہوئے پتھر پہاڑ کی چوٹی سے نیچے تک اس طرح بچھے ہوئے تھے، جیسے کسی

نے ربر کی روڈ بچھادی ہو، افسوس یہ مقام عبرت بھی تماشہ بیں طبیعتوں کے لئے ایک تماشا بن گیا ہے، اورلہوولعب اوراخلاق سوزی کے مناظر یہاں بھی نظر آتے ہیں، ہم لوگ جب یہاں پہنچے تو دیکھا کہ بڑی تعداد میں مشرق ومغرب سے آئے ہوئے سیاح، اپنی گاڑیوں کے ساتھ موجود ہیں اور بہت سے لوگ آتش فشاں پہاڑی کے ساتھ اپنی تصویریں کھینچارہے ہیں۔

واپس ہوتے ہوئے ہم لوگ پھر دارالعلوم کے پاس رکے اور آتش فشاں میوزیم دیکھنے گئے، میوزیم یوں تو جاتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا، لیکن معلوم ہوا کہ جس علاقہ میں آتش فشاں کے پہاڑ واقع ہیں، وہاں دوپہر کے بعد سیاہ بادل آجاتے ہیں، اس لئے میوزیم کا پروگرام واپسی میں رکھا گیا، یہ میوزیم بہت ہی معلوماتی ہے، اس میں پوری دنیا میں واقع آتش فشاں پہاڑوں کی تفصیلات اور وہاں کے جلے ہوئے پتھروں کے نمونے ہیں، خودری یونین —— 'جو آتش فشاں ہی کے ذریعہ وجود میں آیا' —— اس کی تفصیلات درج ہیں، اور پندرہ بیس منٹ کی ایک ویڈیو فلم ہے، جوری یونین کے ابھرنے والے آتش فشاں کی صورت گری کرتی ہے، جسے بہت بڑے اسکرین پر دکھایا جاتا ہے، اس میں کسی انسان کی تصویر شامل نہیں ہے، راقم الحروف کو اسے دیکھنے کا موقع ملا، آتش فشاں کے اُبلنے کا منظر اس قدر گھبرا دینے والا اور ہولناک ہے کہ زبان وقلم سے اس کی تصویر کشی ممکن نہیں، پتھر اس طرح جل، جل کر فضاؤں میں بکھر رہے تھے، جیسے کسی نے سخت تپش کے موسم میں دوپہر کے وقت، گرم آندھی کے درمیان، سوکھے ہوئے پتے سلگا دیئے ہوں اور یہ اُڑ اُڑ کر بکھر رہے ہوں، نیز وہ پتھر جو پگھل کر سرخ وزرد سیال کی صورت میں بہہ رہے تھے، وہ بعینہٖ اس طرح کہ جیسے کوئی دریا رواں ہو، جس کے مقابلہ میں زمین کی ہرشئی سوائے سمندر کے بے بس معلوم ہوتی تھی، اس وقت بے ساختہ قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ ''انسان اور پتھر یہ دونوں دوزخ کی آگ کا ایندھن ہوں گے'' **وقودھا الناس والحجارۃ** —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ستر درجہ زیادہ شدید ہوگی، جب دنیا کی اس کمتر آگ کا یہ حال ہے تو عالم آخرت کی آگ کا کیا حال

ہوگا؟؟ آتش فشاں گویا دنیا میں دوزخ کا ایک نمونہ ہے، جسے دیکھ کر دوزخ کے کرب و ہیبت اور الم انگیزی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، افسوس کہ انسان کی طبع غفلت شعار نے نشانہائے عبرت کو بھی سیر وتفریح کا سامان بنالیا ہے، اور جن نشانیوں کو دیکھ کر پتھر بھی پگھل جائیں، انسان کا جفاشعار اور عیش وعشرت کا خوگر دل انھیں دیکھ کر بھی نہیں پگھلتا —— ہمارا یہ سفر دوبارہ تامپو میں ختم ہوا، جناب سلیمان بھائی، مولانا انس لالہ، مولانا زکریا اور مولانا ابراہیم صاحبان کی رفاقت نے ہماری اس آمد ورفت کو بھی ایک علمی سفر میں تبدیل کردیا اور مختلف فقہی اور فکری مسائل پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہا۔

ری یونین سے کئی اخبارات نکلتے ہیں، جو فرنچ زبان میں ہیں، ہندوستان میں پندرہ روزہ یا ہفتہ وار اخبارات کا جو سائز ہوتا ہے، جیسے نئی دنیا اور بلٹز وغیرہ، ری یونین میں اس سائز کے روزنامے نکلتے ہیں، جن کی اچھی خاصی ضخامت ہوتی ہے، مثلاً ایک اخبار؟ **(Le Quotidien)** روزانہ ۶۴ صفحات پر شائع ہوتا ہے، اُردو اخبارات کے مروجہ سائز کے لحاظ سے گویا ۳۲ صفحات —— ڈاکٹر محمد اسلم جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ بھی فرنچ زبان میں مسلمان نوجوانوں کا پندرہ روزہ ترجمان نکالتے ہیں، جو وہاں بہت مقبول ہے، وہ اُردو زبان سے تو واقف نہیں، لیکن عربی میں بڑی حد تک گفتگو کرلیتے ہیں، انھوں نے میرا تفصیلی انٹرویولیا، جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات اور مغرب میں مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں زیادہ سوالات کئے اور مجھ سے فرانس میں بسنے والے مسلمان نوجوانوں کے لئے پیغام چاہا، میں نے خاص طور پر ان سے تین باتیں کہیں، ایک تو ری یونین میں جو مکاتب کا نظام ہے، اس کو تقویت پہنچانا ضروری ہے، دوسرے اُردو یا عربی زبان میں سے کسی ایک زبان کو سیکھنا چاہئے اور تیسرے علماء سے اپنے ارتباط کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے، تاکہ مغربی تہذیب اور الحادی فکر کے غلبہ کی وجہ سے شکوک وشبہات کے جو کانٹے نئی نسلوں کے ذہن میں چبھ رہے ہیں، وہ ان کا مداوا کرسکیں۔

بحیثیت مسلمان ہم دنیا کے جس خطہ میں بھی پہنچیں، نگاہ عبرت کھلی رکھنی چاہئے

اور دیکھنا چاہئے کہ کیا چیز لینے کی ہے اور کیا چیز نہیں لینے کی؟ — مغربی اقوام میں خامیوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسی خوبیاں بھی ہیں، جن میں مشرق اور ایشیاء ابھی بہت پیچھے ہے، جیسے ڈسپلین کی پابندی، صفائی ستھرائی، ایسی باتوں سے بچنا جو دوسروں کے لئے باعث اذیت ہوں، خوش اخلاقی اور خوش کلامی وغیرہ، میں نے دیکھا کہ لوگ ٹریفک قواعد کی اتنی پابندی کرتے ہیں کہ ہم لوگ شاید اتنی پابندی مذہبی احکام کی بھی نہیں کرتے، گاہک اگر پچیس سامان دیکھ کر ایک بھی نہ لے تو دوکاندار ذرا گرانی محسوس نہیں کرتا، لوگ سواریوں میں ہوں یا فٹ پاتھ پر یا پارکوں میں، کچڑا وغیرہ اپنی جگہ ہی ڈالنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس لئے سڑکیں اور فٹ پاتھ ایسے صاف نظر آتے ہیں کہ ہندوستان میں اکثر لوگ شاید اپنے دیوان خانے اور رہائشی کمرے بھی اتنے صاف ستھرے نہیں رکھتے ہوں۔

یہ ایک پہلو ہے، دوسرا رُخ تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کا ہے، یورپ میں ایک مدت تک حکومت اور چرچ کے ٹکراؤ کی وجہ سے لوگوں میں مذہب سے ایک طرح کی نفرت پیدا ہوگئی ہے، فرانس چوں کہ کلیسا کی چیرہ دستیوں سے زیادہ دوچار ہوا ہے، اور انقلاب فرانس ہی کو سترہویں صدی کے انقلاب کا نقطۂ آغاز کہا جاتا ہے، اس لئے یہاں الحاد اور مذہب بے زاری دوسری اقوامِ یورپ سے نسبتاً زیادہ ہے، آزادیٔ نسواں کی تحریک نے عورتوں کو پوری طرح سڑکوں اور بازاروں میں لا کھڑا کیا ہے، اس کی وجہ سے بے حیائی حد بیان سے بھی ماورا ہے، سمندر کے ساحلوں اور پارکوں میں ایسے حیا سوز مناظر نظر آتے ہیں کہ انسان اور حیوان کے درمیان خط امتیاز کھینچنا دشوار ہوجاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ انھیں لباس سے اِلرجی سی ہے، اور عورتیں جو کچھ لباس پہنتی ہیں، ان کا بھی اصل مقصد بے لباسی ہے، بظاہر اس کو عورتوں کی آزادی کا نام دیا گیا ہے، لیکن اپنے نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے یہ حیا باختہ تہذیب عورتوں کے لئے سامان تذلیل ہے، مردوں نے اپنے لباس باقی رکھے ہیں اور عورتوں کے لباس اتروادیئے ہیں اور انھیں اپنی تجارت وتفریح طبع اور تعیش کا ایسا سامان بنالیا ہے کہ جب دل

بھر جائے اس سے کفارہ کش ہو جائیں۔

اس کی وجہ سے خاندانی نظام بکھر چکا ہے، نکاح کی شرح سے زیادہ طلاق کی شرح ہے، میاں، بیوی اور والدین و اولاد کا تعلق خود غرضانہ تعلق بن گیا ہے، اس لئے جوں ہی لذت کوشی کا دور ختم ہوتا ہے، میاں بیوی کے تعلق میں گرم جوشی باقی نہیں رہتی، ماں، باپ جب بوڑھے ہوتے ہیں، تو عمر رسیدہ لوگوں کے لئے بنے ہوئے ہاسٹل میں رکھ دیئے جاتے ہیں، جہاں سال میں ایک دن یوم والدین کے موقع سے ان کے بچے ان سے ملنے جاتے ہیں، سال بھر انتظار کی گھڑیاں گن گن کر ماں، باپ اس دن تک پہنچتے ہیں، لیکن شام ڈھلتے ہی بچے انھیں داغ فراق دے کر رُخصت ہو جاتے ہیں، خاندانی نظام کے بکھر جانے اور باہمی تعلقات کے ایثار اور بے غرضی کے جذبات سے خالی و عاری ہونے کی وجہ سے بچوں کی پرورش اب لوگوں کے لئے بوجھ بن چکی ہے، اس لئے اسقاطِ حمل اور برتھ کنٹرول عام ہے، نتیجہ یہ ہے کہ کئی سالوں سے فرانس کی آبادی منجمد ہے، شرح پیدائش میں مسلسل کمی ہوتی جارہی ہے، البتہ شرح اموات کی کمی کسی قدر اس کی تلافی کرتی ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ فرانس کی حکومت زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب دے رہی ہے، اور ہر بچہ کی پیدائش پر حکومت کی جانب سے وظائف دیئے جاتے ہیں، لیکن خاندانی نظام کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے، بچوں کی پرورش لوگوں کو بوجھ محسوس ہوتی ہے، اس لئے حکومت کی ترغیبات کے باوجود اس رجحان میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہودیوں نے ایک خاص منصوبہ کے تحت اہل مغرب کو (جن کی غالب اکثریت عیسائیوں کی ہے) ایسے حالات سے دوچار کر دیا ہے کہ وہ زندگی کے مسائل اور اپنے حالات کے بارے میں کم سے کم سوچ سکیں، چنانچہ لوگ ہفتہ میں پانچ دنوں انتھک محنت کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ وقت کام کر کے، پیسے حاصل کرتے ہیں، اور دو دن ہفتہ و اتوار شبستان عشرت سجاتے ہیں، نائٹ کلبوں کو آباد کرتے ہیں، سمندر کے ساحل اور پارکوں میں رقص و سرود کے بازار گرم کرتے ہیں اور ایسی سرمستیوں میں اپنا وقت گذارتے ہیں کہ گویا یہ لذت و سرور عیش

وطرب کی آخری شام ہو کہ اگر ایک لمحہ بھی کھو گیا تو پھر وصول نہ ہو سکے گا، اس صورت حال نے عام باشندگان ملک کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور اپنی نسلوں کے مستقبل کے بارے میں بے فکر بنا کر رکھ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مغربی معاشرے کو دیکھنے کے بعد اسلام کے سماجی نظام کی قدر و قیمت دلوں میں بڑھ جاتی ہے۔

ری یونین میں مسلمانوں کے سلسلہ میں دو باتیں بہت بہتر محسوس ہوئی، ایک تو ان کا نظام مکاتب جو ہر مسجد کے ساتھ قائم ہے، ان مکاتب کی نہایت، کشادہ، وسیع، تمام سہولتوں سے آراستہ کئی منزلہ عمارتیں ہیں، عام طور پر مکتب سے چھوٹے بچوں کی ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم کی طرف ذہن جاتا ہے، لیکن یہاں مکاتب میں پرائمری اسکولوں سے یونیورسٹی کی سطح تک کے طلباء آتے ہیں، مکاتب کے تعلیمی اوقات اسکولوں کے تعلیمی اوقات کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں، مسلمانوں کو یہاں ابتدائی ناظرہ وغیرہ سے لے کر حفظ قرآن مجید، سیرت، فقہ، قرآن کی کچھ سورتوں کے ترجمے، احادیث کے ترجمے، ابتدائی عربی زبان وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، اور بعض مکاتب میں ڈیڑھ، دو ہزار طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں، اسلام کے بارے میں انھیں کافی معلومات ہیں، اور مغربی سماج کے مطابق ہر بات کے بارے میں ان کے یہاں ایک کھوج سی ہے، بعض مکاتب میں پندرہ، بیس اساتذہ ہیں، ان اداروں نے بچوں کی دلچسپی کی چیزیں بھی رکھی ہیں، گیمس کا نظم بھی رکھا ہے، نئی نسل کو دین پر باقی رکھنے میں ان مکاتب کا بڑا حصہ ہے، گجرات کے مسلمان اس سلسلہ میں نمونہ کا درجہ رکھتے ہیں کہ وہ جہاں گئے وہاں انھوں نے اپنا مکان اور اپنی دوکان بنانے سے پہلے اپنی نسلوں کے دین و ایمان کی فکر کی اور مساجد و مکاتب قائم کئے۔

ان مسلمانوں کی دوسری قابل تقلید چیز تجارت کی طرف ان کی توجہ ہے، یہاں گو ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں زیادہ فرقہ وارانہ تنگ نظری نظر نہیں آتی، لیکن مسلمانوں نے خاص طور پر تجارت کو اختیار کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اور چینی نژاد لوگ معیشت پر

حاوی ہیں، مسلمانوں کی آبادی کا فیصد صرف چار سوا چار فیصد ہے، لیکن تجارت میں ان کا حصہ بہت نمایاں ہے، ہندوستان اور اس جیسے ملکوں میں اس پر توجہ کی ضرورت ہے، ملازمت میں تو تعصب اور تنگ نظری کا برتاؤ ممکن ہے، لیکن انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ خریدتا اسی دوکان سے ہے، جہاں سامان بہتر اور مناسب قیمت پر ملتا ہو، اگر اس اُصول کو اپنا کر مسلمان تجارت کا راستہ اختیار کریں تو شاید انھیں حکومت سے اپنے افلاس پر گلہ نہ کرنا پڑے، اور معاشی طاقت کی وجہ سے ملک میں ان کا وزن محسوس کیا جائے۔

دینی مدارس اور علماء کے لئے ایک اہم بات یہ ہے کہ وہاں علماء فرنچ زبان سے واقف ہیں، خود میرے خطبات اور خطابات کے ترجمے مولانا انس لالہ، مولانا محمد معصوم ملا، مولانا محمد بھگت، مولانا محمد پٹیل نے ترجمے کئے، لوگوں کا تاثر تھا کہ یہ حضرات بہت اچھی فرنچ بولتے ہیں، اس کی وجہ سے وہاں علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان فاصلہ نہیں ہے، ہندوستان میں علماء کے انگریزی زبان نہ جاننے کی وجہ سے ان کے اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہوگئی ہے، اس لئے یہ وقت کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس میں انگریزی زبان پر توجہ دی جائے، تاکہ وہ نام نہاد دانشوروں سے برابر کی سطح پر گفتگو کرسکیں، اور اپنے عہد کی زبان اور اُسلوب میں ان کو اپنی بات سمجھا سکیں، خدا کرے ہندوستان کے دینی مدارس جلد اس حقیقت کی طرف توجہ دیں!

آخری چند دنوں سینٹ لیو (St Lev) میں جناب سلیمان پٹیل صاحب کے مکان پر شب کا قیام رہا، یہ مکان عین ساحل سمندر پر واقع ہے، جس کی دیواروں پر سمندر کی لہریں بار بار بوسہ زن ہوتی رہتی ہیں، مکان کے سامنے اس احاطہ کے اندر ہی ایک پھولوں سے لدا، پھندا سبزہ زار ہے، رات کے وقت اس سبزہ زار میں کھانے کا نظم ہوتا، چاندی میں نہایا ہوا سمندر، اس کی اٹھکھیلیاں کھاتی ہوئی لہریں، خنک اور فرحت بخش ہوائیں، سبزوں کا یہ قدرتی قالین اور اس کے ساتھ ساتھ میزبان کا خلوص و محبت سے عطر بیز سلوک بڑا لطف دے جاتا،

—— جس دن سفر ہوا، اس شب میں سلیمان صاحب نے علماء ومعززین کی ایک بڑی تعداد کو عشائیہ پر مدعو کر لیا تھا اور نہایت ہی پر تکلف ضیافت کی تھی، جس میں کھانے، پینے میں مشرق ومغرب دونوں ذوق کی رعایت تھی —— یہ آنکھوں کو لبھانے اور دل کو بہلانے والے مناظر خدا کی صناعی اور خلاقی پر ایمان بڑھاتے ہیں اور انسان سوچتا ہے کہ نہر بداماں بہشت جسے خدا نے اپنی عنایت خاص سے سنوارا اور سجایا ہے، وہ کس قدر خوش منظر اور روح پرور ہوگی!

ری یونین سے میری واپسی اس کے جنوبی شہر سینٹ پیر (St Pierre) کے ایر پورٹ سے ہوئی، یہ سمندر کے کنارے، بہت ہی چھوٹا سا ایر پورٹ ہے، ایر پورٹ پر جزیرہ کے جنوبی علاقہ کے تقریباً ۳۰، ۳۵ علماء اور معززین شہر آگئے تھے، سبھوں نے نہایت ہی محبت کے ساتھ الوداع کہا اور بار بار خواہش کی کہ آئندہ پھر آپ کا دورہ ہونا چاہئے، مولانا انس لالہ نے جب وداعی معانقہ کیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، واقعہ ہے کہ ان رفقاء اور مخلصین کی محبت کی وجہ سے ذرا بھی بیگانگت اور سفر کا احساس نہیں ہوا اور محبت وخلوص کے گہرے اور انمٹ نقوش کی سوغات لے کر میں ہندوستان واپس ہوا۔

❑ ❑ ❑ ❑

دودن جزیرۂ ماریشش میں

بحر ہند میں کئی چھوٹے چھوٹے جزائر پھیلے ہوئے ہیں، جو زیادہ تر براعظم افریقہ کے علاقوں میں واقع ہیں، انیسویں صدی میں جب مغربی مما لک نے ایشیاء اور افریقہ میں استعماری نظام قائم کیا اور ان پسماندہ مما لک کی آپس میں تقسیم کی تو فوجی نقطۂ نظر سے ان جزائر کی اہمیت بڑھ گئی، ان سے نہ صرف سمندری علاقہ میں آمد و رفت آسان ہوئی، بلکہ محفوظ فضائی اڈے اور جاسوسی کے لئے مناسب و موزوں مقامات بھی بڑی طاقتوں کو حاصل ہوئے، ان بڑی طاقتوں میں برطانیہ، فرانس اور پرتگال کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور عملاً یہ ایشیاء اور افریقہ کی تقدیر کے مالک بن گئے تھے۔

ان مغربی نوآبادیات میں ایک جزیرہ ''ماریشش'' بھی تھا، کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں مدغاسکر، جزائر قمر، ری یونین اور ماریشش وغیرہ ایک ساتھ تھے، لیکن آتش فشاں کی قہر سامانی نے انھیں ٹکڑا کر کے بکھیر دیا اور بیچ بیچ میں سمندر گھس آیا، اس طرح اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مختلف چھوٹے بڑے جزائر کی صورت اختیار کر لی، ماریشش میں بھی پہلے عرب جہاز رانوں کا قافلہ پہنچا، لیکن انھوں نے یہاں سے رختِ سفر باندھا، کیوں کہ یہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہیں آئی، پھر پرتگال آئے اور وہ بھی واپس ہو گئے، اس کے بعد فرانس نے باضابطہ اس کو اپنی کالونی بنایا، بلکہ اس خطہ میں اکثر جزائر پر فرانس نے قبضہ کر لیا، لیکن برطانیہ نے فرانس سے بزورِ طاقت اس جزیرہ کو چھین لیا اور اس طرح یہ برطانوی نوآبادی میں تبدیل ہو گیا، ۱۹۴۸ء کے بعد سے اس علاقہ میں آزادی کی تحریکیں چلنی شروع ہوئیں، چنانچہ مدغاسکر نے فرانس سے آزادی حاصل کی، جزائر قمر میں بھی بعض جزائر آزاد ہو گئے اور بعض نے فرانس کا حصہ بنے

رہنے کو ترجیح دی، ری یونین نے بھی فرانس کا حصہ بنا رہنا قبول کیا اور ماریشش نے ساٹھ کی دہائی میں برطانیہ سے آزادی حاصل کرلی۔

''ماریشش'' ری یونین سے بھی کسی قدر چھوٹا جزیرہ ہے اور اس کا رقبہ دوسو مربع میل بھی نہیں ہے، اس جزیرہ میں پہاڑ بہت کم ہیں اور زیادہ تر میدانی علاقہ ہے، یہاں گنے کی کاشت بڑی مقدار میں ہوتی ہے، کچھ سبزی اور ترکاری وغیرہ بھی ہوجاتی ہے، گنے کے کھیتوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں، اس لئے جہاز سے تاحدِ نگاہ کھیتوں کی لمبی لمبی قطاریں نظر آتی ہیں، ملک میں شکر کی صنعت ہے اور اب ٹکسٹائیل کی صنعت میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد ابتداءً یہ جزیزہ بہت پس ڈیگو کاریشیا پر قبضہ جمایا اور اپنا فوجی اڈہ بنایا تو فوجی مقاصد کے لئے ماریشش سے بھی ایک چھوٹا سا جزیرہ حاصل کیا، اس کے عوض امریکہ ''ماریشش'' کی معاشی مدد بھی کرتا ہے اور اس کی برآمدات کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کررہا ہے۔

میں جب ''ری یونین'' پہنچا تو وہیں معلوم ہوا کہ ''ماریشش'' کے علماء اور اہل دین بھی چند دنوں کا وقت چاہتے ہیں، چوں کہ مجھے ہندوستان جلد آنا تھا، لیکن گذرنا ''ماریشش'' ہی سے تھا، اس لئے ہم نے ماریشش میں دوروزہ قیام سے اتفاق کیا، چنانچہ ۹ مئی کو ری یونین کے شہر سینٹ پیر میں ماریشش کا جہاز پکڑا، یہ فرانسیسی جہاز تھا، کوئی ساڑھے گیارہ بجے جہاز اُڑا اور بارہ بجے ہم لوگ ماریشش کی فضاء میں ہوا کے دوش پر چل رہے تھے، فضاء سے یہ سفید اور صاف وشفاف، نیلے سمندر میں سرسبز وشاداب جزیرہ بڑا حسین منظر پیش کررہا تھا، مختلف جگہ چھوٹی بڑی آبادی، کہیں کہیں کوتاہ قامت پہاڑیاں اور باقی ہر چہار طرف گنے کے خوبصورت سجے سجائے اور سنوارے ہوئے کھیت نیز کہیں کہیں قدرآور ہرے بھرے درخت، ان کھیتوں کے درمیان سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

''ماریشش'' میں ایک ہی ایر پورٹ ہے، جو Maganan میں واقع ہے، اس

ایرپورٹ کا نام ''شیو ساگر رام غلام انٹرنیشنل ایرپورٹ'' ہے، ایرپورٹ بڑا نہیں، لیکن اس جزیرہ کی مناسبت سے اسے بڑا کہا جاسکتا ہے، ایرپورٹ بالکل ساحل سمندر پر واقع ہے اوراسے دومجاہدین آزادی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، ہمیں ایرپورٹ پر ہی ٹرانزٹ ویزا حاصل کرنا تھا، کبھی اس کارروائی کا تجربہ نہیں ہوتا تھا، اس لئے ذہن پر گرانی تھی، لیکن ''ری یونین'' ہی سے ہمارے ساتھ ایک سفید ریش، متشرع اور خلیق بزرگ کا ساتھ ہوگیا، جو حکیم اختر صاحب (کراچی) کے مجازِ بیعت ہیں، گو ان کی شہریت فرانس کی ہے، لیکن قیام زیادہ تر ماریشش میں رہتا ہے اور یہیں ان کی خانقاہ بھی ہے، موصوف ''ری یونین'' میں ایک دو جگہ میرے خطاب میں شریک تھے، اس نسبت سے بڑی شفقت کا معاملہ فرمایا، مسائل بھی پوچھتے رہے اور اصرار کرتے رہے کہ ماریشش میں یا تو انھیں کے یہاں قیام کروں یا کم سے کم کچھ دیر کے لئے ان کے یہاں جاؤں، افسوس کہ اس وقت ان بزرگ کا نام ذہن میں نہیں رہا۔

دوسرے ''ری یونین'' کے بعض مہربانوں نے بذریعہ فون ماریشش ایرپورٹ پر اپنے بعض اہل تعلق کو اطلاع بھی کردی تھی، چنانچہ جہاز سے اترتے ہوئے ایرہوسٹس نے انگریزی میں دریافت کیا کہ آپ ہی خالد سیف اللہ رحمانی ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، وہ تھوڑی دور میرے ساتھ گئی اور اس نے ایک مرد افسر سے ملاقات کرائی، یہ افسر مسلمان اور ہندی زبان سے واقف تھا، اس نے اور انھیں بزرگ رفیق سفر نے ویزا کی کارروائی انجام دی اور مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی، جوں ہی ایرپورٹ کے باہر آیا دیکھا کہ ایک لحیم وشحیم گہرے سانولے، وضع قطع میں متدین اور کسی قدر پست قامت نوجوان انتظار میں کھڑے ہیں، لپک کرآئے، نام پوچھا اور میرا سامان اُٹھا کر ساتھ لے چلے، یہ ''مولانا عبدالمطلب دکھت'' تھے، پاکستان کی ایک دینی درسگاہ کے فاضل ہیں اور ایرپورٹ کے قریب ہی لڑکیوں کی دینی درسگاہ چلاتے ہیں، درسگاہ کے بازو ہی میں رہائش گاہ ہے، چند ہی منٹوں میں ہم لوگ آپ کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے، نماز پڑھا، کھانا کھایا اور آرام کیا، عصر بعد موصوف شہر کی سیاحت کے لئے

لے کر نکلے، خود ان کی اچھی خاصی کاشت ہے، راستہ ہی میں ان کے فارم تھے، دیکھا کہ کچھ مرد اور خواتین مزدور کام میں مشغول ہیں، لیکن ان کی شان ہندوستانی مزدوروں سے بہت مختلف ہے، مزدور خواتین پینٹ شرٹ، پاؤں میں جوتے اور اس پر گھٹنے تک لانبے ربر کے موزے پہنے ہوئی ہیں، ہاتھ میں ربر کے دستانے ہیں، بعض نے کمر سے نیچے کپڑے کے اوپر ربر کے باریک غلاف لپیٹ رکھے ہیں، تاکہ کپڑے گرد وغبار سے پوری طرح محفوظ رہیں، سر پر ایسی ہیٹ ہے کہ سر ہی نہیں چہرہ اور گردن بھی دھوپ سے محفوظ رہے، اس شان واہتمام کے ساتھ کھیت میں مزدور کام کر رہے تھے، ہندوستان کے مزدوروں نے تو ابھی یہ ٹھاٹھ خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا، یہ بھی محسوس ہوا کہ وہاں زراعت میں مشینی آلات کا استعمال بمقابلہ برصغیر کے زیادہ ہے۔

ہم لوگ ان سبزہ زاروں سے گذرتے ہوئے سمندر کے کنارہ پہنچے، ماریشش کے سمندری ساحل اپنی خوبصورتی اور قدرتی حسن میں مشہور ہیں اور سیاحوں کا مرکز ہیں، ساحل پر کثرت سے سایہ دار درخت ہیں، لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ری یونین کے ساحل سمندر کی طرح یہاں بے حیائی اور عریانیت نہیں ہے، مغرب کے قریب ہم لوگ اپنی منزل پر واپس آئے، آج طبیعت میں بڑی تکان تھی، اس لئے عشاء سے کچھ پہلے تک آرام کیا، عشاء کی نماز بعد یہاں سے بیس کیلومیٹر دور ایک مسلم اکثریت آبادی میں واقع جامع مسجد میں خطاب تھا، عشاء سے پہلے ہم لوگ اس مقام کے لئے روانہ ہوئے، صاف ستھری، ہموار سڑکوں پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ یہ سفر طے پایا، افسوس کہ اب شہر کا نام حافظہ میں محفوظ نہیں ہے، یہاں بہت وسیع وعریض دو منزلہ مسجد ہے، اسی مسجد میں خطاب ہوا، یہ ماریشش کی دو تین بڑی اور زیادہ آباد مسجدوں میں ایک ہے، حاضرین کی کافی تعداد تھی، یہ حضرات صحیح طریقہ پر تو اُردو بولنے سے قاصر تھے، لیکن سمجھ رہے تھے، اس لئے ترجمان کی ضرورت پیش نہیں آئی، لوگوں نے کچھ سوالات بھی کئے، مسجد کے تحتانی ہال میں کچھ ضیافت کا بھی نظم تھا، جس میں شہر کے

سر برآوردہ لوگوں سے ملاقات کا پروگرام رکھا گیا تھا، یہاں بھی مختلف سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں سوالات کئے گئے، کچھ اَن دیکھے مخلصین —— جو پاکستان کے دینی مدارس کے فضلاء ہیں اور اس عاجز کی حقیر تالیفات کی نسبت سے واقف —— نے اپنے یہاں عشائیہ کا نظم کر رکھا تھا، عشائیہ پر متعدد علماء اکٹھا ہوگئے، یہاں بھی علمی مسائل پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ رہا اور رات دیر گئے ہم لوگ واپس ہوئے۔

۱۰ مئی کی صبح نمازِ فجر، استراحت اور ناشتہ کے بعد میزبان کے ساتھ ہم جامعہ عربیہ توحیدیہ کے لئے نکلے، یہ اس جزیرہ کا واحد دارالعلوم ہے، جو گرانڈ بوئیس (Grand Bois) نامی شہر میں واقع ہے، دارالاقامہ میں ساٹھ ستر طلبہ ہیں، زیادہ تر حفظ کرنے والے لڑکے ہیں، کچھ پرائمری کے اور کچھ ابتدائی عربی درجات کے ہیں، یہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مکمل عصری تعلیم بھی حاصل کرتے اور سرکاری امتحانات میں شرکت کرتے ہیں، مدرسہ کی دو منزلہ نہایت دیدہ زیب عمارت ہے، رہائشی کمرے نہایت معیاری اور عصری سہولتوں سے آراستہ ہیں، یہاں اساتذہ کے ساتھ نشست رہی، مدرسہ کے ذمہ دار جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فارغ ہیں۔

آج صبح ۱۰ بجے سے جمیعۃ العلماء ماریشش نے اپنے دفتر میں جزیرہ کے علماء کے ساتھ خصوصی نشست اور تبادلۂ خیال رکھا تھا، جمیعۃ کا دفتر ماریشش کی راجدھانی اور بندرگاہ ''پورٹ لوئیس'' (Port Lowis) میں واقع ہے، یہ ساحل سمندر پر چھوٹا، لیکن نہایت خوبصورت اور منصوبہ بند طریقہ پر بسایا ہوا شہر ہے، پارلیمنٹ، کورٹ، سکریٹریٹ وغیرہ کی عمارتیں قریب قریب ہی ہیں اور دیدہ زیب جدید طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں، یہ گھنا شہر ہے اور مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت ہے، بعض محلّہ جات میں تو صد فی صد مسلم آبادی ہے، ہم لوگ کسی قدر تاخیر سے ۱۱ بجے دفتر پہنچے، مفتی محمد نذیر الحق صاحب جو مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد کے فاضل ہیں، جمیعۃ کے صدر اور مولانا یونس منیر سکریٹری ہیں، علماء سے مختلف ملی مسائل پر گفتگو رہی، وہیں معلوم ہوا کہ

اس حقیر کی ''راہِ اعتدال'' کے پاکستان سے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، ماریشش میں اہل علم نے بڑی تعداد میں منگایا ہے اور اکثر علماء کے پاس موجود ہے۔

''جمیعۃ علماء ماریشش'' اس جزیرہ میں مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم ہے، جو علماء وائمہ کی تربیت، رؤیتِ ہلال کا اعلان اور دینی کتب کی مقامی زبان میں اشاعت کا کام کرتی ہے، یہاں ایک اسلامک فیملی کونسل بھی قائم ہے، جو فسخ نکاح وغیرہ کے مقدمات کے فیصلے کرتی ہے اور حکومت کی جانب سے اس کو ان مسائل میں قضاء بین المسلمین کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، البتہ مسلم پرسنل لا کو حکومت نے باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کیا اور مسلمان اس کے لئے کوشاں ہیں، اس کونسل میں مفتی محمد نذیر الحق صاحب اور ایک صاحب قضاء کا کام انجام دیتے ہیں، افسوس کہ ان صاحب کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے، خلع وتفریق کے بعض مسائل میں ان حضرات سے تبادلۂ خیال بھی ہوا، کاش ہندوستان کی حکومت بھی مسلمانوں کے لئے علماء وار بابِ افتاء کے تحت نظام قضاء کی تشکیل کرے، اس سے نہ صرف مسلمان خواتین کو سہولت ہوگی، بلکہ عدالت کا بوجھ کم ہوگا۔

یہاں سے ہم لوگ مختلف شہروں سے گذرتے ہوئے مولانا عبدالمطلب صاحب کے یہاں واپس آئے، ماریشش کی سڑکیں بہت عمدہ، صاف ستھری اور راحت بخش ہیں، گندگی اور کچرا کہیں نظر نہیں آتا، لوگ ٹریفک قواعد کے پابند ہیں، دکانوں میں بہت قرینہ سے سامان رکھا ہوتا ہے، ہندوستان کے مقابلہ گرانی ہے، معیارِ زندگی گو قریبی جزیرہ ری یونین سے کمتر ہے، لیکن بہت برا بھی نہیں، ری یونین کی طرح یہاں مفت تعلیم وعلاج اور بے روزگاری الاؤنس وغیرہ کی سہولت نہیں، تاہم ماریشش کے روپیہ کی قیمت ہندوستان سے زیادہ ہے، کرپشن بھی ہے، ری یونین اور ماریشش کے درمیان صرف ڈھائی تا تین سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے، لیکن رہن سہن، تہذیب وثقافت وغیرہ میں قریب قریب وہی فرق ہے جو مشرق ومغرب کے درمیان عام طور پر پایا جاتا ہے، ماریشش گویا ایک چھوٹا ہندوستان ہے، ہندوؤں کی اکثریت

ہے، اس کے بعد مسلمان، پھر عیسائی ہیں، اس وقت ملک کے وزیر اعظم ہندو اور صدرِ جمہوریہ مسلمان ہیں، وہاں ہندو بھائیوں کے گھروں پر سرخ و زعفرانی جھنڈے اور چھوٹا سا مندر بنانے کا رواج عام ہے، چرچ اور مسجدیں بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں، لیکن مختلف فرقوں کے لوگ آپس میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتے ہیں اور فرقہ وارانہ تناؤ کی کیفیت نہیں پائی جاتی، لباس و پوشاک پوری طرح ہندوستانی طرز کا ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے، عوامی زبان بگڑی ہوئی فرنچ ہے، اسکولوں میں دوسری زبان کی حیثیت سے ہندی اُردو اور عربی بھی پڑھائی جاتی ہے، باشندے عام طور پر ہندوستانی النسل ہیں، کچھ دوسری نسل کے لوگ بھی ہیں، ہندوستان سے جو مسلمان گئے ہیں وہ زیادہ تر گجرات اور بہار کے علاقہ بھوجپور کے ہیں، ایک زمانہ میں یہ ہندوستان کے مزدور اور غلام کی حیثیت سے لائے گئے تھے اور اب یہی ملک کی تقدیر کے مالک ہیں۔

اس بات سے بہت مسرت ہوئی کہ ماریشش میں مسلمانوں کا معاشی موقف بہتر ہے اور تجارت مسلمانوں اور چینیوں کے ہاتھوں میں ہے، بعض مارکٹیں ایسی ہیں جن میں غالباً صد فی صد مسلمانوں کی دکانیں ہیں، معاشی قوت کی وجہ سے سیاست میں بھی مسلمانوں کا وزن محسوس کیا جاتا ہے، اس جزیرہ کی آبادی بارہ لاکھ ہے، جس میں دو لاکھ مسلمان آباد ہیں اور ان کی سیاسی نمائندگی بھی قریب قریب اسی تناسب سے ہے، چنانچہ ساٹھ رکنی پارلیمنٹ میں دس مسلمان ارکان ہیں، مسلمانوں نے یہاں اپنی تہذیب وثقافت کو بھی بڑی حد تک بچایا ہے، البتہ ری یونین کی طرح یہاں مکاتب کا نظام مستحکم نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ہند و پاک میں مسلمان جس طرح گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف تیغ آبدار ہیں، یہی حال ماریشش میں بھی ہے، دیوبندی، بریلوی اختلاف کی آگ وہاں بھی سلگائی جاتی ہے اور یہ کام زیادہ تر ہندوستان سے جانے والے پیشہ ور اور مناظرہ باز مقررین ہی کیا کرتے ہیں، غالب ترین اکثریت احناف کی ہے، کچھ

گنے چنے سلفی حضرات بھی ہیں، لیکن تشدد اور بے اعتدالی کی وجہ سے ان کے درمیان بھی بڑی آویزشیں ہیں، جس وقت جمیعۃ علماء ماریشش کے دفتر پر علماء کے ساتھ میری ملاقات رکھی گئی تھی، معلوم ہوا کہ عین اسی وقت شہر کے ایک حصہ میں غیر مقلدین اور بریلوی حضرات کے درمیان مناظرہ جاری ہے، اس صورتِ حال سے قادیانی فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور وہاں سرگرم ہیں، گو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ علماء کی کوششوں سے ان کی سعی نامسعود بے نیل ومرام ہے، اس بات پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے کہ مسلمان اُمت کے مجموعی مفادات اور اسلام کی دعوت واشاعت کے بجائے حقیر گروہی مفادات اور اپنی مسلکی فکر کی تبلیغ ہی میں لگے ہوئے ہیں اور اس میں عوام کا کم علماء اور ذمہ داروں کا قصور زیادہ ہے، کاش مسلمان فراستِ ایمان سے کام لیں اور عالمی سطح پر ان کے گرد جو گھیرا ڈالا جا رہا ہے اسے محسوس کریں، وباللہ التوفیق وھو المستعان، ماریشش میں ماشاءاللہ تبلیغی جماعت کا کام بہتر اور مثبت طریقہ پر ہو رہا ہے۔

جمیعۃ علماءِ ماریشش کی خواہش تھی کہ سفر میں چند دنوں کی توسیع کی جائے اور وہ اس کا نظم کرنے کو تیار تھے، لیکن چوں کہ حیدرآباد جلد واپس ہونا ضروری تھا، اس لئے معذرت کی گئی اور ۱۰ مئی کی شب مولانا عبدالمطلب صاحب نے ماریشش ایرپورٹ پر مجھے الوداع کہا، مولانا موصوف بڑے خلیق، مہمان نواز اور علماء سے محبت رکھنے والی شخصیت ہیں، ماریشش کے قیام کے درمیان ہمیشہ نیازمندانہ اور شاگردانہ پیش آتے رہے، ان کی اہلیہ فرانسیسی نژاد نومسلمہ، پردہ کی پابند خاتون ہیں، وہ اچھی فرانسیسی لکھتی ہیں اور انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتی ہیں، میں نے انھیں اپنی تالیف ''عورت اسلام کے سایہ میں'' کا انگریزی ترجمہ پیش کیا، انھوں نے چند گھنٹوں میں اس کا بڑا حصہ پڑھ لیا، کتاب پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور فرنچ زبان میں اس کے ترجمہ کی اجازت مانگی، میں نے انھیں اس کی اجازت دے دی، اللہ تعالیٰ ان کی ایمانی کیفیت میں اضافہ فرمائے اور ان کو دعوتِ اسلام کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنائے۔

اس طرح ماریشش کا یہ مختصر سفر مکمل ہوا اور عبرت و موعظت کے کچھ پھول چن کر اور اُمت مسلمہ کی بعض کوتاہیوں کو دیکھ کر ان کانٹوں کی چبھن کو ساتھ لے کر ہندوستان واپس ہوا کہ محبت کی یہ سوغات اپنے ہم وطنوں کو پہنچا دوں۔

❑ ❑ ❑ ❑

جہاں مٹی سونا اُگلتی ہے!

یہ غالباً ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جنوبی افریقہ کے اہل علم اپنے بعض مسائل کے حل کے سلسلہ میں ہندوستان سے کسی صاحبِ نظر عالم کو وہاں بلانا چاہتے تھے، مولانا محمد منظور نعمانیؒ (مدیر الفرقان، لکھنؤ) کے مشورہ پر جمیعۃ علماء نٹال نے مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کو مدعو کیا، قاضی صاحب نے دو ماہ یہاں قیام فرمایا، مختلف دینی موضوعات پر ۲۰ سے زیادہ خطبات دیئے، قضاء سے متعلق فقہی ابواب کا علماء کو درس دیا، مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو درپیش فقہی مسائل میں ان کی رہنمائی کی اور یہی بعد کو اسلامک فقہ اکیڈمی کے قیام کا باعث بنا، قاضی صاحب نے مجھے وہاں سے ایک تفصیلی مکتوب بھی لکھا تھا، جس میں اس خطہ سے متعلق بہت سی تفصیلات مذکور تھیں، اسی وقت سے دل و دماغ کے صفحہ پر 'جنوبی افریقہ' کا نام گویا نقش ہو چکا تھا، قاضی صاحب نے شدید علالت کے دور میں ایک بار پھر اس خطہ کا سفر فرمایا، وہ اس وقت مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، لیکن میرے لئے اس وقت سفر دشوار تھا، اسی لئے رفاقت سے محرومی رہی۔

اکتوبر ۲۰۰۳ء میں مولانا عباس علی جینا (جوہانسبرگ) نے فیکس کے ذریعہ بھی اور فون کے ذریعہ بھی جنوبی افریقہ کے سفر کی دعوت دی، لیکن اس بار بھی مشاغل نے اس طویل سفر کی اجازت نہیں دی، یہاں کہ مولانا جینا نے دوبارہ سلسلۂ جنبانی شروع کی اور اگست یا ستمبر ۲۰۰۳ء میں سفر کی خواہش کی، میں خود ایک عرصہ سے اس دیار کے دیدار کا متمنی تھا، اس لئے اس دعوت پر لبیک کہا اور ۳ ستمبر کو دہلی سے براہ دبئی جوہانسبرگ کے لئے عازم سفر ہوا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا طویل ہوگا، دہلی سے دبئی کا سفر تو قابل تحمل تھا، لیکن دبئی سے جب

جہاز نے پرواز شروع کی تو پورے آٹھ گھنٹے لگ گئے، شب بیداری تو دلی سے دبئی تک ہی ہوچکی تھی، اب اس ''روز بیداری'' نے چور چور کردیا، ہندوستانی وقت سے اگلے دن آٹھ بجے شب اور مقامی وقت کے لحاظ سے ساڑھے چار بجے شام میں رختِ سفر کھولا دیا گیا۔

جوہانسبرگ انٹرنیشنل ایرپورٹ خوبصورت اور بین الاقوامی معیار کا ہے، کسی قدر تفکر بھی تھا کہ اگر خدانخواستہ میزبان نہ پہنچ سکے تو مقام اور زبان دونوں کی اجنبیت ''اجنبی شہر'' کو کہیں کا نہیں رکھے گی، اس بات سے خوشی ہوئی کہ ایرپورٹ کا عملہ خلیق اور فعال ہے، اس لئے جن کارروائیوں میں خلیجی ممالک میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں اور عملہ ایک بے وفا محبوب کی طرح اداءِ تغافل سے مسافروں کا خون کرتا رہتا ہے اور ہندوستان میں اس قدر نہ سہی، لیکن پائے استقامت میں تزلزل تو آ ہی جاتا ہے، یہی کارروائی چند منٹ میں ہوگئی، باہر نکلا تو حضرت مولانا جینا صاحب علماء کی خاصی تعداد کے ساتھ موجود تھے، یہ مختلف شہروں سے تعلق رکھتے تھے، ساتھ ہی ریڈیو اسلام کا عملہ بھی موجود تھا، مولانا جینا جمعیۃ علماء ٹرانزوال کے صدر ہیں، دبلے، پتلے دراز قد، کھلا ہوا رنگ، دودھ کی طرح سفید داڑھی، جبہ کے ساتھ دستار بھی، طبیعت کے مرنجا مرنج، خوش رو، خوش پوش، خوش مزاج اور خوش اخلاق، تواضع وانکساری کے تو گویا پیکر، شاید ڈھونڈنے سے بھی ایسے لوگ نہ ملیں، معاملہ فہم، متوازن فکر اور خورد نواز، پہلی ہی ملاقات نے مناسبت پیدا کردی، میں بہت تھکا ہوا تھا، مگر ریڈیو اسلام والوں کا اصرار تھا کہ اسی وقت ایک مختصر سا انٹرویو دے دیا جائے، تاکہ سامعین کو اس آمد کی اطلاع ہوجائے، چنانچہ انٹرویو دیا گیا۔

عصر کی نماز کا وقت ہوچکا تھا، معلوم ہوا کہ ایرپورٹ پر ہی مسلمانوں کے لئے نماز کا نظم ہے، ہم لوگ کچھ آگے بڑھے، تو نمایاں بورڈ لگے ہوئے تھے اور اس پر راستہ کی نشاندہی کے تیر کے ساتھ ساتھ Mosque for Muslims لکھا ہوا تھا، یہاں عام طور پر بیت الخلاء میں کموڈ سسٹم کا رواج ہے، لیکن ایرپورٹ پر چند بیت الخلاء مشرقی اور ہندوستانی انداز کے بھی ہیں، اور سائن بورڈ کے ذریعہ اس کو بھی نمایاں کیا گیا ہے، اس کے لئے Muslim Toilets کی

تعبیر اختیار کی گئی ہے، میرے لئے یہ بات قابل حیرت تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب محض ڈیڑھ فیصد ہے، اور اس ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ موجود ہیں، عیسائیوں کی تو غالب ترین اکثریت ہے، لیکن اس کے علاوہ یہودی اور ہندو بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں، لیکن ایر پورٹ پر صرف مسلمانوں ہی کے لئے یہ سہولت نظر آئی، اس کے کئی اسباب ہیں، ملک کی معیشت میں مسلمانوں کا اہم رول، برادران وطن سے بہتر روابط اور مسلمان ذمہ داروں میں دینی شعور، کاش! ہندوستان کے مسلمان اس پہلو پر غور کریں۔

یہیں عصر کی نماز ادا کی گئی، نماز گاہ میں ماشاء اللہ نماز اور وضو وغیرہ کا معقول انتظام ہے، یہیں ریڈیو اسلام پر انٹرویو دیا گیا، پھر یہاں سے مختلف علماء اپنے شہروں کو چلے گئے اور میں مولانا عباس علی جینا، مولانا محمد ابو بکا چھوی اور مختلف علماء کے ساتھ جمیعت علماء ٹرانزوال کے صدر دفتر پہنچا، یہ جوہانسبرگ کے ایک مرکزی اور مشغول مقام پر واقع ہے، جنوبی افریقہ میں جمیعۃ علماء کے کام کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، سب سے اہم بات جو میں نے محسوس کی، وہ یہ ہے کہ یہاں کے علماء نے اپنے آپ کو مدارس اور مساجد تک محدود نہیں کرلیا ہے، بلکہ وہ ہمہ جہت خدمات انجام دیتے اور تمام ملی ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں۔

چنانچہ جہاں جمیعۃ کے تحت دینی تعلیم کا ایک وسیع تر نظام چل رہا ہے، وہیں وہ خدمت خلق کا کام بھی کرتے ہیں اور غریب آبادیوں خاص کر سیاہ فام لوگوں میں اعانتوں کی تقسیم، اور ریلیف کا کام بھی انجام دیتے ہیں، مغربی اور مغرب زدہ ممالک میں ایک بڑا مسئلہ حلال کھانے کا بھی ہے، کیوں کہ جانوروں کو شرعی طور پر ذبح کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا اور خنزیر کا استعمال عام ہے، جمیعۃ علماء نے اس کے لئے اپنا ایک خصوصی شعبہ قائم کر رکھا ہے، جو 'سلاٹر ہاؤس' کا معائنہ کرتا ہے اور جو لوگ حلال گوشت کا اہتمام کرتے ہیں انھیں حلال کی سرٹیفکٹ دیتا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ یہاں مسلمان حلال غذاؤں کا اہتمام کرتے ہیں، اسی لئے بہت سے غیر مسلم ہوٹل والے بھی جمیعۃ سے رُجوع کر کے حلال کا سرٹیفکٹ حاصل کرتے ہیں، اسی جمیعۃ

کے تحت 'ریڈیو اسلام' ہے، جو چوبیس گھنٹہ پروگرام نشر کرتا ہے، اور نہ صرف ساؤتھ افریقہ بلکہ بر اعظم افریقہ کے دوسرے ممالک کے مسلمان بھی اس کے پروگراموں کو بہت دلچسپی سے سنتے ہیں، نیز سامعین میں ایک اچھی خاصی تعداد غیر مسلموں کی بھی ہوتی ہے، جمیعۃ کے تحت دارالافتاء کا شعبہ بھی ہے، جس میں دو مستقل نوجوان مفتی کا کام کرتے ہیں اور کئی تجربہ کار اور سن رسیدہ مفتیان کرام کا تعاون انھیں حاصل ہے، محکمہ شرعیہ کا شعبہ بھی قائم ہے، جس میں مسلمانوں کے معاشرتی مقدمات لائے جاتے ہیں، اور قانون شریعت کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جاتا ہے، دارالافتاء سے سوال کرنے کے لئے انٹرنیٹ کی سہولت بھی حاصل ہے، جمیعۃ ہی کے تحت ایک ''ویمن ہیلپ لائن'' بھی قائم ہے، جن مقدمات میں فیصلہ دشوار ہوتا ہے اور صلح مناسب ہوتی ہے، وہ اس شعبہ کے سپرد کردیئے جاتے ہیں، مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں حکومت کے سامنے نمائندگی کا فریضہ بھی یہی تنظیم (جمیعۃ علماء) انجام دیتی ہے اور سیاسی اُمور میں بھی یہ مسلمانوں کی رہبری کرتی ہے۔

جمیعۃ کا نشر واشاعت کا شعبہ بھی ہے، اس نے بہت سی کتابیں دینی اور دعوتی نقطۂ نظر سے شائع کی ہیں اور ''الرشید'' کے نام سے نہایت ہی پابندی سے اس کا انگریزی ہفت روزہ نکلتا ہے اور مسلمانوں میں بہت مقبول ہے، تعلیم کے معاملہ میں جمیعۃ کی پالیسی یہ ہے کہ انھوں نے بڑے دارالعلوم اور جامعات تو خود قائم نہیں کئے ہیں، لیکن اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کے لئے مکاتب کا بہت ہی مفید اور وسیع نظام قائم کیا ہے، اسی طرح مسلم اسکول اکثر مسلم آبادیوں میں جمیعۃ کی کوشش یا تحریک پر قائم کئے گئے ہیں، جنوبی افریقہ پوری طرح مغربی تہذیب وثقافت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، بے پردگی بلکہ عریانیت عام سی بات ہے، اخلاقی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسکولوں میں پانچویں جماعت سے سیکس کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہائی اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ و طالبات کو کنڈوم فراہم کئے جاتے ہیں، نیز ساؤتھ افریقہ ان ملکوں میں سرفہرست ہے، جہاں سب سے زیادہ ایڈس کے کیس پائے جاتے

ہیں، ایسے ماحول میں یہ مسلم اسکول طلبہ وطالبات کو پاکیزہ ماحول فراہم کرتے ہیں اور یہاں لڑکیاں اسکارف اور نقاب میں نظر آتی ہیں، ساؤتھ افریقہ کے ماحول میں یہ کسی کرامت سے کم نہیں ہے، اسی طرح ان مکاتب میں قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ وغیرہ کی اچھی خاصی تعلیم ابتدائی جماعت سے میٹرک تک دی جاتی ہے، لڑکے اور لڑکیاں اسکول کی تعلیم شروع ہونے سے پہلے یا اس کے بعد ان مکاتب میں روزانہ ڈھائی تین گھنٹہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اسلامی اقدار کو اندرونی جذبہ اور ذہنی شعور کے ساتھ قبول کریں۔

جمیعۃ کا ایک بڑا کام بلکہ کارنامہ مکاتب اور اسکولوں کے لئے اسلامیات کے نصاب کی ترتیب ہے، یہ نرسری کی جماعت سے لے کر میٹرک تک کے طلبہ کے لئے ہے، جو ناظرۂ قرآن، نورانی قاعدہ اور تعلیم الاسلام سے شروع ہوکر قرآن کی منتخب سورتوں کی تفسیر، منتخب احادیث کے ترجمہ وتشریح، فقہ میں قدوری نیز سیرت اور اسلامی تاریخ میں معیاری ومعتبر مضامین تک حاوی ہے اور اس وقت یہ پورا نصاب انگریزی زبان میں ہے، اس نصاب کی تاریخ یہ ہے کہ علماء ہند میں سب سے پہلے وہاں علامہ انور شاہ کشمیری کے تلامذہ پہنچے تھے، انھوں نے ہی ۱۹۲۳ء میں جمیعۃ علماء کی بنیاد رکھی تھی، ۱۹۳۰ء میں جمیعت کے تحت مکاتب کا پہلا نصاب بنا، پھر ۱۹۶۰ء میں اس کو دوبارہ مرتب کیا گیا، اس سلسلہ میں مشورہ کے لئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو دعوت دی گئی اور اس نصاب میں ان کے مشورہ کو خاصا دخل رہا۔

یہ نصاب اُردو زبان میں تھا اور مشاہیر علماء ہند کی کتابوں پر مشتمل تھا، لیکن رفتہ رفتہ صورتِ حال یہ ہوئی کہ ہندوستان سے جانے والے مسلمان کے گھروں میں جو اُردو اور گجراتی زبان کا رواج تھا وہ کم ہوتا گیا، نئی نسل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان زبانوں سے نا آشنا ہوگئے اور علماء کو غور کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ کیا اب مکاتب کے لئے انگریزی زبان میں اسلامیات کا نصاب مرتب کیا جائے؟ اس سلسلہ میں ایک گروہ سختی کے ساتھ اس بات کا قائل تھا کہ یہ نصاب

اُردو ہی میں ہونا چاہئے، تا کہ ہماری نسلیں ہندوستان کے بزرگوں سے مربوط رہیں، دوسرے گروہ کا خیال یہ تھا کہ چوں کہ نئی نسل کے لڑکے اور لڑکیاں گھر میں بھی انگریزی زبان ہی بولتے ہیں اور اُردو سے بے بہرہ ہو چکے ہیں، اس لئے نصاب انگریزی میں ہونا چاہئے، تا کہ وہ اس تعلیم کی طرف راغب ہو سکیں اور اس کو آسانی سے سمجھ سکیں، ان دنوں استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ بھی وہاں موجود تھے، مفتی صاحب سے مشورہ کیا گیا، مفتی صاحب کی ظرافت اور بذلہ سنجی سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں، جنھوں نے ان سے پڑھا یا استفادہ کیا ہے، جب اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے علماء جمع ہوئے، تو مفتی صاحب نے سنسکرت زبان میں چند اشلوک پڑھے، پھر حاضرین سے دریافت کیا کہ آپ حضرات نے تو اچھی طرح اس کو سمجھ لیا ہوگا؟ حاضرین نے نفی میں جواب دیا، مفتی صاحب نے فرمایا: پھر تو میرے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، پھر کہا کہ مخاطب جس بات کو سمجھتا نہ ہو، اس کو کہنے کا کچھ حاصل نہیں ہے، اس لئے تعلیم اس زبان میں ہونی چاہئے، جس زبان سے لوگ واقف ہوں، چنانچہ اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ انگریزی زبان میں از سر نو نصاب کی تدوین ہوئی اور تقریباً چار سال کی محنت کے بعد ۱۹۸۰ء میں اس نصاب کی ترتیب پایۂ تکمیل کو پہنچی، چنانچہ اس وقت نہ صرف جنوبی افریقہ بلکہ برطانیہ اور دبئ میں بھی مسلم اسکولوں میں یہ نصاب پڑھایا جاتا ہے اور افادیت و نافعیت کو دیکھتے ہوئے ان نصابی کتابوں کا البانوی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔

نصابی کتابوں کی انگریزی زبان میں ترتیب و ترویج کا جہاں ایک مثبت پہلو ہے کہ طلبہ وطالبات کو اپنی مادری زبان میں اسلامیات کی تعلیم حاصل ہو جاتی ہے، وہیں اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ اُردو زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نسل کا رشتہ برصغیر کے فکری اور علمی ورثہ سے کٹتا جا رہا ہے، اُردو زبان صرف ایک زبان نہیں ہے؛ بلکہ عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ اسلامی علوم کی امین ہے اور اہل سنت والجماعت کی معتدل اور مستقیم فکر کے حامل لٹریچر اس دور کے لحاظ سے سب سے زیادہ شاید اسی زبان میں پایا جاتا ہے، بیسویں صدی میں دنیا

کے اسلامی مفکرین کے نام لئے جائیں، تو ان میں کئی نام علماء ہند کے ہوں گے اوران کا بیشتر سرمایہ اُردو زبان میں ہے، تین اہم معاصر عالمگیر تحریکات 'تحریک مدارس، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی' کا مرکز ہندوستان ہی ہے اور یہ اُردو زبان ہی کے خمیر سے اٹھی ہیں؛ اس لئے کم از کم دینی مدارس میں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کو باقی رکھا جائے اور ہند و پاک کے تارکین اپنے گھر میں اُردو بول چال کا چلن رکھیں۔

جنوبی افریقہ میں جمیۃ علماء ٹرانزوال سے ۸۲ مکاتب کا الحاق ہے، ان مکاتب اور ان کے علاوہ تقریباً ۱۰۰ دیگر مکاتب میں اس نصاب کے مطابق تعلیم ہوتی ہے، ان مکاتب میں روزانہ ڈھائی گھنٹے اسلامیات کی تعلیم دی جاتی ہے اور تعلیمی نگرانی کے لئے جمیعت کی طرف سے پانچ سپروائزر مقرر ہیں، ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان مکاتب میں بہت سے غیر مسلم سیاہ فام طلبہ بھی شریک کئے جاتے ہیں، اوران کے والدین خوشی کے ساتھ اپنے بچوں کو یہاں تعلیم دلاتے ہیں، گویا یہ درسگاہ کے ساتھ ساتھ خاموش طریقہ پر اسلام کی دعوت کا فریضہ بھی انجام دے رہا ہے، جمیعت کے تحت مشترک امتحان کا نظم ہے اور ۴۰ مدارس اس نظام میں شامل ہیں۔

جمیعت ایسی چیزوں کے بارے میں اپنے پروگرام چلاتی ہے، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے بشمول پورے انسانی سماج کے لئے قابل توجہ ہو، جیسے ایڈس سے کس طرح بچیں؟ اس کے لئے پمفلٹ شائع کئے گئے ہیں اور ان میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور عفت و پاکدامنی کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے، حکومت کی طرف سے ایک ایسا ادارہ قائم ہے، جس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شامل ہیں اور وہ حکومت کی خواہش پر انھیں مشورہ بھی دیتے ہیں، اس ادارہ میں جمیعت علماء مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے، اسی طرح اگر ملک میں کوئی ایسا قانون آرہا ہو، جو مسلمانوں کے مفاد میں نہیں ہے، تو جمیعت اس سلسلہ میں لوگوں کو متنبہ کرتی ہے اور مناسب قدم اُٹھاتی ہے، غرض جمیعت مسلمانوں کی ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر نمائندہ تنظیم

ہے، جو مختلف پہلوؤں سے اُمت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

جوہانسبرگ کے ایک اہم علاقہ میں واقع جمعیت کا دفتر سہ منزلہ عمارت پر مشتمل ہے، جس میں کتب خانہ، دارالافتاء، شعبۂ مکاتب اور مختلف شعبوں کے دفاتر، میٹنگ ہال، کانفرنس ہال وغیرہ واقع ہے، اسی عمارت میں ایک مہمان خانہ بھی ہے، جو اہم ضرورتوں اور عصری سہولتوں سے آراستہ ہے، اس حقیر کو ایک ہفتہ اس مہمان خانہ میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی اور قریب سے جمعیت کی سرگرمیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

جوہانسبرگ جنوبی افریقہ کے چند اہم اور بڑے شہروں میں ایک ہے، جو اونچی اونچی پہاڑیوں پر آباد ہے، پہاڑ ہی کی مناسبت سے اس شہر کے نام کے ساتھ ''برگ'' کا لفظ لگا ہوا ہے، درختوں سے ڈھکا ہوا، صاف ستھرا، سڑکیں کشادہ، اکثر علاقوں میں دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتیں، لیکن بعض علاقوں میں بہت بلند و بالا عمارتیں بھی موجود ہیں، یہ تجارتی اعتبار سے گویا ملک کا دارالخلافہ ہے، یہاں بازار بہت ہی ترقی یافتہ اور مغربی ممالک کے طرز پر ہیں، بڑے بڑے سپر مارکٹ ہیں، جہاں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی گھریلو زندگی کی تمام اشیاء ایک چھت کے نیچے مل جاتی ہیں، موسم معتدل بلکہ ایک گونہ خنکی لئے ہوا ہے۔

میزبانوں نے رات میں مجھے استراحت کا موقع دیا، اگلے دن ۴ستمبر فجر کے بعد حسب عادت دو ڈھائی گھنٹے آرام کر کے بیدار رہا، آج جوہانسبرگ سے کچھ فاصلہ پر ''پریسٹا'' نامی شہر کے قریب ایک قصبہ ''اسپرنگس'' کا پروگرام تھا، جہاں ایک نو قائم شدہ دارالعلوم جامعہ محمودیہ واقع ہے، ہم نوجوان فاضل مفتی محمد صاحب کے ساتھ تقریباً ۱۲ بجے جامعہ محمودیہ پہنچے، یہاں چھٹی ہو چکی تھی، مدرسہ کے مہتمم مفتی محمد اسماعیل صاحب جو ہم لوگوں کے ہم عمر ہی ہوں گے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحبؒ کے خاص شاگرد، متوسل اور پھر مجاز بیعت ہیں، بڑے اخلاق اور تواضع سے ملے، اساتذہ اور شعبۂ افتاء کے طلبہ کو جمع کیا اور ان سے خطاب کی خواہش کی، راقم الحروف نے تقریباً نصف گھنٹہ خطاب کیا، جو زیادہ تر

اربابِ افتاء کی ذمہ داریوں اور احکام فقہیہ پر احوال زمانہ کی تبدیلیوں کے اثر سے متعلق تھا، تمام ہی اساتذہ بڑی محبت سے ملے، جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف صاحب (جن کا تعلق گجرات سے ہے) بھی بڑی نیازمندی سے پیش آئے، مفتی اسماعیل صاحب کی زاہدانہ طبیعت اور احتیاط وانکسار نے دل کو متاثر کیا، انھوں نے بنفس نفیس کھانا بنایا تھا، خود ہی کھانا نکالا، اور لاکر دسترخوان پر رکھ دیا اور ہم لوگوں کو اصرار کرکے زیادہ سے زیادہ کھلانے کی کوشش کی۔

جامعہ میں ایک مانوس ومتعارف شخص مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی کی مل گئی، یہ ایک صاحبِ ذوق نوجوان فاضل ہیں، اُردو سے عربی اور عربی سے اُردو ترجمہ کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، دہلی میں تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کے تحت "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سیمینار" کے موقع سے مولانا موصوف سے ملاقات ہوچکی تھی، بڑی محبت سے پیش آئے، ان کے حسب خواہش ان ہی کے دولت خانہ پر دوپہر میں آرام کیا گیا اور ظہر کے بعد مسجد میں عام طلبہ سے خطاب ہوا، مدرسہ ہی کے ایک استاذ نے انگریزی زبان میں اس کا خلاصہ نقل کیا، اس کے بعد ہم لوگ کتب خانہ دیکھنے گئے، ابھی اس مدرسہ کی عمر کم ہے، اور کتب خانہ بھی نیا ہے، لیکن سن وسال کے لحاظ سے کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، جس میں مہتمم صاحب کی توجہ اور اساتذہ کے حسن ذوق کو بڑا دخل ہے، یہیں دیوبند میں میرے دورۂ حدیث کے رفیق مولانا طاہر الاسلام قاسمی دیوبندی سے ملاقات ہوگئی، جو پہلے مکہ مکرمہ میں 'رابطہ عالم اسلامی' کے دفتر میں برسرِ کار تھے۔

عصر سے پہلے جامعہ کے اساتذہ وطلبہ کی محبتوں اور عنایتوں کا نقش ساتھ لئے ہم لوگ ایک اور قریبی شہر "بنونی" کو روانہ ہوئے، یہ ایک اچھا خاصا شہر ہے، یہاں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے بڑا مکتب واقع ہے، جس کے ذمہ دار ممتاز عالم دین مفتی محمد ایوب صاحب کاچوی (فاضل دیوبند) ہیں، مفتی صاحب جمعیت کے شعبۂ تعلیم کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں اور اعلیٰ اخلاق کے حامل ہیں، اس مکتب میں ۱۴۰۰ طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، ۴۸ اساتذہ تعلیمی خدمت انجام

دے رہے ہیں اور ۱۲ سالہ نصاب پڑھایا جاتا ہے، عصر سے پہلے یہاں اساتذہ سے خطاب ہوا اور اساتذہ کے درجہ و مقام اور ان کی ذمہ داریوں پر کچھ عرض کیا گیا، میں نے خاص طور پر سے اس بات پر زور دیا کہ نئی نسل کو اُردو، گجراتی زبان سے بھی آشنا کرنا چاہئے، تاکہ وہ فکری اعتبار سے برصغیر کے علماء اور بزرگوں سے مربوط رہیں، یہیں دیر تک مفتی صاحب سے جمیعت کے تعلیمی نصاب اور نظام سے متعلق تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔

پانچ کو جامعہ زکریا کا معائنہ رکھا گیا تھا، یہ جامعہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی طرف منسوب ہے، اور ''نائشیا'' نامی شہر میں واقع ہے، یہ شہر جوہانسبرگ سے تیس کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، شہر کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے، جس میں پچاس فیصد مسلمان ہیں، ۳۵ مسجدیں ہیں، اسی شہر کے کنارے ایک پہاڑی کے دامن میں جامعہ زکریا واقع ہے، جامعہ میں ۵۵۰ طلبہ اور ۳۸ اساتذہ ہیں، براعظم افریقہ، ایشیاء اور یوروپ کو لے کر ۴۸ ممالک کے طلبہ زیر تعلیم ہیں، دورۂ حدیث بلکہ اس کے بعد تربیت افتاء کا شعبہ بھی قائم ہے، نصابِ تعلیم تقریباً وہی ہے، جو دیوبند کا ہے، البتہ منطق وفلسفہ کی کتابیں حذف کردی گئیں ہیں اور نحو میں کافیہ تک کتابیں رکھی گئی ہیں۔

ہم لوگوں نے ناشتہ یہیں کیا، مفتی شبیر احمد سالوجی اس مدرسہ کے مہتمم ہیں، صاحب ذوق عالم ہیں اور بخاری جلد ثانی خود پڑھاتے ہیں، حضرت مولانا مفتی ضیاء الحق صاحب مدرسہ کے شیخ الحدیث اور مفتی ہیں، ماشاء اللہ اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں، وہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ کے بھی قدردانوں میں ہیں، لمبا قد، کھلا ہوا رنگ، سر پر عمامہ، اور وضع قطع عالمانہ، متواضع اور منکسر المزاج، ملاقات بہت مختصر رہی، لیکن طبیعت ان کی طرف مائل ہوئی، مولانا عبداللہ ندوی دیولوی (جو حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی کے برادرخورد ہیں) ساتھ ساتھ رہے، درسگاہیں دکھائیں، شعبۂ افتاء کے طلبہ سے ملاقاتیں کرائیں، طلبہ افتاء خاص طور پر بڑی چاہت سے ملے، جب دارالافتاء میں حاضری ہوئی، متعدد طلبہ کی ڈسک پر ''جدید فقہی مسائل''

کا پاکستانی نسخہ موجود پایا، ان طلبہ کی خواہش پر مشق افتاء کے سلسلہ میں کچھ مشورے بھی دیئے گئے ، اخیر میں مہتمم صاحب کے دولت خانہ پر حاضری ہوئی اور وہاں سے چائے پی کر ہم لوگ روانہ ہوئے۔

آج جمعہ کا دن تھا، اور جمعہ سے پہلے ریڈیو اسلام کے اسٹوڈیو پر میرا خطاب ریکارڈ کیا جانا تھا، یہیں اس ریڈیو کا (جو جمیعۃ علماء ٹرانسوال کے تحت ہے) کا مرکز ہے ، اپنی نسل کی حفاظت ، غیر مسلموں میں دعوتِ اسلام کی ضرورت اور باہمی اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کے سلسلہ میں نمبروار کچھ باتیں عرض کی گئیں، ایک اور فاضل نے اس خطاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا، ترجمہ سے محسوس ہورہا تھا کہ میری معلومات کو مترجم نے پوری طرح ادا کیا ہے، یہاں سے فارغ ہوکر ہم لوگ جامع مسجد پہنچے ، یہ شہر کی سب سے بڑی ، نہایت ہی خوبصورت اور مختلف سہولتوں سے آراستہ مسجد ہے ، یہاں جمعہ سے پہلے بیس منٹ خطاب ہوا اور اس خطاب کا انگریزی ترجمہ مسجد کے خطیب نے حاضرین کے سامنے پیش کیا، میں نے خطبہ میں پڑھی جانے والی آیت ''ان اللہ یا مر بالعدل والاحسان'' کی مناسبت سے عدل کی حقیقت اور پوری زندگی کے ساتھ عدل واحسان کے ربط پر کچھ باتیں عرض کیں۔

شہر کی بڑی مسجدوں میں ایک ''مسجد عمر فاروق'' ہے، یہ ایک وسیع میدان میں واقع ہے، یہاں عصر بعد علماء سے خطاب رکھا گیا تھا ،عصر کی نماز میں اس وقت صرف ایک دو مولوی صورت لوگ نظر آئے ، میں نے سوچا کہ یہاں کیوں کر لوگ جمع ہوسکیں گے؟ لیکن نماز کے نصف گھنٹہ بعد علماء کی آمد شروع ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں اچھے خاصے لوگ جمع ہوگئے ،مغرب سے پہلے تعارف ہوا، اور مغرب کے بعد خطاب، تقریباً ستر، پچھتر علماء جمع تھے، ان میں جامعہ زکریا کے بہت سے اساتذہ بھی تھے ، یہیں ایک قدیم ندوی فاضل سے بھی ملاقات ہوئی ، اُمت کے تئیں علماء کی ذمہ داریاں اور انبیاء کے وارث ہونے کی حیثیت سے ان کے فرائض پر روشنی ڈالی گئی، لوگوں نے بہت توجہ سے بات سنی، یہاں تمام حاضرین کے لئے عشائیہ کا نظم تھا،

مسجد کے ساتھ ہی ایک بڑا فنکشن ہال بھی ہے، جو شادی اور دیگر تقریبات کے لئے کرایہ پر دیا جاتا ہے، اسی ہال میں کھانے کا نظم تھا، ہم لوگ یہاں سے فارغ ہوکر رات گئے جوہانسبرگ پہنچے۔

جنوبی افریقہ کی شہرت کے اسباب میں سے ایک اس کی سونے کی کانیں بھی ہیں، اس کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہے، جہاں سب سے زیادہ سونا نکلتا ہے، یہ کانیں جوہانسبرگ اور اس کے مضافات میں واقع ہیں، کان کی کھدائی کے بعد جو مٹی نکلتی ہے، وہ سطح زمین پر جمع ہوتی جاتی ہے، اب اس نے بڑے بڑے ٹیلوں بلکہ مٹی کی پہاڑیوں کی صورت اختیار کرلی ہے، یہ ٹیلے زرد رنگ کے ہیں، اور آنکھوں کو بھاتے ہیں، ایسی زرد مٹی اب تک کہیں اور دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا، معلوم ہوا کہ ان مٹیوں سے دوبارہ سونا کشید کیا جاتا ہے۔

کان کے باب الداخلہ پر بڑا پارک بنا ہوا ہے، جس نے پررونق تفریح گاہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے، مختلف ملکوں سے آنے والے سیاح یہاں آتے ہیں، اسی مناسبت سے ہوٹلیں اور دکانیں بھی ہیں، کان کے اندر جانے کے لئے پہلے ہمیں مخصوص لباس پہنایا گیا، آہنی ہیٹ پہنائی گئی اور ایک خاص قسم کی ٹارچ دی گئی، ہم لوگ لفٹ میں سوار ہوئے، یہ کافی بڑی، عام قسم کی، لیکن مضبوط لفٹ تھی اور ہمارے ساتھ ایک سیاہ فام نوجوان بطور گائڈ نیچے اُترے، لوگوں نے بتایا کہ غالبًا تین کیلومیٹر ہم لوگ پہنچائے گئے، یہاں روشنی کا انتظام ہے، ورنہ ان اندھیری گلیاروں سے انسان کا صحیح سلامت واپس آجانا ممکن نہیں، پتھر کس طرح تراشے جاتے ہیں، یہ منظر بھی دکھایا گیا، جب مشین چلتی ہے، تو لگتا ہے کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے؛ اسی لئے پہلے سے ہدایت کردی جاتی ہے کہ لوگ اپنے کان میں روئیاں رکھ لیں، ان پتھروں کو اس طرح پگھلایا جاتا ہے کہ وہ پانی کی طرح بہنے لگتا ہے، جن پتھروں سے سونا کشید کیا جاتا ہے، وہ کسی قدر سنہرے مائل رنگ کے نظر آتے ہیں، گائڈ نے بتایا کہ ایک ٹن پتھر پگھلایا جاتا ہے، تو اس میں ۲۵ گرام سونا نکلتا ہے، اس میں انسان کے لئے سبق ہے کہ انسان جب تک آزمائشوں

سے گذرتا نہیں، وہ نکھرتا بھی نہیں ہے۔

۷ستمبر کو صبح بزرگ عالم مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کا ناشتہ تھا، مولانا بڑے تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ دعوتِ دین اور حفاظتِ دین کے کام سے بڑی مناسبت رکھتے ہیں اور اس نسبت سے افغانستان اور متعدد ملکوں کا سفر کر چکے ہیں، آج جمیعۃ العلماء ٹرانزوال کی جانب سے پورے صوبہ کے علماء کی خصوصی نشست رکھی گئی تھی، چنانچہ صبح ۱۰ بجے دفتر جمیعۃ العلماء ٹرانزوال کے کانفرنس ہال میں پروگرام رکھا گیا، ماشاء اللہ علماء کی ایک بڑی تعداد —— جو اندازہ ہے کہ ڈیڑھ تا دوسو افراد پر مشتمل رہی ہوگی، یہاں جمع تھی، —— اس میں ملک کے ذمہ دار علماء، مدارس کے اساتذہ، دعوتی، تعلیمی اور رفاہی کاموں میں مشغول شخصیتیں اور خود جمیعۃ العلماء کے ذمہ داران وکارکنان شریک تھے، حسن اتفاق سے اس پروگرام میں مولانا مفتی احمد دیولوی مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر (گجرات) اور مولانا خالد عبید (ایڈیٹر: ''الفاروق'' انگریزی ایڈیشن، کراچی) جو ساؤتھ افریقہ آئے ہوئے تھے، بھی تشریف لے آئے۔

مولانا جینا صاحب کی تعارفی اور تمہیدی گفتگو کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس حقیر کا خطاب ہوا، خطاب کا موضوع ''علماء کی ذمہ داریاں'' تھا، میری معروضات کا خلاصہ یہ تھا کہ تحقیق دین، حفاظتِ دین، دعوتِ دین اور تنفیذ دین علماء کی بنیادی ذمہ داریاں ہیں، الحمد للہ لوگوں نے توجہ سے سنا، پھر کچھ سوالات کئے گئے ان کا جواب دیا گیا، ظہرانہ علماء کے ساتھ ہوا، اور اس کے بعد ہم لوگ ملک کی راجدھانی ' پڑیٹوریا ' کے مضافات میں واقع ایک شہر لوڈیم کے لئے روانہ ہوئے، یہیں مولانا عباس علی جینا صاحب کا مکان ہے، یہاں بہت ہی خوبصورت مسجد کچھ ہی عرصہ پہلے تعمیر ہوئی ہے، جو ''مسجد السلام'' کے نام سے موسوم ہے، ۱۰ رجب ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء کو اس مسجد کا افتتاح عمل میں آیا ہے، یہ مسجد ایک انوکھے نقشہ کے ساتھ تعمیر ہوئی ہے، میں نے مسجد پر ایک نظر پڑتے ہی مولانا جینا صاحب سے عرض کیا کہ اس میں مسجدِ قرطبہ کی جھلک نظر آتی ہے اور ترکی کا طرزِ تعمیر نمایاں ہے، مولانا نے بتایا کہ اس مسجد کا نقشہ بناتے

وقت انجینئر صاحب نے ترکی اور بعض علاقوں کے باضابطہ اسفار کئے اور ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسجد کے لئے ڈیزائن بنایا، یہ باہر سے بنیادی طور پر سرخ کلر کی عمارت ہے، اس کے مینارے بہت اونچے ہیں اور رات میں جب لائٹنگ ہوتی ہے، تو لگتا ہے کہ اندر سے روشنی پھوٹ رہی ہے، مسجد کا اندرونی حصہ خوبصورت گلاس کی دیواروں سے آراستہ ہے، جس پر بہت ہی خوبصورت حروف اور رنگ میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنٰی لکھے ہوئے ہیں، مسجد کی چھت اندر سے لکڑی کے کاموں سے اس طرح ڈھکی ہوئی ہے کہ گویا ایک بڑی اور خوبصورت سی چھتری ہو، بیچ میں کوئی ستون نہیں، مسجد کے ساتھ پارک، پارکنگ، وضوء وطہارت کی سہولتیں، دومنزلہ مہمان خانہ، خدام مسجد کی رہائش گاہیں، دینی درسگاہ اور ایک اسلامک ریسرچ سنٹر بھی موجود ہے، درسگاہ میں طلبہ تو غالباً ۲۰، ۲۵ ہی ہوں گے اور یہ سب غیر مقیم ہیں، لیکن تعلیم چہارم، پنجم عربی تک کی ہوا کرتی ہے۔

ریسرچ سنٹر کی متوسط درجہ کی لائبریری بھی ہے، جس میں زیادہ تر انگریزی زبان کی کتابیں ہیں، لیکن کچھ کتابیں عربی اور اُردو کی بھی ہیں، یہاں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو اچھے صاحبِ ذوق محسوس ہوئے، وہ غالباً ساؤتھ افریقہ میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی خدمت پر کام کر رہے ہیں، یہ ریسرچ سنٹر بھی ''دارالسلام ریسرچ سنٹر'' کے نام سے موسوم ہے۔

اسی مسجد کے کانفرنس ہال میں بعد نمازِ عصر تاجروں کے ساتھ ایک نشست رکھی گئی تھی، اس مجلس میں لوڈیم اور پریٹوریا شہر سے پچیس تیس اہم تجار جمع ہوئے تھے، مولانا جینا صاحب کے تعارفی اور تمہیدی کلمات کے بعد میں نے تجارت کے بارے میں اسلامی تصور پر مختصر گفتگو کی، پھر حاضرین نے سوالات کئے اور اس حقیر نے جواب دیا، مولانا جینا صاحب اور ان کے صاحبزادے ترجمانی کے فرائض انجام دیتے رہے، یہ بڑی خوشگوار مجلس ہوئی، جو نمازِ عصر تک چلتی رہی، نماز کے بعد چائے پی گئی اور پھر مولانا جینا صاحب پریٹوریا شہر کی ایک جھلک دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لے کر چلے۔

یہ بہت ہی خوبصورت شہر ہے جو چھوٹی چھوٹی بلند قامت پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، سطحِ زمین میں نشیب وفراز کی وجہ سے رات کے وقت برقی بلب بہت ہی خوبصورت سماں پیش کرتے ہیں اور اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ ہوائی جہاز سے کسی جگمگاتے ہوئے شہر میں اتر رہے ہوں، یہ اس ملک کی راجدھانی ہے، لیکن راجدھانی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، قصرِ صدارت، وزراء کی قیام گاہیں، سپریم کورٹ اور سکریٹریٹ پریٹو ریا میں ہے اور پارلیمنٹ ہاؤس ساحلی 'شہر کیپ ٹاؤن' میں ہے، ہم لوگ مختلف نیچی، اونچی، کشادہ اور صاف وشفاف سڑکوں سے گزرتے ہوئے قصرِ صدارت تک پہنچے، جو بہت ہی بلندی پر واقع ہے، صدارتی محل ہندوستان کی پارلیمنٹ اور راشٹر پتی بھون کے طرزِ تعمیر سے بہت زیادہ مماثلت رکھتا ہے، مولانا جینا صاحب نے بتایا کہ جس انجینئر نے ہندوستان کی ان عمارتوں کا نقشہ بنایا تھا، اسی نے جنوبی افریقہ کی قصرِ صدارت کو بھی ڈیزائن کیا تھا، محل کے نیچے ایک اونچی سی فصیل واقع ہے، جس پر کہیں کہیں اسٹیچو بنے ہوئے ہیں اور اس کے نشیب میں بہت بڑا میدان اور پارک ہے، یہ جگہ دہلی میں لال قلعہ کی فصیل اور اس کے سامنے کے میدان سے بہت مشابہ ہے؛ بلکہ لال قلعہ کے سامنے کا میدان نسبتاً چھوٹا ہے، معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں قومی تقریبات اسی میدان میں منعقد ہوتی ہیں، میدان میں عام لوگ ہوتے ہیں اور فصیل کے اوپر اسٹیج ہوتا ہے۔

وہاں سے واپس آتے ہوئے مختلف مارکٹوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا، بازار عام طور پر مغربی ملکوں کی طرح ہے، مولانا ہمیں یہ بھی بتاتے رہے کہ فلاں مارکٹ دورِ غلامی میں سفید فام لوگوں کے لئے مخصوص تھا اور فلاں مارکٹ سیاہ فام لوگوں کے لئے، ہندوستانی نسل کے لوگوں کو کہاں آباد ہونے کی اجازت تھی؟ وغیرہ وغیرہ —— اسی شہر میں وہ عظیم الشان یونیور سٹی بھی واقع ہے جو دنیا میں فاصلاتی تعلیم کی سب سے بڑی یونیورسٹی مانی گئی ہے، دور ہی سے اس یونیورسٹی کے نظارہ کا موقع ملا، یہاں ایک پہاڑی پر دور سے ایک بلند عمارت نظر آتی ہے،

بتایا گیا کہ یہ ''عجائب گھر'' ہے جس میں ڈچوں کے قبضہ کی تاریخ ، کالوں کے ساتھ ان کی مزاحمت اور سیاہ فام لوگوں کی تہذیب وثقافت کی محرومی کو مختلف مجسموں اور پینٹنگ کے نمونوں کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے، یہ تصویریں سفید فام لوگوں نے تو سیاہ فاموں کی تحقیر کے لئے بنائی تھیں، لیکن موجودہ حکومت نے اسے جوں کا توں برقرار رکھا ہے، تا کہ یہ سفید فاموں کی زیادتی اور جور وستم کی زندہ تصویر اور شہادت بنی رہیں۔

اس بات سے خوشی ہوئی کہ پریٹوریا میں تجارت میں مسلمانوں کا بھی اچھا خاصا حصہ ہے اور بعض بڑے بڑے سوپر مارکٹ مسلمانوں کے ہیں، بہر حال مغرب کے معاً بعد ہم لوگ ''مسجد السلام'' واپس ہوگئے ، یہاں عشاء کے بعد عمومی خطاب تھا، میں نے خطاب میں لوگوں کو اس تہذیبی ارتداد کی طرف متوجہ کیا، جو ایک طوفان کی طرح جنوبی افریقہ کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے، اور جو پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کی نئی نسل سے ٹکرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

لوڈیم میں دار السلام سنٹر سے قریب ہی 'اسلامیہ اسکول' ہے، آٹھ ستمبر کی صبح اسکول کے معائنہ کا موقع ملا ، یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی بڑی تعداد کو اسلامی وضع قطع میں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، بڑی لڑکیاں عام طور پر برقعوں میں ملبوس تھیں، ساؤتھ افریقہ کے ماحول میں یہ منظر نہایت خوش آئند اور قابل تحسین ہے ، یہاں سے ہم لوگ ساؤتھ افریقہ کے مشہورِ عالم ''نیشنل پارک'' کی سیر کے لئے روانہ ہوئے ، جو یہاں سے چار سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، اس سفر میں مولانا محمد ایوب صاحب، مولانا محمد ظہیر صاحب اور مولانا محمد داؤد صاحب نیز بعض اور احباب کی رفاقت حاصل رہی ، ہم مزاج لوگوں کی معیت کی وجہ سے سفر بہت پُر لطف رہا اور کھاتے پیتے گذرا، یہ طویل ہائی وے بہت ہی کشادہ اور وسیع ہے، حالاں کہ مولانا ظہیر صاحب بہت ہی تیز رفتاری کے ساتھ گاڑی چلانے کے عادی ہیں، لیکن گاڑی اور سڑک دونوں ہی ایسی تھیں کہ تیز رفتاری کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا ، غالباً یہاں سڑکوں کی نگہداشت اور مرمت کا پرائیوٹ انتظام ہے، اس لئے جگہ جگہ ٹول ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، چنانچہ جوہانسبرگ

اور ڈربن کے درمیان تقریباً ۲۰۰ رینڈ (جنوبی افریقہ کا سکہ) ٹیکس کے دینے پڑتے ہیں، ٹورٹیکس سنٹر کے پاس پٹرول پمپ، سپر مارکٹ اور ہوٹل نیز حوائج ضروریہ سے فراغت کا بھی معقول نظم رہتا ہے، اور ایسے مواقع پر سیکوریٹی کا بھی پورا انتظام رہتا ہے، یہاں یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ آپ درمیان میں کہیں گاڑی روک نہیں سکتے، اگر گاڑی روکی گئی تو سیاہ فام لوگوں کے حملوں کا امکان ہوتا ہے، اسی لئے محفوظ مقامات ہی پر لوگ گاڑی روکتے یا اترتے ہیں، نیشنل پارک سے پہلے ہم لوگوں کی منزل ''میڈل برگ'' نامی شہر تھا، میڈل برگ سے پہلے بڑے خوبصورت علاقے آتے ہیں، جو اپنے حسن و جمال میں کسی طرح کشمیر کی وادیوں سے کم نہیں ہیں، اونچی نیچی سبزوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، گویا انھیں سبز دوپٹے اُڑھا دیئے گئے ہوں، ہاتھ باندھے، صف بستہ، پتلے، لیکن اونچے اونچے درخت جن کے انگ انگ سے رعنائی نمایاں، ان درخت پوش پہاڑیوں کے درمیان سبزہ زار وادیاں، ایسی کہ گویا زمین پر سبز قالین بچھادی گئی ہو، کہیں کہیں صاف وشفاف جھیلیں اور اس میں لہراتے ہوئے درختوں کے عکس، یہ ایسے روح پرور اور خوش منظر مناظر تھے کہ صبح کے نکلے ظہر کا وقت ہوگیا، لیکن ذرا بھی تکان کا احساس نہیں ہوا۔

میڈل برگ ایک اچھا خاصا آباد اور پررونق شہر ہے، یہاں ہم لوگ جمیعۃ العلماء ٹرانزوال کے ذیلی دفتر میں پہنچے، جمیعت کے مقامی ذمہ دار اور مقامی علماء پہلے سے منتظر تھے، تقریباً پون گھنٹہ یہاں تبادلۂ خیال اور سوال وجواب کی مجلس رہی، یہیں مولانا محمد ابوبکر صاحب سے ملاقات ہوئی، جو ہم لوگوں کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے، ان سے دیر تک ساؤتھ افریقہ کے موجودہ مسائل اور دارالعلوم کی خود گزشت پر گفتگو ہوتی رہی، ایک فاضل جو اُردو زبان بول نہیں سکتے تھے، لیکن اچھے علمی ذوق اور معتدل فکر کے حامل تھے، (جن کے نام کے سلسلہ میں حافظہ بے وفائی کررہا ہے) بہت سے معقول علمی سوالات کرتے رہے، ان ہی کے دولت خانہ پر پُر تکلف ظہرانہ کا نظم تھا، ہم لوگ کھانے سے فارغ ہوکر اور ظہر کی نماز ادا

کرکے پارک کی طرف روانہ ہوئے اور ڈیڑھ دو گھنٹہ کا سفر طے کرکے 'وہائٹ ریور' نامی شہر پہنچے اور یہاں مولانا محمد گارڈی کے دولت خانہ پر چائے پی کر اور زائد از ضرورت سامان ان کے یہاں چھوڑ کر روانہ ہوئے، پارک میں کافی پہلے سے اپنی سیٹ بک کرانی ہوتی ہے، مولانا موصوف اپنے تعلقات کی بنیاد پر ہم لوگوں کے لئے پارک میں قیام گاہ کی بکنگ کرا چکے تھے، یہاں سے پھر ڈیڑھ دو گھنٹہ چل کر یہ قافلہ پارک کے باب الداخلہ پر پہنچا اور ٹکٹ وغیرہ دکھانے میں جو تاخیر ہورہی تھی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم لوگوں نے یہیں وضوء کرلیا۔

اب گاڑی اپنی طوفانی رفتار کے ساتھ پارک کے اندر رواں دواں تھی، تقریباً نصف گھنٹہ میں ہم لوگ پارک کے اندر محفوظ رہائش گاہوں کی حدود میں پہنچ گئے، یہاں داخل ہوتے ہی عجیب انداز کی سہ طرفہ عمارت ملی، جس میں ساؤتھ افریقہ، زامبیا اور موزمبیق کے ان تین فرما رواؤں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں، جنھوں نے باہمی تعاون سے اس پارک کو قائم کیا تھا، چوں کہ عصر کا وقت آخر ہورہا تھا، اس لئے ہم لوگوں نے وہیں سامنے کے سبزہ زار پر جلدی جلدی دوگانہ عصر ادا کی، یہ ایک وسیع احاطہ ہے، جس میں چاروں طرف سے برقی تاروں کا حصار بنا ہوا ہے، جس میں برقی رو دوڑتی رہتی ہے، تاکہ کوئی درندہ اندر نہ آسکے اور جو سڑکیں اندر کی سمتوں میں آتی ہیں اس پر اونچے کمان نما سنگی گیٹ بنے ہوئے ہیں، اور مسلح سکیوریٹی کا نظم ہے، اس حصار بند علاقہ میں خوبصورت پارک بھی ہیں، ہوٹل اور کیفے بھی ہیں، نہریں، پھلواریاں، صاف وشفاف سڑکیں، کھیل کود اور دوڑ بھاگ کے لئے میدان اور اس برقی حصار کے باہر کھلے ہوئے جنگلات کو دیکھنے کے لئے حصار کے اندر جگہ جگہ بینچ رکھے ہوئے ہیں۔

اس وسیع جنگل میں جنوبی افریقہ، زامبیا اور موزمبیق کے علاقے شامل ہیں، جو مجموعی طور پر ۱۹۶۳۳ مربع میل پر مشتمل ہے، اور صرف ایک طرف جنوبی افریقہ سے موزمبیق، یعنی جنوب سے شمال کی طرف، اس کا مستطیل رقبہ ۳۵۰ کیلومیٹر ہے، اس پارک میں ایک سو پچاس قسم کے جانور، پانچ سو قسم کے پرندے اور تین سو قسموں کے درخت ہیں، صرف شیروں کی تعداد

ایک ہزار کے قریب ہے اور ہرن کی بے شمار انواع ہیں، خرگوش کی طرح چھوٹے ہرن دیکھنے کا بھی موقع ملا، جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے غاروں میں بسیرا کرتے ہیں، اور گھوڑے کی جسامت کے لمبے چوڑے ہرن بھی نظر آئے، ہرن اور ہاتھی بڑی تعداد میں ہیں، آٹھ ہزار سے زیادہ ہاتھی ہیں، کبھی کبھی ان کی تعداد کو محدود کرنے کے لئے انھیں ہلاک بھی کیا جاتا ہے، اور ان کے گوشت تقسیم کردیئے جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ سیاہ فام لوگ ہاتھی کا گوشت کھایا کرتے ہیں۔

یہاں سیاحوں کے رہنے اور رات گزارنے کے لئے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے ہیں، جو تمام رہائشی سہولتوں، بیڈروم، کچن، گیس چولھا اور گیس، فریج، مشروبات، کھانے کے برتن، بستر ولحاف وغیرہ سے آراستہ ہیں، جنوبی افریقہ کی قدیم آبادیوں میں چھپر نما مکانات ہوا کرتے تھے، اور پھوس کا چھپر ہوا کرتا تھا، یہ بہت ہی خوبصورت چھتری نما کمرے ہوتے ہیں، اور اس کے چھپر کو ہندوستان میں پھوس کے چھپروں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، یہاں موٹے قسم کے سخت گھانس استعمال ہوتے ہیں، ان چھپروں کا حجم تقریباً تین چار انچ ہوتا ہے اور انھیں اس خوبصورتی سے بنایا جاتا ہے کہ وہ اندر سے بہت ہی دیدہ زیب نظر آتے ہیں، چھپر کے حجم کی وجہ سے بارش میں ٹپکنے کا کوئی احتمال نہیں رہتا، اور اندر کا ماحول ٹھنڈک میں گرم اور گرما میں ٹھنڈا رہتا ہے۔

ہم لوگوں نے اپنی قیام گاہ پہنچنے کے ساتھ ہی سامنے سبزہ زار پر مغرب کی نماز ادا کی اور برقی حصار کے قریب بنی ہوئی چھتری کے نیچے گفتگو میں مشغول ہوگئے، قریب کی جھاڑیوں سے ہلکی اور پھر نسبتاً زور سے کھکھراہٹ محسوس ہوئی، ٹارچ کی مدد سے لوگوں نے دیکھنے کی کوشش کی، صحیح طور پر تو دیکھا نہیں جاسکا، لیکن محسوس ہوا کہ کوئی بڑا سا گینڈا اپنے شکار کو نشانہ بنا رہا ہے، ہم لوگ رات دس گیارہ بجے تک مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے، زیادہ تر اس کا تعلق شرعی مسائل اور فقہ واُصولِ فقہ کے طریقۂ تعلیم وغیرہ سے رہا، رات کے کھانے کے بعد اسی احاطہ میں چہل قدمی کی، محسوس ہوا کہ اکثر مکانات میں یورپ کے سیاح مقیم ہیں، آج

کافی تکان ہو چکی تھی ؛ کیوں کہ ہم لوگ صبح سویرے سے مغرب تک مسلسل کار کا سفر کرتے رہے، چاندنی رات کی وجہ سے جنگل کی تاریک فضاء پر روشنی کے سائے پڑ رہے تھے، لیکن گھنے جنگلات کی تاریکی کے مقابلہ یہ مدھم سا تبسم ریز اُجالا عاجز و درماندہ نظر آتا تھا اور دور دور تک سناٹا چھایا رہتا تھا، اس سناٹے میں کبھی جنگلی جانوروں کی پر شور اور ہیبت انگیز آوازیں وحشت کا ماحول پیدا کرتی تھیں، تو کبھی نوع بہ نوع پرندوں کی چہچہاہٹ کان میں رس گھولتی تھی اور موسم میں یک گونہ خنکی کی وجہ سے گرم لحاف کا لطف دوبالا ہو رہا تھا، اس ماحول میں ہم لوگ جو سوئے تو فجر ہی کے وقت آنکھ کھلی۔

فجر کی نماز ادا کرتے ہی صبح دم یہ چند نفری قافلہ موٹر پر سوار جنگل کی پگڈنڈیوں میں رواں دواں ہو گیا اور خاص طور پر ندی اور نہر کے کناروں پر پہنچا، کیوں کہ یہی وقت جنگل کے شہنشاہ بے تاج ببر کے ندیوں پر آنے اور پانی پینے کا ہوتا ہے، لیکن سوئے اتفاق صبح سے ظہر تک مختلف حصوں میں بھاگ دوڑ کے باوجود شیر و ببر نظر نہ آسکا، نہ وہ تماشہ بینوں سے ناراض تھا یا شرمسار، لیکن باقی کتنے ہی جانوروں کو قریب سے اور فطری حالات میں دیکھنے کا موقع ملا، بہت ہی اونچی گردنوں والے ژراف، سیاہ وسفید نقوش سے آراستہ زیبرے، چھوٹے، بڑے، متوسط، طرح دار سینگوں والے، خوبصورت رنگوں سے مزین، بھاگتے، کھیلتے ہرن، جنگلی گھوڑے اور گدھے، دریائی گھوڑے اور گینڈے، خونخوار بھیڑیئے، اور نہ جانے کیا کیا؟ یہ بات عجیب ہے کہ حالاں کہ یہ پورا جنگل کھلا ہوا ہے اور جانوروں کے لئے ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن عام طور پر یہ جانور اپنے اپنے محدود حصہ ہی میں رہتے ہیں، کسی علاقہ میں ہرن، کسی علاقہ میں شیر، گویا انھیں کسی دوسرے علاقہ میں جانے کے لئے ویزا اور پرمیشن کی ضرورت ہے، اسے قدرت کی رہنمائی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

ہم لوگ ظہر کی نماز تک جنگل کے مختلف مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے اور مختلف سڑکوں سے گذرتے ہوئے جنگل سے باہر آئے اور عصر سے پہلے مولانا محمد گارڈی صاحب کے

یہاں پہنچ گئے ، مولانا موصوف کا مکان بجائے خود ایک تفریح گاہ سے کم نہیں ، ہری بھری پھلواریاں، خوبصورت اور مختلف پھلوں کے درخت، اس چہار طرفہ گلشن سدا بہار کے بیچوں بیچ مولانا کی خوش منظر رہائش گاہ ہے، ہم لوگوں نے مکان کی بالائی منزل کے برآمدہ پر بیٹھ کر پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں اور پتوں کی نغمہ ریز سرسراہٹ کے درمیان رات کا کھانا کھایا، پر تکلف اور دل کو بھانے والا خاص کر ہرن کے مختلف طرح کے گوشت نے بہت لطف دیا کہ پہلی بار ہرن کا گوشت کھانے کا اتفاق ہوا، مولانا کی قیام گاہ سے متصل ان کا سپر مارکٹ بھی ہے، اور مکان کی دوسری جانب مولانا ہی نے ایک دو منزلہ چھوٹی لیکن خوبصورت اور تمام سہولتوں سے آراستہ مسجد تعمیر کی ہے، اس کی بالائی منزل میں معتکفین کا قیام ہوتا ہے، جس میں پردوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے حجرے بنائے گئے ہیں، یہاں مولانا کو اپنی دعوتی اور دینی مساعی کی وجہ سے متشدد عیسائیوں کی مخالفت کا سامنا ہے۔

تکان کی وجہ سے رات کو گہری نیند آئی اور فجر کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ مزید آرام کے بعد ہی ہم لوگ کچھ کام کرنے کے لائق ہو سکے ، چنانچہ ناشتہ کے بعد میں اور مولانا عباس علی جینا صاحب مجوزہ میرج بل کی خواندگی میں مشغول ہو گئے، دن کا ایک بج گیا، ابھی بل تشنۂ تکمیل تھا؛ لیکن ڈربن کے جہاز کا وقت قریب ہو چکا تھا، اس لئے نماز پڑھی گئی، کھانا کھایا گیا، مولانا جینا صاحب مصر تھے کہ ایئر پورٹ تک چھوڑیں، لیکن پرایٹوریا تک کا طویل سفرِ واپسی ان کے لئے دشوار ہو جاتا، اس لئے ہم نے وہیں سے ان کو الوداع کہا، اور مولانا محمد گارڈی کے ہمراہ ہم لوگ ایئر پورٹ پہنچے، محسوس ہوا کہ یہاں کا عملہ ان سے متعارف ہے، اس تعلق کی بنا پر وہ سیکوریٹی کے اندرونی حصے تک ہمیں چھوڑ گئے ، یہاں سے ڈربن کے لئے ہم جہاز پر سوار ہوئے، وہ بہت ہی چھوٹا صرف سترہ سیٹوں پر مشتمل تھا، ماریشش اور ری یونین کے درمیانی سفر کے سوا اتنا چھوٹا جہاز کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا، قریب ایک گھنٹہ ہوا کے دوش پر چلنے کے بعد ہم ڈربن پہنچے۔

ڈربن جنوبی افریقہ کے بڑے شہروں میں ہے، اور صوبۂ نٹال کی راجدھانی ہے، آزادی کے بعد اب اس صوبہ کا نام ''کوا زولو نٹال'' (Kwazulu Natal) ہے، یہ شہر ساحل سمندر پر آباد ہے، اور ایک طرف ساحل سمندر اور دوسری طرف اونچی نیچی پہاڑیوں کی وجہ سے بڑا بھلا لگتا ہے، ایئر پورٹ پر مولانا محمد یونس پٹیل (صدر جمعیۃ علماء نٹال) کے نمائندہ کے علاوہ مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی بھی موجود تھے، وہ علامہ سید سلیمان ندوی کے صاحبزادہ ہیں، متوسط قد، کھلا ہوا رنگ، سفید داڑھی، لمبی قمیص اور شلوار میں ملبوس، اوپر سے گرم صدری اور اونی کیپ، حالاں کہ میں نے انھیں پہلے دیکھا نہیں تھا، لیکن چوں کہ بار بار فون پر گفتگو ہو چکی تھی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تصویر دیکھ چکا تھا، اس لئے چہرہ بشرہ ہی سے پہچان لیا، اس حقیر کو ہندوستان کے گذرے ہوئے جن علماء سے خصوصی عقیدت و محبت ہے، ان میں ایک اہم ترین نام سید صاحب کا ہے، اس لئے خاندانی نسبت اور پھر ان کی خوش اخلاقی، وسیع القلبی اور سادگی و بے تکلفی سے دل خوش ہوا، وہ پہلے واشنگٹن یونیورسٹی شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر تھے، پھر ساؤتھ افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اسلامیات کی حیثیت سے مدعو کئے گئے، آپ کی دعوت پر یہاں ڈاکٹر حبیب الحق ندوی بھی آئے تھے، جن کی وفات ہو چکی، اب تیس سال سے ڈربن میں مقیم ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم ندوہ میں ہوئی، پھر جب سید صاحبؒ قاضی کی حیثیت سے بھوپال تشریف لائے تو وہاں زیر تعلیم رہے، اخیر میں کراچی یونیورسٹی سے ''حضرت مولانا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی، ایچ، ڈی کیا، مولانا شاہ حلیم عطا اور مولانا محمد یوسف بنوری آپ کے اساتذہ میں ہیں، ڈاکٹر صاحب کو شعر و سخن کا بڑا نفیس ذوق ہے اور کثرت سے اشعار یاد ہیں، ڈربن اور اس کے مضافات کے سفر میں ہر جگہ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت حاصل رہی، اور ان کی خورد نوازی نے بہت متاثر کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں اس محلّہ میں پہنچا، جہاں میرے قیام کا نظم تھا، یہ مکان ہے جناب محمد ادریس ہانسا صاحب کا، وہ تبلیغی جماعت کے سرگرم لوگوں میں ہیں، اور علماء کے

بڑے قدرداں اور ان سے محبت کرنے والے ہیں، جنوبی افریقہ کے مختلف شہروں سے آنے والے علماء ان کے یہاں مہمان ہوتے ہیں، ان کے داماد نوجوان فاضل ہیں، جو جامعہ انعامیہ میں شعبۂ افتاء کے طالب علم ہیں، وہ تبلیغی سفر کی نسبت سے حیدرآباد بھی آچکے ہیں اور اس موقع سے اس حقیر سے ملاقات بھی کی تھی، مجھے تو ان کی شناخت یاد نہیں تھی، لیکن انھوں نے خود اس بارے میں بتایا، ادریس صاحب نے اپنے مکان سے متصل ایک مدرسہ تحفیظ القرآن بھی فی سبیل اللہ قائم کر رکھا ہے، لیکن مہمانوں کی قیام گاہ اپنے دولت کدہ میں رکھتے ہیں، اور مہمان کی تواضع، خدمت اور راحت رسانی کا اتنا زیادہ خیال رکھتے ہیں، کہ شاید اس سے زیادہ خیال رکھنا ممکن نہ ہو، میری موجودگی ہی میں وہاں مولانا شبیر سالوجی مہتمم دارالعلوم زکریا بھی تشریف لائے اور راحت کا خیال رکھتے ہوئے ہم دونوں کے لئے الگ الگ کمروں میں قیام کا نظم فرمایا، اللہ تعالیٰ انھیں خوب خوب اجر عطا فرمائے۔

یہیں مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگوں نے کھانا کھایا، کھانے پر مولانا محمد یونس پٹیل صدر جمیۃ علماء نٹال، ڈاکٹر سید سلمان ندوی، مولانا احمد عمر اور ایک بڑے فاضل جناب شعیب عمر ایڈوکیٹ نیز مختلف معززین بھی تشریف لائے اور ان حضرات سے عشاء کے بعد میرج بل پر ایک خصوصی نشست ہوئی، جس میں مولانا یونس پٹیل، ڈاکٹر سید سلمان ندوی، جناب شعیب عمر، نوجوان فاضل مولانا محمد سلیمان اور یہ حقیر شریک تھے، تقریباً نصف بل کی خواندگی ہوئی، اس بل کے اصل مرتب جناب شعیب عمر صاحب ہیں، یہ پیشہ سے وکیل ہیں، اور اپنے پیشہ میں بہت ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں، انھوں نے کچھ وقت لگا کر دارالعلوم کراچی پاکستان میں مولانا محمد تقی عثمانی کے بشمول مختلف اساتذہ سے مختلف کتابیں انفرادی طور پر پڑھی ہیں اور سراجی مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ سے قیام جنوبی افریقہ کے درمیان پڑھی ہے، ماشاء اللہ کتبِ فقہ سے بھی ان کو اچھی مناسبت ہے، اس کے ساتھ ایک اچھا وصف یہ ہے کہ اپنی رائے پر اصرار نہیں ہے، راقم الحروف نے بل کی خواندگی کے درمیان بعض مضامین اور تعبیرات

سے اختلاف کیا اور ان میں ترمیم پیش کی، تو انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ اسے قبول فرمایا اور اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا، علماء کی ذمہ داری ہے کہ اُمت کے ایسے باصلاحیت افراد کو قریب کریں، اختلاف رائے کو سنیں، جو اختلاف معقول ہو، اسے پوری عالی حوصلگی کے ساتھ تسلیم کریں اور جو بات درست نظر نہ آئے، اس میں مخاطب کو علمی اعتبار سے مطمئن کریں، لیکن افسوس کہ آج کل ہم لوگ دلیل کے بجائے فتوے کی زبان اور غیظ وغضب کے اظہار کے ذریعہ اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنا چاہتے ہیں۔

تقریباً نصف بل کی خواندگی ہوئی اور تاخیر کی وجہ سے اسے ملتوی رکھا گیا، افسوس کہ پھر اتنا وقت نہ نکل پایا، کہ یہ حقیر اور جناب شعیب عمر صاحب اس مسئلہ پر ایک ساتھ بیٹھ سکیں۔

آئندہ صبح 'جمیعت علماء نٹال' کے دفتر میں علماء کا خصوصی اجتماع رکھا گیا تھا، اس نشست میں مولانا محمد یونس پٹیل صاحب نے مختصر افتتاحی گفتگو کے بعد اس حقیر کو ''مسلم پرسنل لا'' کی شرعی حیثیت پر اظہار خیال کی دعوت دی، راقم الحروف نے اسلامی قانون کے مختلف شعبے اور دارالاسلام اور دارالکفر میں ان سے متعلق احکام پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلم پرسنل لا کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں ہندوستان میں بزرگوں کی جو خدمات رہی ہیں، ان کو بھی واضح کیا، پھر حاضرین کے سوالات —— جو اس مسئلہ اور دوسرے مسائل سے متعلق تھے —— کے جوابات دیئے، آج شام میں مغرب کے بعد مسلمان ڈاکٹروں کے ساتھ ایک خصوصی نشست طے تھی، میں ڈاکٹر سید سلمان صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ کر یہاں پہنچا، یہ ملاقات مسلمان ڈاکٹروں کی تنظیم ''اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن'' (I.M.A) میں رکھی گئی تھی، جس میں شہر ڈربن کے چند ممتاز مسلم ڈاکٹر شریک تھے، اسی تنظیم نے حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ کے سفر جنوبی افریقہ کے موقعہ سے کچھ میڈیکل مسائل پیش کئے تھے، جو اسلامک فقہ اکیڈمی کی تاسیس کا محرک بنا، شروع میں ہم نے اسلام میں میڈیکل سائنس کی اہمیت کے موضوع پر مختصر خطاب کیا، اس کے بعد ڈاکٹر حضرات نے مختلف میڈیکل

سوالات پیش کئے اور اس سلسلہ میں فقہی نقطۂ نظر کی وضاحت چاہی، اس نشست میں ڈاکٹر سید سلمان صاحب کے علاوہ جناب شعیب عمر صاحب بھی شریک تھے، یہی دونوں حضرات ہم لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض انجام دیتے رہے، بہت سے سوالات وہ تھے، جن کے جواب دیئے گئے، اور بعض سوالات کے بارے میں میں نے معذرت کی کہ علماء ہند سے مزید تبادلۂ خیال کے بعد ہی میں اس کا جواب دے سکوں گا، یہ بہت ہی علمی اور میرے ذوق کے مطابق نشست رہی۔

یہ تنظیم مختلف علمی اور رفاہی کام انجام دیا کرتی ہے اور خاص کر میڈیکل مسائل اور حفظانِ صحت سے متعلق اُمور کو اسلامی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس ادارہ کے تحت مختلف غریب بستیوں میں ہیلتھ سنٹر قائم ہیں، مختلف مسائل پر سیمینار بھی منعقد کئے جاتے ہیں، پمفلٹ شائع کئے جاتے ہیں، اور بلا امتیاز مذہب وملت رفاہی خدمات انجام دی جاتی ہیں، مختلف مسائل پر انھوں نے ورقئے اور کتابیں شائع کی ہیں، اگر ہندوستان میں بھی مختلف شہروں میں مسلمان ڈاکٹرس ایسی تنظیمیں قائم کریں، تو یقیناً اس طرح نہ صرف خدمت خلق کا کام ہوگا، بلکہ برادرانِ وطن میں مسلمانوں کے تئیں جو غلط فہمی اور وحشت پائی جاتی ہے، اس کا بھی ازالہ ہوسکے گا۔ **وباللہ التوفیق** .

عشائیہ کے بعد کسی قدر تاخیر سے ہم اپنی قیام گاہ واپس آئے، آج عشاء کے بعد 'برکۃ بینک' میں اُمور شرعی کے نگراں مولانا شعیب جوسف سے ملاقات طے تھی، چنانچہ وہ اور مولانا محمد سلیمان پہلے سے موجود تھے، عزیزی مولانا شعیب جوسف، "**المعھد العالی للتدریب القضاء والافتاء**" پھلواری شریف پٹنہ میں زیر تعلیم رہ چکے ہیں، اس طرح یہ پہلے سے واقف تھے انھوں نے، برکۃ بینک کا طریقۂ کار تفصیل سے پیش کیا، بعض مسائل پر گفتگو ہوئی، ماشاء اللہ یہ دونوں حضرات فہیم بھی ہیں اور سلیم بھی، اور اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں، سفر ڈربن میں ساتھ ساتھ رہے اور بڑی خدمت بھی کی۔

۱۲ستمبر کو جمعہ تھا، جمعہ سے پہلے ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب کی رفاقت میں 'مدرسۃ الصالحات' حاضر ہوا، یہ لڑکیوں کا مدرسہ ہے اور اس میں پورے درسِ نظامی کے بجائے مختصر تربیتی کورس پڑھایا جاتا ہے، اس کے بانی حضرت مولانا محمد یونس پٹیل صاحب ہیں، اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس مدرسہ میں پردہ اور شرعی حدود کی رعایت پوری طرح ملحوظ رکھی گئی ہے اور محض یہاں کے رہن سہن کو دیکھ کر مختلف سیاہ فام خواتین کو اسلام قبول کرنے کی توفیق میسر آئی ہے، یہیں سے ہم لوگ ڈربن کی جامع مسجد گئے، جس میں مولانا پٹیل امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، یہاں جمعہ میں بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے اور دور دور سے لوگ آتے ہیں، جمعہ سے پہلے مولانا نے چند منٹ اس حقیر کا تعارف کیا اور خطاب کی دعوت دی، نصف گھنٹہ میں نے خطاب کیا، پھر مولانا نے بنفس نفیس انگریزی زبان میں اس کی ترجمانی فرمائی، نماز کے بعد مدرسۃ الصالحات میں ہی ظہرانہ ہوا، جس میں شہر کے مختلف علماء اور معززین بھی شریک تھے، ان ہی شرکاء میں مولانا محمد فاروق بھی تھے، جو مدرسہ مسیح العلوم جلال آباد (انڈیا) کے فاضل اور حکیم اختر حسین صاحب (کراچی) کے مجاز بیعت ہیں، آج بعد مغرب جناب زین فخر الدین ایڈوکیٹ کے مکان پر وکلاء کے ساتھ ایک نشست رکھی گئی تھی، جو مسلم وکلاء کی تنظیم "AMAL" کی دعوت پر تھی، اس نشست کا خاص موضوع ''مسلم پرسنل لا'' تھا، راقم الحروف نے مسلم پرسنل لاء کی شرعی حیثیت اور اس کی تنفیذ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں پر مختصر خطاب کیا، پھر ان کے سوالات کے جواب دیئے، یہ نشست خاصی دیر تک جاری رہی، جو خالص فقہی اور قانونی رنگ لئے ہوئے تھی، بحمد اللہ حاضرین نے جواب پر بہت اطمینان کا اظہار کیا۔

۱۳ستمبر کو ہم لوگوں کا صبح کا ناشتہ مولانا احمد عمر جی کے یہاں تھا، یہ جناب شعیب عمر صاحب کے بڑے بھائی ہیں، جلال آباد سے فارغ ہیں، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ سے اصلاحی تعلق تھا، بہت خلیق، بہت متواضع اور بہت ہی منکسر المزاج، یہیں ان کے والد ماجد

سے بھی ملاقات ہوئی، دراز قد، سرخ وسپید رنگ، دودھ سی سفید گھنی داڑھی، علماء اور اہل علم سے بڑی محبت کرنے والے، خلیق وملنسار، مختصر ملاقات ہی نے دونوں حضرات سے بہت اُنس سا پیدا کر دیا، ان ہی کے مکان پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کا قیام رہ چکا ہے، اپنے ان معزز مہمانوں کے بہت سے متاثر کن واقعات ان حضرات نے سنائے، قاضی صاحب کے بارے میں مولانا احمد عمر جی نے بتایا کہ ایک دن یہ بات طے پائی کہ قاضی صاحب رات میں کتابوں سے مراجعت کر کے لکھاتے جائیں گے اور وہ اسے انگریزی میں منتقل کرتے جائیں گے، تاکہ ڈاکٹر حضرات کے سوالات کے جوابات دیئے جاسکیں، رات کے ایک، ڈیڑھ بجے تک مولانا احمد عمر جی ساتھ دے سکے، اس کے بعد انھوں نے خواہش کی کہ قاضی صاحب بھی آرام کریں اور وہ بھی آرام کریں گے، قاضی صاحب نے انھیں اجازت دے دی، فجر کے وقت جب انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور خیال کیا کہ قاضی صاحب سو گئے ہوں گے، تو دیکھتے ہیں کہ لیمپ جل رہی ہے، چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی ہیں اور قاضی صاحب مطالعہ میں محو ہیں، جب مولانا عمر جی نے کہا کہ فجر کی اذان ہوگئی ہے، تو قاضی صاحب چونک کر بیٹھ گئے، کہ اچھا اتنا وقت ہوگیا، یہ تو خیال ہی نہیں رہا، یعنی رات بھر مطالعہ اور کتب بینی میں غرق رہے۔

آج پورٹ شیپشن کا پروگرام تھا، شیپشن (Shepstone) ایک انگریز کا نام تھا اور سو سال پہلے یہی جنوبی افریقہ کی بندرگاہ تھی، یہاں ڈھائی تا تین ہزار کی آبادی ہے، جس میں تقریباً پانچ سو مسلمان ہیں، یہیں جامع مسجد میں نماز ظہر ادا کی گئی، اور نماز کے بعد کچھ دیر علماء سے خطاب کیا گیا، یہاں ہمارے میزبان حافظ محمد ایوب صاحب تھے، بڑے ہی مخلص اور دوست نواز اور حضرت قاضی صاحب کے عاشقوں اور خاص محبین میں، یہاں اس مرکزی مسجد کے علاوہ تین اور مسجدیں بھی ہیں، جن میں ایک ''مسجد بلال'' سے موسوم ہے، یہ سیاہ فام نو

مسلموں کی مسجد ہے، عصر تک ہم لوگوں نے یہیں آرام کیا، یہ چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا اور خوبصورت شہر ہے، اور ڈربن سے ایک سو بیس کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، لیکن عمدہ اور ہموار سڑک کی وجہ سے دوری کا احساس نہیں ہوتا، واپسی میں ہم لوگ جامعہ تعلیم الدین اسپنگو (Ispingo) پہنچے، یہ صوبہ نیٹال کے بڑے مدارس میں ایک ہے، جہاں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، اور اس میں سیاہ فام طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے، یہاں مغرب بعد پوری ریاست کے علماء کا خصوصی اجتماع رکھا گیا تھا، چنانچہ مغرب کے ساتھ ہی مدرسہ کا مرکزی ہال علماء سے پُر ہوگیا، مولانا پٹیل صاحب نے تمہیدی اور تعارفی گفتگو کی، پھر اس حقیر نے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ انسانیت اور اُمت سے متعلق علماء کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی اور حاضرین کے سوالات کے جواب دیئے، اجتماع میں بعض علماء اور مدارس کے اساتذہ نے خواہش کی حدیث کی کہ کسی کتاب میں سے ایک دو حدیث کا درس دے کر حدیث کی اجازت دی جائے؛ لیکن چوں کہ وقت زیادہ ہو چکا تھا اور موسم میں کسی قدر خنکی بھی تھی، اس لئے معذرت کی گئی۔

۱۴ستمبر کو ایک تفریحی پروگرام رکھا گیا، یہ پروگرام مفتی زبیر بیات، مفتی جمعیۃ علماء نٹال کی رفاقت میں ہوا، اسپر نگر جو ڈربن سے ۲۷ کیلو میٹر کے فاصلہ پر سمندر کے کنارے واقع ہے، ہم لوگ وہاں پہنچے، ظہر کی نماز شہر کی جامع مسجد میں ادا کی، اسی مسجد میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے آخری اعتکاف فرمایا تھا، یہاں مفتی بیات صاحب نے ایک ’ اسلامک انفارمیشن سنٹر‘ قائم کر رکھا ہے، یہ ایک دعوتی ادارہ ہے، جس میں چھوٹی سی لائبریری، وضو اور نماز وغیرہ کی جگہ ہے، اس سنٹر کے قیام کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے، لیکن اب تک ساڑھے تین ہزار غیر مسلم بھائیوں نے یہاں آکر اسلام پر تعارفی کتابیں حاصل کی ہیں اور ۷۵ افراد سنٹر کی کوشش سے مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں، مفتی صاحب نے یہاں کے مشہور ’’زولو‘‘ قبیلہ کے سیاہ فام نومسلم شیخ اسماعیل کو داعی مقرر کیا ہے، نومسلموں کی تربیت کے لئے ایک مرد اور ایک خاتون مبلغ مستقل طور پر مقرر ہیں، اور بیس اشخاص اعزازی طور پر اس کام میں تعاون کرتے ہیں، یہ

سال میں تین بڑے پروگرام کرتے ہیں، جس میں زولوقبیلہ کے ارکان کو دعوت دیتے ہیں، مفتی صاحب نے غیر مسلم بچوں کو مسلمان بچوں کے ساتھ تعلیم میں شریک رکھنے کے لئے مسجد کی توسیع کی ہے اور غیر مسلموں کا جلسہ بھی مسجد کے تہہ خانہ ہی میں رکھتے ہیں، اس کا غیر مسلم واردین پر خاص اثر پڑتا ہے، اسی طرح کے ایک جلسہ میں جو غالباً کسی کتاب کی رسم اجراء کے سلسلہ میں تھا، ایک مسلمان زولوداعی ''داؤدانگوانے'' نے زولوقبیلہ کے بادشاہ ''گڈول زویلٹنی'' کو علانیہ اسلام کی دعوت دی، بہر حال مفتی صاحب کی ان دعوتی خدمات کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا اور خیال ہوا کہ اگر اسی طرح مسلمان دوسرے خطوں میں بھی دعوت اسلام کے کام کی طرف متوجہ ہوں تو ان شاء اللہ ایک بڑا انقلاب آ سکتا ہے۔

یہاں ''زکریا مسلم اسکول'' بھی قائم ہے، مفتی زبیر صاحب ہی اس کی بھی سرپرستی کرتے ہیں، اس مدرسہ میں پانچ سو طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، جن میں بیس فیصد سیاہ فام ہیں، ماشاء اللہ ساؤتھ افریقہ جیسے ماحول میں بھی یہاں نوے فیصد طالبات نقاب میں ہوتی ہیں، اس اسکول میں حفظ قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام بھی ہے، جس سے اب تک تیس طلبہ نے حفظ کی تکمیل کی ہے، اس شہر میں ایک روڈ مہاتما گاندھی جی کے نام سے بھی موسوم ہے۔

ہم لوگوں نے مفتی زبیر صاحب کے یہاں ظہرانہ تناول کیا اور ظہر کی نماز پڑھ کر سمندر کا لطف لینے ساحل کی طرف چلے، ساحل سمندر سے ملی ہوئی روڈ جس سے بار بار سمندر کی بے چین موجیں گلے ملتی تھیں، اور سڑک سے متصل خوبصورت پھلواریوں میں گھرا ہوا دومنزلہ مکان، جس کے بالا خانہ سے سمندر کا منظر صاف نظر آتا تھا اور بادِ نسیم کے جھونکے رہ رہ کر اٹھکھیلیاں کرتے تھے، یہ مکان اصل میں عبدالقادر ڈیسائی عرف بھائی گوڑہ کا تھا، حکیم اختر حسین صاحب (کراچی) خلیفہ حضرت مولانا ابرارالحق صاحبؒ ہردوئی بھی یہاں کئی روز مقیم رہ چکے ہیں، ان کی تشریف آوری پر یہ مکان ایک خانقاہ میں تبدیل ہوجایا کرتا تھا، اب انھوں نے یہ مکان ایک امریکی نژاد مسلمان کے ہاتھ فروخت کردیا ہے، موسم میں خنکی تھی ہی، سمندر سے آنے والی سرد

ہواؤں نے اور زیادہ ٹھنڈک پیدا کردی تھی، اس لئے میں نے تھوڑی دیر گوشۂ عافیت منتخب کر کے آرام کیا اور رفقاءِ سفر ڈاکٹر سید سلمان صاحب، مفتی زبیر صاحب اور مولانا عبداللہ کتر ادہ بالا خانہ میں بیٹھ کر سمندر کا لطف لیتے رہے، میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ان کے ساتھ شریک محفل ہوگیا، سمندر کی بے چین، مچلتی ہوئی لہروں کا نظارہ کرتے اور خنک بار ہواؤں کا لطف اُٹھاتے ہوئے گرم گرم چائے پی گئی اور عصر کی نماز پڑھ کر ہم لوگ وہاں سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ صوبہ نیٹال میں میرا آخری دن تھا، ۱۶ستمبر کو صبح آٹھ، نو بجے ہم جوہانسبرگ کے لئے روانہ ہوگئے، ڈربن کا یہ ایک ہفتہ کا سفر بہت ہی پر لطف، خوشگوار اور مفید رہا اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا ہم اپنے ہی ملک میں مقیم ہیں، مگر افسوس کہ مسلکی اختلافات کی جو کیفیت ہندوستان میں ہے، ڈربن میں بھی یہ رنگ پوری طرح نمایاں ہے ’فیا أسفاہ و یاعجباہ ‘ قریب نو بجے صبح ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب کے ساتھ ہم لوگ نیو کاسل (New Castle) کے لئے روانہ ہوئے، راستہ میں پیٹر بٹس برگ کا علاقہ ملا، یہیں گاندھی جی مقیم تھے، یہاں سیاہ فام لوگ کا کچھ ایسا خطرہ رہتا ہے کہ آدمی جہاں چاہے اپنی گاڑی روک نہیں سکتا، چنانچہ راستہ میں ایک جگہ پٹرول پمپ کے پاس ہم لوگ رُکے، یہیں پر چائے وغیرہ پی اور ضروریات سے فارغ ہوکر ’ایکسٹ کورٹ‘ پہنچے، اس شہر کا کچھ علاقہ پہاڑی پر اور کچھ نشیب میں واقع ہے اور نشیب وفراز نے شہر کے منظر کو بہت ہی پُر کیف بنا دیا ہے، ہم لوگ بلندی کی طرف چڑھتے ہوئے ’’صراط الحق اسکول‘‘ پہنچے، مفتی محمد ابراہیم صالح جی اس اسکول کے ذمہ دار ہیں، جس میں میٹرک تک تعلیم ہوتی ہے اور تین سو طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، بڑے اچھے دینی واخلاقی ماحول کا احساس ہوا، نماز ظہر کے بعد تھوری دیر طلبہ سے خطاب کا بھی موقع ملا، اسلامی ماحول کی پاکیزگی و نظافت سے متاثر ہوکر ماشاء اللہ یہاں کئی غیر مسلم حضرات نے بھی اپنے بچوں کو شریک تعلیم کیا ہے، ایک سیاہ فام شخص نے یہاں اپنی پوتی کو داخل کیا اور اس کی تربیت سے

متاثر ہوکر خود مسلمان ہوگیا، مفتی ابراہیم صالح جی ایک منکسر المزاج اور متدین عالم دین ہیں، ان ہی کے یہاں ہم لوگوں نے ظہرانہ تناول کیا اور پھر جلد ہی ہم لوگ 'نیوکاسل' کی طرف روانہ ہوگئے، اب ہمارے اور ڈاکٹر سلمان صاحب کے ساتھ ساتھ مفتی ابراہیم صالح جی بھی تھے، ٹھیک عصر کے وقت ہم لوگ دارالعلوم نیوکاسل پہنچے، اس دارالعلوم میں طلبہ کی تعداد کوئی تین، ساڑھے تین سو ہے، اور دورۂ حدیث تک تعلیم ہے، لیکن اس ادارہ کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہاں بڑی تعداد ''ملایانسل'' کے طلبہ کی ہے، اس لئے یہاں ذریعۂ تعلیم عربی اور انگریزی ہے اور فقہ حنفی اور فقہ شافعی دونوں پڑھائی جاتی ہے، مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا محمد قاسم سیما صاحب جنوبی افریقہ کے بزرگ اور باوقار علماء میں ہیں، بڑی شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آئے اور کرم گستری کا معاملہ فرمایا۔

عصر کی نماز کے بعد مسجد میں راقم الحروف نے تعلیم وتحقیق کے کام کی اہمیت اور فقہی ومسلکی اختلاف کے معاملہ میں تحمل اور برداشت سے کام لینے کی ضرورت پر خطاب کیا، ایک پاکستانی فاضل —— جو دارالعلوم کے اونچے اساتذہ میں ہیں —— نے بڑی خوش اُسلوبی سے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور آیات واحادیث کے اقتباس سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے ترجمان کا حق ادا کیا ہے، مغرب کے بعد خصوصی نشست ہوئی، صوبہ نیٹال اور ٹرانزوال دونوں طرف کے مؤقر علماء جمع تھے، مغرب کے فوراً بعد علماء کی اس نشست میں مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر گفتگو ہوئی اور جو ''میرج بل'' اس وقت جمیعۃ العلماء کے زیر غور ہے، اس پر موافقانہ اور مخالفانہ رائے سامنے آئی، راقم الحروف نے ان تمام آراء کو سامنے رکھ کر گفتگو کی اور دونوں صوبوں کے چھ، سات مؤقر علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی، جو اس مسئلہ پر آخری فیصلہ کرے اور سبھوں نے اس سے اتفاق کیا، اس نشست میں جو اس سال فاضل مفتی محمد ابراہیم ڈیسائی بھی موجود تھے، جو جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے فاضل اور تربیت یافتہ ہیں، اور ماشاء اللہ اچھی استعداد کے حامل ہیں، بڑی محبت سے ملے اور احترام کا معاملہ کیا۔

جوہانسبرگ سے طویل سفر طے کر کے مولانا عباس علی جینا، مولانا محمد ایوب کاچوی اور مولانا ظہیر احمد صاحب وغیرہ تشریف لائے تھے، یہیں اپنے مہربان خاص ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور دوسرے مخلصین سے الوداعی مصافحہ کیا اور جوہانسبرگ کے اس قافلہ کے ساتھ روانہ ہوگیا، رات گئے ہم لوگ جوہانس برگ پہنچے، جمیعت علماء ٹرانزوال دارالعلوم کے ذہین فضلاء کے لئے تخصص کا شعبہ قائم کرنا چاہتی ہے، اس کے نصاب اور نظام پر غور کرنے کے لئے اگلی صبح ''جمیعت کانفرنس ہال'' میں ذمہ داروں کی ایک خصوصی میٹنگ رکھی گئی اور راقم الحروف کے مشورہ سے نصاب اور طریقہ تعلیم کے ایک خاکہ کی ترتیب عمل میں آئی، آج ہی مولانا محمد داؤد صاحب اور مفتی محمد صاحب کے ساتھ جوہانس برگ کے مشہور زوالوجیکل پارک جانے کا موقع ملا، اس زو میں افریقہ کے نادر الوقوع جنگلی جانور ہیں، یہیں ایسے بن مانس دیکھنے کو ملے کہ گویا کسی سیاہ فام انسان کے جسم پر بال اُگ آئے ہوں، افریقہ کے شیر ببر مشہور ہیں، یہاں ان شیروں کو فینسنگ کے بہت سے بڑے حصار میں کھلی حالت میں رکھا گیا ہے اور ایک طرف سے دوسری طرف اوپر سے برج بنادیئے گئے ہیں، جن سے بہ آسانی شیر اپنی فطری حالت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اگلے دن ۷ ستمبر کو دوپہر کے جہاز سے براہ دوبئی بمبئی واپسی ہوئی، ایرپورٹ پر مولانا عباس علی جینا کی قیادت میں الوداع کہنے کے لئے بہت سے علماء موجود تھے، محسوس ہوا کہ یہاں ایرپورٹ پر اتنی زیادہ تفتیش اور اس تفتیش کی وجہ سے وحشت کا ماحول نہیں ہوتا، جس سے انسان ہندوستان اور خلیجی ممالک میں دوچار ہوتا ہے، اسی طرح محبت اور لطف وعنایت کی سوغات کے ساتھ مسافر اپنے وطن کو واپس پہنچا۔

واقعہ ہے کہ جنوبی افریقہ قدرتی مناظر سے بھرپور اور وسائل سے معمور ملک ہے، جو کہیں سمندر کے ساحلوں، کہیں سبز پوش پہاڑیوں اور کہیں گھنے جنگلات اور ان میں جنگلی جانوروں کی وجہ سے سیاحوں کے لئے نہایت ہی دلچسپ خطہ ہے، اور خوشگوار موسم سونے پر

سہاگہ کے مصداق ہے ، یہاں کی ہموار اور کشادہ سڑکوں ، آراستہ و پیراستہ بازاروں ، خوبصورت اور بلند و بالا عمارتوں ، وسیع اور معقول ریلوے نظام وغیرہ کے اعتبار سے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ ہم افریقہ جیسے پسماندہ براعظم میں ہیں ، اس ملک پر انگریزوں اور ڈچوں نے تین سوسال سے زیادہ حکومت کی ہے اور کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے زیر قبضہ ملکوں میں سب سے زیادہ اسی خطہ کی خدمت کی ہے ، شاید انھیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ کبھی یہاں کے سیاہ فام مظلوموں کا نصیب بھی جاگے گا اور مٹھی بھر مغربی حکمرانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوگا ، یہ افریقہ کے بڑے ملکوں میں ہے ، اور اس ملک کے اندر دو اور چھوٹے چھوٹے ممالک لیسوٹو (Lesoto) اور سوزی لینڈ (Swazi Land) آباد ہیں ، پہلے تو یہ ملک صرف چار صوبوں میں منقسم تھا ، لیکن اب انھیں گیارہ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ، جو ہانس برگ ، ڈربن اور کیپ ٹاؤن (جن کو اب Gaurteng, Kwazulu, Natal اور Wes tercap کہا جاتا ہے) زیادہ معروف صوبے ہیں ، اس ملک کی آبادی تقریباً پچاس ملین ہے ، جن میں صرف ڈیڑھ ملین مسلمان ہیں ، موزمبیق ، بوتسوانہ ، زمبابوے اور زامبیا پڑوسی ممالک ہیں ، راجدھانی جوہانس برگ کے قریب پریٹوریا نامی شہر میں ہے ، لیکن پارلی کیپ ٹاؤن میں ہے ، یہاں کی سرکاری اور عوامی زبان انگریزی ہے ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بول چال میں افریکان بھی بولی جاتی ہے ، ملک سے متعدد اخبارات نکلتے ہیں ، راقم الحروف نے ڈربن میں Daily News نامی اخبار دیکھا ، جو تقریباً ایک ملین شائع ہوتا ہے ، اور اس کا اتوار ایڈیشن اخباری سائز میں سو صفحات سے بھی زیادہ پر مشتمل ہوتا ہے ۔

اس ملک میں صدیوں ملک کے اصل باشندوں —— سیاہ فام لوگوں —— کو جاہل بنا کر اور بہت ہی دبا کر رکھا گیا ہے ، اور ان کے ساتھ بہت ہی غیر انسانی حرکتیں روا رکھی گئی ہیں ، ان کو سفید فام لوگوں کے ریلوے ڈبہ میں چڑھنے کی اجازت نہیں تھی ، وہ سفید فام کے لئے مخصوص پارک میں نہیں جاسکتے تھے ، ان کے لئے ضروری تھا کہ شام کے چھ بجے تک شہر سے باہر نکل

جائیں اور صبح کے چھ بجے سے پہلے شہر میں نہیں آئیں، شہر سے باہر الگ تھلگ ان کی آبادیاں رکھی جاتی تھیں، ان کے مارکٹ بھی الگ تھے، اور سفید فام لوگوں کی مارکٹ میں آنا ان کے لئے ممنوع تھا، ہندوستانیوں کا معاملہ نسبتاً غنیمت تھا، گو انھیں بھی سفید فام لوگوں کے ساتھ بود و باش وغیرہ کی اجازت نہیں تھی، تاہم بمقابلہ سیاہ فاموں کے ان کے ساتھ تحقیر کا معاملہ کم ہوتا تھا، میں نے بس اسٹینڈوں پر وہ بینچیں بھی دیکھیں جن پر لکھا ہوا ہے کہ ''یہ صرف سفید فام لوگوں کے لئے ہے''، نئی حکومت نے ایسی چیزوں کو مٹانے کے بجائے باقی رکھا ہے، تاکہ آنے والے لوگ ان کی صدہا برس کی مظلومیت کو کھلی آنکھوں دیکھ سکیں۔

اس ملک کی تاریخ کے بعض ایسے پہلو ہیں، جو ہندوستان کے عام باشندوں کے لئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے لمحہ فکر یہ ہیں، ہندوستان کی آزادی کی خوں چکاں تاریخ اور اس موقع سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا جو قتل عام ہوا، اس کی کہانی آج تک لوگوں کے لئے نوک زبان ہے، لیکن جنوبی افریقہ میں جب ملک آزاد ہوا، تو آبادی کا تناسب یہ تھا کہ ۱۲ فیصد سفید فام، ۱۲ فیصد سیاہ فاموں سے ان کی اولاد اور ان کی نسل، اور ۲ فیصد ہندوستانی، باقی ۷۰ فیصد سے زیادہ سیاہ فام لوگ تھے، اگر یہ قتل و خون پر اتر آتے، تو دوسری نسلوں کے لوگوں کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیتے اور ایسا ہونا قابل تعجب امر نہیں تھا، لیکن سیاہ فام قائد نیلسن منڈیلا نے بڑی ہی ہوش مندی سے کام لیا، اپنی قوم کو تحمل و بردباری کی تلقین کی اور سمجھایا کہ اگر ملک میں افراتفری پیدا ہوئی، تو ایک لٹا پٹا ملک تمہیں ہاتھ آئے گا، اس لئے عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ امن و سلامتی کے ساتھ ملک کے اقتدار کو حاصل کیا جائے، چنانچہ اتنے بڑے انقلاب میں ایک قطرۂ خون بھی بہنے کی نوبت نہیں آئی۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی چند باتیں، مسلمانانِ ہند کے لئے نمونہ کا درجہ رکھتی ہیں، اول یہ کہ انھوں نے سیاہ فام لوگوں کی مظلومیت کے زمانہ میں ان کا تعاون کیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی سیاہ فام آبادی کے دل میں

مسلمانوں کے تئیں نرم گوشہ پایا جاتا ہے، دوسرے گجرات کے جو مسلمان وہاں پہنچے، انھوں نے تجارت کو اپنا مشغلہ بنایا، اسی لئے اپنی آبادی کے اعتبار سے تجارت اور کاروبار میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہے اور وہ ملک کی ایک نمایاں معاشی قوت ہیں، اس حسن سلوک اور معاشی قوت کا نتیجہ ہے کہ حالاں کہ ان کی آبادی صرف ڈیڑھ فیصد ہے، لیکن ۳۶۰ رکنی پارلیامنٹ میں ۲۰ مسلمان ارکان ہیں، اور عام طور پر یہ دین دار اور مذہبی لوگ ہیں، ۵ مسلمان منسٹر ہیں، حکومت کے ایڈوکیٹ جنرل بھی مسلمان ہیں اور مختلف عوامی اداروں میں ان کی بہت نمایاں نمائندگی ہے۔

جنوبی افریقہ کے مغربی ماحول میں مسلمانوں نے اپنی دینی شناخت کو جس طرح قائم رکھا ہے، وہ بھی نہایت قابل تعریف ہے، اس ملک میں یوں تو زمانۂ قدیم میں بعض عرب سیاحوں کی آمد کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس کی معلوم تاریخ میں سترہویں صدی میں ملیشیاء سے مسلمان یہاں لائے گئے اور وہ اس طرح کہ اس وقت ملایا اور اس کے قریبی جزیروں پر ہالینڈ کی حکومت تھی، جہاں مجاہدین موقع بہ موقع علم حریت بلند کرتے رہتے تھے، اور ان میں پیش پیش یہاں کے علماء تھے، چنانچہ ڈچوں نے یہاں سے تقریباً تین سو مجاہدین کو گرفتار کر کے جنوبی افریقہ کے آخری ساحلی شہر کیپ ٹاؤن میں بھیج دیا، ان ہی مجبور و مقہور غلام بنائے گئے مسلمان مجاہدین کے ذریعہ اس ملک میں اسلام کا شجرۂ طوبیٰ لگایا گیا، چنانچہ صوبۂ کیپ ٹاؤن میں عام طور پر ملایا نسل کے مسلمان ہی پائے جاتے ہیں اور میں نے سنا کہ وہاں ایک حد تک عربی زبان بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، پھر تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ملک کے شمالی شہر جوہانس برگ میں گجراتی مسلمانوں کا قافلہ فروکش ہوا، بہر حال ان ملائی اور ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی مذہبی شناخت کو پوری قوت کے ساتھ باقی رکھا اور دوسرے اہل وطن کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت خلق کے ذریعہ اپنے تعلقات بھی استوار بلکہ خوشگوار رکھے، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لئے صحیح طریقۂ کار یہی ہے کہ ایک طرف پوری قوت کے ساتھ اپنے دینی شعائر کو تھامے رہیں

اور دوسری طرف خدمت اور حسن سلوک کے ذریعہ دوسری اقوام کے ساتھ صلح وآشتی اور اُخوت ودوستی بھی برقرار رکھیں۔

اس ملک میں علماء کا طریقۂ کار بھی بعض پہلوؤں سے ہندوستان کے علماء کے لئے قابل اتباع ہے، ان میں پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستان سے جو علماء گئے، ان کی زبان اُردو یا گجراتی تھی اور گھروں میں بھی یہی زبانیں بولی جاتی تھیں، لیکن جنوبی افریقہ کی لسانی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے علماء نے اُردو اور عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کو اختیار کیا، چنانچہ موجودہ نسل کے علماء نہ صرف انگریزی زبان سے واقف ہیں، بلکہ ان میں انگریزی زبان کے اچھے مقرر اور اچھے رائٹر بھی موجود ہیں، خود جمیعت علماء ٹرانژوال اور جمیعت علماء نیٹال کی طرف سے انگریزی جرائد نکلتے ہیں، جو وہاں کے مقبول جرائد میں ہیں، ''اسلام ریڈیو'' سے ۹۰ فیصد پروگرام انگریزی میں ہی نشر کئے جاتے ہیں، جب کہ اکثر ناشرین علماء ہوتے ہیں، مدارس میں ابتدائی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی ہے، اس طرح مسلمان اور غیر مسلم عوام اور علماء کے درمیان کوئی لسانی گیپ نہیں ہے، ہمارے ہندوستان کے حالات اس سے بہت مختلف ہیں، ہندی ریاستوں کے علماء ہندی زبان سے واقف نہیں، آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر، اور اُڑیسہ وغیرہ میں علماء تلگو، کنڑی، مراٹھی، اُڑیہ وغیرہ سے یا تو نابلد ہیں، یا واقف ہیں تو محض عام بول چال کی حد تک، لٹریری زبان سے واقف نہیں، اس چیز نے علماء، غیر مسلموں اور دور دراز علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا کر دیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس لسانی خلیج کو پُر کیا جائے، تاکہ اپنے علاقہ میں بسنے والے لوگوں سے ان کا براہ راست ربط ہو۔

ہندوستان میں علماء کا دائرہ کار زیادہ تر مساجد اور مدارس تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، مدارس میں تدریس وانتظام اور مساجد میں امامت واذان، یہی علماء کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، مجھے ان مناصب کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی علماء کو دخیل

ہونا چاہئے ، یہ بات مجھے ایک حد تک جنوبی افریقہ میں نظر آئی ، وہاں ریڈیو، صحافت، خدمت خلق، مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی، مذہبی قیادت، قانونی مسائل میں مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ، ہر محاذ پر علماء موجود ہیں، جمیعت علماء کے تحت دینی اور عصری تعلیم دونوں میں مسلمانوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، ایڈس کے سلسلہ میں بلا تفریق مذہب وملت لوگوں کو اس بیماری سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے، خدمت خلق کے کام کئے جاتے ہیں، غرباء کا تعاون کیا جاتا ہے، حلال گوشت کی نگرانی کی جاتی ہے، چاند کا متفقہ طور پر اعلان ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے مسلمانوں کی نگاہ علماء کی طرف اُٹھتی ہے۔

ایک اور اہم بلکہ اہم ترین کام ''دعوت دین'' کا ہے، ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، ان میں دعوتِ اسلام سے تغافل کا بڑا حصہ ہے، یہاں (جنوبی افریقہ) ماشاء اللہ علماء نے اس سلسلہ میں ایک حد تک سعی کی ہے یا شروع کی ہے، جمیعت علماء نے کئی مقامات پر سیاہ فام آبادی میں درسگاہیں قائم کی ہیں، ان درسگاہوں میں تعلیم بھی ہوتی ہے اور تعلیم کے واسطہ سے دعوت کا کام بھی انجام پاتا ہے اور تالیف قلب کے طور پر مقامی لوگوں کی مالی مدد بھی کی جاتی ہے، چوں کہ جنوبی افریقہ میں فی الحال مسلمانوں کے تئیں ایک نرم گوشہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور خود ہندوستان میں بھی علماء کو اس طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھ ایک کمزوری اور کوتاہی جو اس طبقہ میں دیکھنے کو ملی وہ زمانہ شناسی کی کمی اور بے لچک رویہ پر اصرار ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ علم شر کے مقابلہ میں خیر کو جاننے کا نام نہیں، بلکہ ''خیر الشرین'' یعنی دو شر میں سے بہتر یعنی کم تر درجہ کے شر کو جاننے کا نام ہے؛ لیکن افسوس کہ اکثر لوگ اس صلاحیت کے حامل نہیں ہیں، مثلاً جنوبی افریقہ میں غلامی کے دور میں مسلمانوں نے سیاہ فام قائدین کے ساتھ بہتر سلوک کیا تھا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ملک کی آزادی کے بعد ''نیلسن منڈیلا'' نے مسلمانوں سے پیشکش کی کہ اگر

ان کا کوئی مطالبہ ہو، تو وہ اسے پورا کرنا چاہتے ہیں، اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمعیت علماء کے ذمہ داروں نے حکومت سے خواہش کی ان کے لئے مسلم پرسنل لا پر عمل کی سہولت پیدا کی جائے ؛ چوں کہ یہ ملک طویل عرصہ تک غلامی کے زیر سایہ رہا ہے ؛ اس لئے انسانی حقوق کے معاملہ میں وہاں کی عوام بے حد حساس ہے اور مسلم پرسنل لا کی بعض دفعات پر معترض بھی۔

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جمعیت علماء ایک بل تیار کیا، اس سلسلے میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے مستقل سفر بھی فرمایا اور محترم جناب عبدالرحیم قریشی کو اپنے ساتھ لے کر گئے، مولانا محمد تقی عثمانی بھی ایک موقعہ سے تشریف لائے، میں گیا، تو یہ موضوع میرے سامنے بھی آیا ؛ لیکن محسوس ہوا کہ بہت سے علماء، فقہاء کے نصوص اور شارع کے نصوص میں فرق نہیں کرتے اور بعض اوقات میں ایک فقہی مسلک سے دوسرے فقہی مسلک کی طرف عدول سے بچتے ہیں، حالاں کہ اس کا انجام نظام کفر کو قبول کرنا ہوتا ہے، یہ ایک بنیادی کوتاہ فکری ہے، جس کا دینی نقصان بہت وسیع ہوتا ہے، تقلید لوگوں کو نفس کی پرستاری سے بچانے کے لئے ہے نہ کہ فقہاء کی آراء کو کتاب وسنت کا درجہ دینے کے لئے۔

دوسرا سفر

مؤرخہ: ۱۴ تا ۱۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو جنوبی افریقہ کا دوسرا مختصر سفر ''النور تکافل'' کی دعوت پر ہوا، جس میں پیش پیش مولانا فیض المنجو تھے، یہ وکیل بھی ہیں اور انھوں نے عالم کورس بھی کیا ہے، اس موقعہ سے ملیشیا کے پروفیسر معتصم باللہ بھی آئے ہوئے تھے، جن کی اسلامک بینکنگ اور اسلامی انشورنس پر انگریزی زبان میں کئی کتابیں ہیں اور بڑے متواضع اور منکسر المزاج ہیں، اس کمپنی نے مجھے اپنے شرعی ایڈوائزری بورڈ کا چیرمین منتخب کیا ہے، اسلامک انشورنس کا جو ماڈل بنایا گیا تھا، فقہی نقطۂ نظر سے میں نے اس میں بعض ترمیمات بھی پیش کی اور شرکاء نے اس کو قبول کیا، پروفیسر معتصم باللہ کی انکساری کی بات ہے کہ انھوں نے اس نسبت سے ہونے والے اجلاس عام میں میری نسبت سے کہا: ''هو شيخي و استاذي''۔

اس بار دواداروں کو دیکھ کر خاص کر مسرت ہوئی، ایک جمعیت علماء کے تحت قائم ہونے والا مرکز، جس میں عالم عرب کی جدید نصابی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعلیم دی جارہی ہے، ابھی یہ ابتدائی مرحلہ میں ہے؛ لیکن اُمید ہے کہ مستقبل میں اس کے وسیع اثرات مرتب ہوں گے، دوسرے ڈربن کے قریب مفتی محمد زبیر بیات کا قائم کیا ہوا ''معہد''، جس میں فقہ میں تخصص کرایا جاتا ہے، یہاں اساتذہ وطلبہ سے خطاب کرنے کا بھی موقعہ ملا۔

ڈربن کا ''فش ہاؤس'' مشہور ہے، جو مچھلیوں اور سمندر جانوروں کا عظیم میوزیم ہے، یہاں وہیل مچھلی کا طویل وعریض ڈھانچہ دیکھنے کا موقع ملا اور پانی کے بڑے بڑے ذخیرے میں جس کے چاروں طرف شیشے کی دیوار ہے شارک، ڈالفین اور مختلف مچھلیوں کو دیکھنے کا موقع ملا، ایک مچھلی جو چاندی کی طرح سفید تھی اور حجم میں ہاتھی سے بھی بڑی، یہ بھی نمائش میں شامل تھی۔

ڈالفین کا کھیل بھی دکھایا گیا، جس کو دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں، اسی میں ایک حصہ سانپوں کا بھی ہے، جس میں شیشے کے اس پار مختلف چھوٹے بڑے سانپ دیکھے جاسکتے ہیں، ایک ایسا سانپ بھی دیکھنے میں آیا، جس کے تھوک میں زہر ہے اور وہ مسلسل تھوکتا رہتا ہے، غرض کہ جانوروں کا یہ عجائب گھر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اسے دیکھ کر خدا کی قدرت اور اس کی کاریگری پر ایمان بڑھتا ہے، **ربنا ما خلقت هذا باطلا ، سبحانک فقنا عذاب النار.**

❑ ❑ ❑ ❑

چند ہفتے برطانیہ میں

برطانیہ اور مغربی یورپ اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ خطوں میں ہے، لیکن اس کی تہذیبی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے، ایک ہزار سال پہلے اس خطہ میں آدم خور انسان رہا کرتے تھے اور فرانس کے ساحلی علاقہ میں انسانی گوشت فروخت کئے جاتے تھے، اس علاقہ میں پہلا باضابطہ حکمراں کہا جاتا ہے کہ نورمنڈی ولیم (Nor Mandy Walium) بنا جو ایک غارت گر شخص تھا، یورپ میں اکثر شاہی خاندان کا تعلق اسی سے رہا ہے، برطانیہ میں اس وقت جو دستوری بادشاہت قائم ہے، یہ خاندان دراصل جرمنی سے تعلق رکھتا ہے، اس قبیلہ کا اصل نام (Anglo Saxon) ہے، برطانیہ کا قدیم مذہب بُت پرستی تھا اور اس مذہب کے ماننے والوں کو (Pagol) کہا جاتا تھا، اب بھی اس کے بعض مندر موجود ہیں، سترہویں صدی سے برطانیہ میں علمی ترقی کا آغاز ہوا، پھر بھی تہذیبی اعتبار سے یہ ملک ایشیائی ممالک کے مقابلہ بہت پیچھے تھا اور عورتوں کو بھی بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اب یہ ملک —— جسے برطانوی اب بھی (Great British) ''برطانیہ عظمیٰ'' کہتے ہیں—— سکڑ چکا ہے، اس جزیرہ کے رقبہ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک طرف سے تقریباً ۶۰۰ میل اور ایک طرف سے محض ۲۰۰ میل میں واقع ہے، لیکن تہذیبی اعتبار سے آج بھی پوری دنیا پر اس کی چھاپ موجود ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی آمد کا آغاز اس کے استعماری دور میں ہوا، جب ملیشیا اور بعض ملکوں سے کام کرنے کے لئے مسلمان یہاں لائے گئے، لیکن اب اس وقت اسلام برطانیہ کا دوسرا بڑا مذہب ہے، برطانیہ میں مجموعی طور پر دو ہزار سے زیادہ مسجدیں ہیں، جن میں ۷۰ یا اس سے کچھ زیادہ وہ مسجدیں ہے جو خاص طور پر زمین حاصل کرکے اپنے نقشہ کے مطابق بنائی گئی

ہیں، تقریباً دو ہزار مسلمانوں کے اپنے اسکول ہیں، پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں چار اور ایوان زیریں میں پانچ مسلمان نمائندے ہیں اور نہ صرف بعض محلے بلکہ بعض شہروں میں مسلم تہذیب کی ایسی چھاپ ہے، کہ انھیں دیکھ کر کسی مسلمان ملک میں ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

جو لوگ ہندو پاک میں پیدا ہوئے ہوں یا رہتے بستے ہوں، ان کے لئے برطانیہ کا نام نامانوس نہیں ہے، کیوں کہ برصغیر کے مختلف علاقوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے ۱۸ویں صدی میں برطانیہ کی حکومت قائم ہوگئی تھی، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی کے تخت اقتدار پر بھی قبضہ ہو گیا اور ۱۹۴۷ء تک ان کی حکمرانی سکہ رائج الوقت کی طرح قائم رہی، پھر جب ملک کو آزادی نصیب ہوئی تو اس طرح کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اور آزادی اور تقسیم کی یہ تقریب اس طرح آراستہ کی گئی کہ اس کی خوش رنگی کے لئے ہزاروں انسان کا خون پانی کی طرح بہایا گیا اور چند مکان ہی نہیں بلکہ شہر کے شہر جلا کر اور آگ کا دریا بہا کر رسم چراغاں ادا کی گئی، ان کرواہٹوں کا تحفہ برصغیر کے لوگوں کو برطانوی فرمانرواؤں سے ملا ہے اور آج بھی اس کی تلخ کامی کو وہ چکھ رہے ہیں اور ہر اگست کی ۱۵ تاریخ کو جب ہم یوم آزادی مناتے ہیں تو اپنے ان پرانے ''آقاؤں'' کا یاد آنا اور ان کا ذکر کرنا فطری بات ہے!

سترہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد یورپ نے تیز رفتار ترقی کی، برطانیہ اس علمی وسائنسی انقلاب کے قائدین میں رہا ہے اور آج بھی معاشی، صنعتی اور فوجی اعتبار سے وہ دنیا کی چند عظیم طاقتوں میں ایک ہے، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اسے مغرب میں قیادت واولیت کا اعزاز حاصل ہے، امریکہ نے گو صنعتی اور اس سے زیادہ فوجی قوت کے ذریعہ پوری دنیا کو فتح کر لیا ہے، لیکن مغربی تہذیب وروایات اور انگریزی زبان وادب کے اعتبار سے اب بھی برطانیہ کو مغرب میں مرکزیت حاصل ہے، اس لئے جب میرے محترم دوست مولانا محمد فاروق ملا (ڈائریکٹر الارقم انٹرنیشنل سنٹر) نے برطانیہ کے سفر کے لئے مدعو کیا تو میں نے بہ طیب خاطر اسے قبول کر لیا اور اپنی مصروفیات کے لحاظ سے اگست و ستمبر کے مہینے سفر کے لئے مختص کئے۔

چنانچہ ۲۰ اگست ۲۰۰۵ء کو میں حیدرآباد سے مولانا سرفراز احمد قاسمی اور مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی سلمہ کے ساتھ ممبئی میں مختلف پروگراموں میں شرکت کے بعد ۲۴ اگست کو صبح ۱۰ بجے جیٹ ایرویز کے ذریعہ لندن کے لئے روانہ ہوا، ایرپورٹ پر ان عزیزوں کے علاوہ ممبئی سے قاضی عبدالاحد فلاحی، مولانا عرفان فلاحی اور مولانا اشفاق قاضی وغیرہ بھی موجود تھے، جیٹ ایرویز نے حال ہی میں انٹرنیشنل پرواز میں قدم رکھا ہے اور اس کی سروس ایرانڈیا اور انڈین ایر لائنز کی بہ نسبت بہتر ہے، میں دن کے گیارہ بجے روانہ ہوا اور تقریباً ۱۰ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر اُترا، ایسا لگ رہا تھا کہ سورج بھی ہم لوگوں کا ہم سفر ہے، وقت گذرتا جاتا تھا اور سورج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ گردش میں تھا، ایرپورٹ بہت وسیع اور تمام عصری سہولتوں سے آراستہ ہے، انتقال پذیر برقی راستوں اور سیڑھیوں سے گذرتے ہوئے امیگریشن میں پہنچا، امیگریشن میں یہاں کام کرنے والوں کی بڑی تعداد رہتی ہے، جس میں انگریزوں کے علاوہ مختلف قومیتوں کے حامل برطانوی شہری بھی کام کرتے ہیں، اسی لئے اگر کسی مسافر کے لئے ترجمان کی ضرورت پیش آئی تو چنداں دشواری پیدا نہیں ہوتی۔

برطانیہ کے موجودہ حالات اور ۷ جولائی کے بم دھماکوں کے پس منظر میں میں بہت خوف زدہ اور متفکر تھا کہ پتہ نہیں کیا کیا سوالات کریں گے اور کیا سلوک روا رکھیں گے اور ملک میں داخل بھی ہونے دیں گے یا ایرپورٹ سے واپس کردیں گے؟ میں جس کاؤنٹر پر پہنچا، وہاں ایک انگریز آفیسر تھا، وہ بہت ہی خوش اخلاقی سے پیش آیا، مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کتنے دن رہنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ صرف ایک ماہ، اس نے کہا کہ اگر آپ اس سے زیادہ بھی رہیں تو کوئی پرابلم نہیں، پھر پاسپورٹ مجھے واپس کرتے ہوئے (Thankyou) کہنے کے بعد ''شکراً شکراً'' کہا، امیگریشن کی یہ پوری کارروائی بمشکل تین چار منٹ میں پوری ہوگئی، میں نے یہ تاثر قائم کیا کہ یہ حضرات آنے والوں کا بہتر طور پر خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں اچھے تاثرات کے ساتھ واپس کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، دوسری جگہ چاہے خود فساد

مچائیں لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے ملک میں امن وامان اور اتحاد واتفاق کی فضا قائم رکھیں، افسوس کہ ایشیائی ملکوں نے ترقی کے اس راز کو نہیں سمجھا ہے کہ اندرون ملک جو فساد واختلاف پیدا ہوتا ہے، وہ ملک کی ترقی کو متاثر کر دیتا ہے۔

امیگریشن سے باہر نکلنے کے بعد سامان لینے میں نسبتاً دیر لگی، یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے ایرپورٹ پر سامان منتقل کرنے کی ٹرالی مطلوبہ مقدار میں نہیں ہے، ٹرالی کے لئے مختلف جہاز کے مسافرین کی دھکم پیل تھی اور پولیس کھڑے ہو کر قطار کے اعتبار سے ٹرالی دے رہی تھی، سامان لے کر باہر نکلا، لیکن کہیں کوئی جانچ نہیں ہوئی، میرے ساتھ ایک کارٹون کتابوں کا تھا اور خیال تھا کہ شاید اس کے بارے میں زیادہ تفتیش ہوگی اور مترجم کے ذریعہ تحقیق کی جائے گی، لیکن کسی نے کچھ دریافت نہیں کیا اور میں سامان لے کر باہر نکل آیا، باہر ہمارے داعی مولانا محمد فاروق ملا، مولانا ہاشم لمبادا، ان کے صاحبزادگان عزیزی مولوی محمد الیاس ومولوی محمد قاسم سلمہا اللہ اور بعض دیگر حضرات دیر سے منتظر تھے، ہم لوگ ایرپورٹ کے بیرونی حصہ میں آئے اور اس وقت اندازہ ہوا کہ ایرپورٹ کا بیرونی حصہ بھی جو مسافرین اور واردین کی ضروریات کے لئے ہے، بہت کشادہ ہے اور بجائے خود ایک شہر معلوم ہوتا ہے، ہم لوگ ایرپورٹ سے نکلے اور چند میل کے فاصلہ پر 'ساؤتھ آل' پہنچے۔

یہ شہر ایرپورٹ سے سب سے قریبی علاقہ ہے، زیادہ تر سکھ آباد ہیں اور پنجابی تہذیب اور پنجابی زبان پوری طرح نمایاں ہے، کئی گردوارے ہیں، ایک گردوارہ کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ گولڈن ٹیمپل (امرتسر) کے بعد، سب سے بڑا گردوارہ ہے، ہم لوگوں نے عصر کی نماز ادا کی، اتفاق سے برطانیہ سے واپس ہوتے ہوئے بھی آخری نماز (جو عصر ہی تھی) یہیں ادا ہوئی، ہلکی ہلکی رم جھم بارش اور خنک موسم کے درمیان ہم لوگ لندن کے لئے روانہ ہوئے، صاف وشفاف سڑکوں سے گذرتے ہوئے لندن کے ایک محلّہ 'گل پٹن' آ کر رُکے، اس محلّہ میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، یہیں مولانا ہاشم لمبادا کے بڑے بھائی جناب

محمد لمبادا کا مکان ہے، اسی مکان میں میرے قیام کا نظم تھا، جناب محمد لمبادا صاحب بڑے صاحبِ ذوق آدمی ہیں، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور مختلف بزرگوں سے بہت قریب رہ چکے ہیں، اس لئے علماء کے مزاج شناس ہیں، ایک یہودی کی کمپنی میں کافی عرصہ کام کر چکے ہیں، جس کا تعلق قدیم سکوں کی تحقیق سے ہے، کئی بار بیت المقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، اوزان اور اسلامی عہد کے مختلف سکوں اوران کی مقدار پر اچھی نظر اور دلچسپ معلومات کے حامل ہیں، میں بہت تھکا ہوا اور نیند کے لئے بے قرار تھا، انھوں نے مہمان کی راحت رسانی کا حق ادا کیا اور عشاء کی نماز اول وقت میں پڑھ کر میں سو گیا۔

اگلے دن سے مختلف اداروں میں خطاب کا سلسلہ تھا، چنانچہ پہلا خطاب دارالعلوم لندن میں ہوا، یہ دارالعلوم ایک وسیع وعریض خطہ میں واقع ہے، عمارتیں بھی بہت ہی معقول، خوبصورت اور راحت بخش ہیں، دارالعلوم کے ایک طرف گھنے جنگل ہیں، جو اسی ادارہ کی ملکیت ہیں، یہاں طلبہ بعض اوقات پکنک بھی مناتے ہیں اور دوسری جانب بڑا سا کھیل کا میدان ہے، جو سبز دوبھیوں سے ڈھکا ہوا ہے، دراصل یہ ایک فوجی چھاؤنی تھی اور کمیونسٹ بلاک سے سرد جنگ کے زمانہ میں بنائی گئی تھی، جب روس کا شیرازہ بکھرا تو اس طرح کی بہت سی چھاؤنیاں فروخت کر دی گئیں، ان ہی میں یہ چھاؤنی بھی ہے، جسے دارالعلوم نے خرید کر لیا، اسی لئے یہ عمارت تمام سہولتوں سے آراستہ ہے، دارالعلوم میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، ۱۲ طلبہ دورۂ حدیث میں تھے، مولانا مفتی محمد مصطفیٰ مظاہری اس دارالعلوم کے مہتمم ہیں، بڑے اخلاق اور اکرام کے ساتھ ملے، اللہ تعالیٰ انھیں بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

آج ہی نماز عصر سے پہلے مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی طرف سے دعوت تھی تاکہ تبادلۂ خیال بھی ہو اور ہم طعامی بھی، مولانا منصوری جامعہ حسینیہ راندیر گجرات کے فاضل ہیں، عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، لیکن بال پورے سیاہ ہیں اور واقعی پیر جواں ہمت ہیں، دعوت وتبلیغ کے بہت سے ذمہ داروں کی صحبت میں رہ چکے ہیں اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے

صحبت یافتہ لوگوں میں ہیں، انھوں نے برطانیہ میں ادارہ ’’ورلڈ اسلامک فورم‘‘ قائم کیا ہے ان کا دولت خانہ وائٹ چیپل (White Chappel) میں ہے، اس محلّہ میں زیادہ تر لوگ بنگلہ دیشی نژاد ہیں مولانا کا مکان برصغیر کے علماء وزعماء کی قیام گاہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں فکر ارجمند اور دل دردمند دونوں سے سرفراز کیا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر اور مختلف گروہ آپ سے قریب ہیں۔

عصر کے بعد ہم لوگوں کو ’لیسٹر‘ کے لئے روانہ ہونا تھا، مولانا محمد فاروق صاحب شہر کے بعض علاقوں کی مختصر تفریح کراتے ہوئے اس علاقہ میں آئے جو لندن کا سب سے اہم علاقہ سمجھا جاتا ہے، اس علاقہ کو ’’ٹاور برج‘‘ کہتے ہیں، برطانیہ کے دو اہم دریاؤں میں ایک کا نام تھیمس (Thames) ہے، یہ لندن کے قلب سے گذرتا ہے اور گویا اس شہر کا تفریحی مرکز ہے، برج اسی دریا پر واقع ہے، اسی دریا کے قریب برطانوی پارلیمنٹ اور دوسری اہم سرکاری عمارتیں ہیں، نیز کئی چرچ ہیں اور مختلف تفریحی مراکز بھی ہیں، اس دریا پر ایک بڑا آہنی پل بنا ہوا ہے، جو دونوں طرف سے دو بلند آہنی میناروں سے جڑا ہوا ہے، یہ برج درمیان سے کھل سکتا ہے اور جب کوئی بڑا اسٹیمر نیچے سے گذرتا ہے تو دونوں طرف سے برج کا آدھا آدھا حصہ اُٹھ جاتا ہے، مجھے یہ برج اپنی بناوٹ اور ڈیزائن کے اعتبار سے ہندوستان میں واقع ہاوڑہ برج سے بہت مماثل نظر آیا، جو انگریزوں کا بنایا ہوا ہے، بلکہ ہاوڑہ برج لمبائی کے اعتبار سے ٹاور برج سے زیادہ بڑا ہے، لیکن صفائی وستھرائی، انتظام (Mentenance) کے نہ ہونے وجہ سے دونوں میں بہت تفاوت محسوس ہوتا ہے، اگر ٹاور برج کی صفائی وستھرائی بے مثال ہے تو ہوڑہ برج کی گندگی اور بد انتظامی کی بھی مثال کم ملے گی، اس دریا کے نیچے سے ’’بلاک وال ٹنل‘‘ کے نام سے ایک سرنگ ہے، جس کے اوپر پُرشور دریا ہے اور جس کے اندر سواریوں کا شوروغوغا۔

لندن سے لیسٹر جاتے ہوئے بعض ایسے علاقوں سے بھی گذر ہوا، جس میں غالب آبادی عربوں کی ہے اور عربوں میں بھی زیادہ تعداد فلسطین نژاد لوگوں کی ہے، یہ محلّہ ’ماربل

آرچ'' کہلاتا ہے، یہاں دکانوں کے بہت سے سائن بورڈ عربی میں ہیں، ناموں کے شروع میں ''ال'' لگے ہوئے ہیں، عربی ملبوسات اور غذائیں بھی فروخت ہوتی ہیں، صورت وشباہت بھی عربی رنگ وروپ کو ظاہر کرتی ہیں، لیکن افسوس کہ تہذیب میں وہ پوری طرح مغرب کے سامنے سرنگوں ہو چکے ہیں، اسی طرف آگے بڑھتے ہوئے (Maida Vale) نامی علاقہ ملا، اس میں عراق کے کرد اور شیعہ تارکین وطن آباد ہیں۔

لندن ایک قدیم اور بڑا شہر ہے، جس کی عمارتیں عام طور پر گرجا کے مماثل ہیں، اس شہر کی آبادیاں اس وقت ۷۰ تا ۸۰ لاکھ ہے، جس میں ۱۵ تا ۲۰ لاکھ مسلمان آباد ہیں، لوگوں کے مکانات سڑک کی دونوں جانب قطاروں کی صورت میں ہیں اور عام طور پر تمام مکانات ایک ہی ڈیزائن اور ایک ہی وضع کے ہیں، عمارت کا بیرونی حصہ کھلی اینٹوں کا ہے جس پر پلاسٹر نہیں ہوتا، باہر سے عمارتیں دیدہ زیب نہیں ہوتیں، لیکن اندر سے خوبصورت ہوتی ہیں اور اکثر اندرونی دیوار نیز چھت لکڑی کی ہوتی ہے، عمارتیں عام طور پر دو یا زیادہ سے زیادہ تین منزلہ ہوتی ہیں اور رہائشی مکانوں کی اوپری چھت پر نمایاں ٹائیلس کی بنی ہوتی ہیں، یہ غالبًا بارش کی کثرت اور برف باری کی وجہ سے ہے، مکانات عام طور پر چھوٹے ہوتے ہیں، ایک ڈرائنگ روم، ایک ڈائننگ روم، کچن اور دو بیڈ روم اور یہ مختصر سا مکان بھی دو منزلوں پر مشتمل ہوتا ہے، اسی لئے لندن اور برطانیہ کے دوسرے شہروں میں مہمانوں کو ٹھہرانا خاصا دشواری کا باعث ہوتا ہے، چھوٹے اور مختصر مکان کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مغرب میں مشترک خاندان کا تصور نہیں ہے، جوں ہی لڑکے اور لڑکیاں بالغ ہوتے ہیں، وہ اپنا آشیانہ الگ بنا لیتے ہیں اور حکومت اس میں ان کی مدد کرتی ہے، اس لئے ایک مکان میں صرف شوہر و بیوی یا ایک آدھ چھوٹے بچے مقیم ہوتے ہیں اور چوں کہ ان کے یہاں پردہ کا کوئی تصور نہیں، اس لئے ملاقات کے لئے آنے والوں مردوں اور عورتوں کی بیٹھک بھی ایک ہی جگہ ہوتی ہے، چنانچہ مکانات میں جو تنوع اور خوبصورتی برصغیر، خلیجی ممالک اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں نظر آتی ہے، وہ برطانیہ اور یورپی

ملکوں میں نظر نہیں آتی۔

ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے بعض دیہاتوں سے بھی گذر ہوا اور بعض جگہ تو خاص طور پر قرب و جوار کے دیہات کی طرف جانا ہوا، تو محسوس ہوا کہ انسان کو جو سہولتیں مطلوب ہوتی ہے، وہ وہاں کے دیہاتوں میں بھی شہر ہی کی طرح ہیں، الیکٹرک، روڈ، ٹیلی فون، وغیرہ کی سہولت میں کوئی فرق نہیں ہے، دیہات کے مکانات نسبتاً وسیع ہوتے ہیں اور آبادی بھی کھلی ہوئی ہوتی ہے، اسی لئے وہاں دیہات زیادہ مہنگے سمجھے جاتے ہیں، متمول اور مرفہ الحال لوگ دیہات میں رہتے ہیں اور گاڑیوں سے شہر میں آمد و رفت رکھتے ہیں، کیوں کہ دیہات میں انھیں زیادہ کھلی اور صاف ستھری آب و ہوا ملتی ہے۔

لندن سے تقریباً سو میل کے فاصلہ پر برطانیہ کا ایک دوسرا شہر لیسٹر (Leicester) ہے، یہیں مولانا محمد فاروق ملا کا تعلیمی ادارہ ہے، لندن سے عصر بعد روانہ ہو کر ۱۰ بجے شب لیسٹر پہنچنا ہوا، لیسٹر میں ہمارا قیام مولانا موصوف کے ادارہ میں تھا، ان کی تعلیم اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی اور ڈیوز بری میں ہوئی، انھوں نے لنکن یونیورسٹی سے ایجوکیشنل مینجمنٹ میں ایم، اے کیا ہے، اُردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اچھی طرح تقریر کرتے ہیں اور عربی سے انگریزی اور انگریزی سے عربی گفتگو کا ترجمہ بہتر طور پر کرتے ہیں، عرصہ سے لنکن کی مسجد میں جمعہ کے خطیب ہیں، بعض عدالتوں میں اُردو بولنے والے انگریزی سے ناواقف حضرات کی ترجمانی کی ذمہ داری بھی آپ سے متعلق ہے اور دو جیلوں میں مسلمان قیدیوں کی اصلاح و تربیت پر بھی آپ مامور ہیں، چار سال پہلے آپ نے 'دارالارقم' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کے تحت بعض اسکول بھی ہیں اور بعض مسجدوں اور مکاتب کا انتظام بھی، نیز جن شہروں میں مکاتب نہیں ہیں، وہاں اس کے تحت مکاتب قائم کرتے ہیں، آپ نے اس ادارہ کے تحت معذور بچوں کے لئے ایک تربیتی مرکز بھی قائم کیا ہے، نیز نوجوانوں اور عام مسلمانوں کے لئے نئے فکری و عملی مسائل پر ورک شاپ بھی کرتے رہتے ہیں، آپ نے اس ادارہ کے تحت 'حلال

فوڈ' کی تحقیق کا ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا، جواب مستقل بنیادوں پر کام کر رہا ہے، مولانا موصوف کا ایک اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے ساؤتھ افریقہ میں اسلامیات کا مطبوعہ انگریزی زبان کا نصاب برطانیہ میں متعارف کرایا ہے اوران کے واسطہ سے برطانیہ میں یہ کتابیں سپلائی ہوتی ہیں، جس سے لوگوں کو بڑا نفع ہورہا ہے، اس پورے سفر میں انھوں نے جس محبت واکرام کا معاملہ کیا، اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرے دن جمعہ کو نماز سے پہلے مسجد کوک اسٹریٹ میں خطاب ہوا، راقم الحروف نے اس خطاب میں قرآن مجید کی آیت: '' إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَان ...... ''(النحل :۹۰) ـــــ جوخطبوں میں پڑھی جاتی ہے ـــــ کی تشریح کرتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالی کہ اسلام عدل کی تعلیم دیتا ہے اور مغرب مساوات کی، حالاں کہ مساوات فطرت کے خلاف ہے؛ کیوں کہ خدا نے اس کائنات کو عدل کے اُصولوں پر قائم کیا ہے نہ کہ مساوات پر، آج ہی بعد نماز مغرب مسجد عمر میں ''مسلم اور غیر مسلم تعلقات'' کے موضوع پر خطاب تھا، یہ لیسٹر کی اہم اور مرکزی مسجدوں میں سے ہے، مسجد سامعین سے بھری ہوئی تھی، لوگوں نے بڑی توجہ سے سنا، برطانیہ کے موجودہ حالات وواقعات کے پس منظر میں ہمارے میزبان نے خاص طور پر اس موضوع پر اظہار خیال کرنے کی خواہش کی تھی، چنانچہ اس حقیر نے مختلف اجتماعات میں اس موضوع پر روشنی ڈالی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کی دو بنیادیں ہیں، ایک غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک، پیغمبرانہ وداعیانہ اخلاق اور ایثار واحسان، دوسرے اپنے تشخص کی حفاظت اور اپنی شناخت اور پہچان کو گم نہیں ہونے دینا۔

دوسرے دن ۲۷ اگست کو'' اسلامک دعوہ اکیڈمی'' میں پروگرام تھا، صبح دس بجے سے گیارہ بجے تک اساتذہ کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوا اوران کے مختلف سوالات کے جوابات دیئے گئے، جن میں فقہی مسائل بھی تھے اور تعلیمی مسائل بھی اور اس کے بعد نماز ظہر تک طلبہ سے

خطاب کیا گیا، اس اکیڈمی کے تحت تحریر وتقریر کے ذریعہ دعوتی کام بھی ہوتا ہے، مسلمانوں میں بھی اور غیر مسلموں میں بھی، اور اسی کے تحت مدرسہ ریاض العلوم قائم ہے، جس میں دورۂ حدیث شریف تک تعلیم کا انتظام ہے اور برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں، مدرسہ کے ذمہ دار مولانا محمد سلیم دھورات صاحب ہیں، جو دارالعلوم بری کے فاضل ہیں اور باذوق آدمی ہیں، اہم بات یہ ہے کہ وہ اُمت کے مسائل کو حل کرنے اور نوجوانوں کو دین کی طرف لانے کے سلسلہ میں ہمہ جہت خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کے اس مزاج و مذاق کی وجہ سے طبیعت کو مناسبت محسوس ہوئی، بعد میں انھوں نے ایک نشست اہم اساتذہ کے ساتھ نصابِ تعلیم کے موضوع پر بھی رکھوائی اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بات دل میں ڈالی، وہ بطور مشورہ پیش کی گئی۔

آج ہی بعد نماز عصر ''فیڈریشن آف مسلم آرگنائزیشن لیسٹر'' کے زیر اہتمام ایک نشست رکھی گئی، اس فیڈریشن میں لیسٹر میں کام کرنے والی تمام مسلم تنظیموں کی نمائندگی رہی اور مختلف مکاتب فکر کے لوگ اس میں شریک رہے، شروع میں فیڈریشن کے ذمہ دار جناب عبدالکریم صاحب نے ادارہ اور اس کے شرکاء کا مختصر تعارف کرایا، پھر اس حقیر کو خطاب کی دعوت دی گئی، میں نے ''غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کی، پھر لوگوں کے سوالات کے جواب دیئے، زیادہ تر سوالات برطانیہ کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے طریقۂ کار اور رویہ سے متعلق تھے، اجلاس میں بعض وہ علماء بھی شریک تھے، جو گورنمنٹ کی طرف سے بنی ہوئی مذہبی کونسل میں اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں، انھوں نے سوال کیا کہ قرآن نے جو یہود و مشرکین کو مسلمانوں کا بدترین دشمن قرار دیا ہے اور غیر مسلموں سے دوستی نہ کرنے کی تلقین کی ہے، اس کو بار بار اٹھایا جاتا ہے، اس لئے اس کا تشفی بخش جواب ہونا چاہئے، راقم الحروف نے عرض کیا کہ قرآن میں جو ''موالات'' اور دوستی کا ذکر ہے، اس سے مراد ایسی دوستی ہے جو آدمی کی فکر اور اس کی معاشرت پر اثر انداز ہونے لگے،

انسانی حسن سلوک اور انسانی پہلو سے دوستی اور محبت کو منع نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ قرآن مجید نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، جب ان سے نکاح ہوگا تو اہل کتاب بیوی، اہل کتاب ماں مسلم معاشرہ میں ہوگی اور ماں اور بیوی سے اسلام میں محبت مطلوب ہے اور یہ طبعی چیز ہے، جس سے انسان چاہے بھی تو اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا، پھر یہود و مشرکین کی عداوت کی جو بات کہی گئی ہے، وہ کوئی حکم نہیں ہے، بیان واقعہ ہے، کیوں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ دو مذہبی گروہ مسلمانوں کے بہت ہی درپئے آزار تھے۔

اس سنجیدہ مجمع میں یوں تو سبھی لوگ سمجھ دار اور معاملہ فہم تھے، لیکن خاص طور پر حاجی عبدالکریم صاحب بڑے سمجھ دار اور دور بیں آدمی نظر آئے، وہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں بہت اچھی بولتے ہیں اور اپنی خوش اخلاقی اور وسیع القلبی کی بنیاد پر مسلمانوں کے مختلف گروہوں سے ان کے بہتر مراسم ہیں، جب ایل کے اڈوانی نے برطانیہ کا سفر کیا تو انھوں نے بہت ہی موثر نمائندگی کی اور ہندوستانی کمیونٹی کے ایک اجتماع میں اڈوانی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ہندو اور مسلمان سے غرض نہیں ہے، ''مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ گجرات میں ہندوستانیوں کا خون بہایا گیا، وہ مسلمان کا خون ہو تب بھی مجھے افسوس ہے، اور کسی ہندو کی موت ہو تو وہ بھی ہمارے لئے اسی قدر قابل افسوس ہے'' ان کی اس دردمندانہ گفتگو نے اڈوانی کو بے حد متاثر کیا اور اس وقت سے وہ عبدالکریم صاحب کو ساتھ ساتھ رکھنے لگے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان کسی بھی مزاج کا حامل ہو اگر حکمت اور دردمندی کے ساتھ بات کی جائے تو اکثر وہ نشانہ پر لگ کے رہتی ہے۔

۲۸ اگست کو صبح میں مولانا محمد فاروق ملا صاحب کے ساتھ لیسٹر کے نواح میں موجود ایک جیل میں گیا، جو ایک مخصوص جرم کے ارتکاب کرنے والوں کے لئے بنائی گئی ہے، اگر برطانیہ کی جیلوں کو ''فائیو اسٹار جیل'' کہا جائے تو غلط نہ ہو، جیل میں رہائش اور کھانے پینے کا معیار اتنا بہتر ہے کہ ہمارے یہاں کمپنیاں اپنے ملازمین کے لئے بھی ایسا انتظام نہیں کرتیں،

کھیل کے بھی وسیع میدان ہیں اور کھیل کے مقابلے بھی ہوتے ہیں، جیلوں میں مختلف مذہبی نمائندوں کی ڈیوٹی بھی رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے ہم مذہب قیدیوں کی اصلاح وتربیت کی کوشش کریں اور مذہبی تعلیمات کے ذریعہ ان کے مجرمانہ ذہن کو تبدیل کریں، چنانچہ مسلم نمائندہ کی حیثیت سے یہاں مولانا محمد فاروق ملا ہفتہ میں دو تین دن آتے ہیں، میری آمد کی مناسبت سے انھوں نے مسلمان قیدیوں کو جمع کیا اور اس میں خطاب نیز سوال و جواب کا پروگرام رکھا، راقم الحروف نے عرض کیا کہ غلطی انسان کی سرشت میں ہے، لیکن کامل انسان وہ ہے جس کو اپنی غلطی پر شرمساری ہو، اور وہ اپنی زندگی کو تبدیل کرلے، میں نے ان سے کہا کہ قید کی زندگی کو بھی دین کے کاموں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل ہی سے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصلاحی تحریک قید خانہ ہی سے شروع ہوئی اور کئی مسلمان علماء نے قید خانہ میں ایسی کتابیں تالیف کیں، جنھیں آج اسلامی کتب خانہ کی بے نظیر کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے، آپ جیل میں رہتے ہوئے دینی معلومات حاصل کرسکتے ہیں، دینی کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں، قرآن مجید حفظ کرسکتے ہیں اور یہاں جو آپ کے غیر مسلم دوست ہیں، ان کو دین کی دعوت دے سکتے ہیں، پھر لوگوں نے کچھ سوالات کئے، جن میں ایک اہم سوال تقدیر کی حقیقت سے متعلق تھا، خطاب اور سوال و جواب کے بعد معلوم ہوا کہ بعض قیدیوں نے قرآن مجید کا حفظ شروع کردیا ہے اور ایک اچھی خاصی مقدار وہ حفظ کرچکے ہیں، ان میں سے زیادہ تر مسلمان قیدی پاکستانی نژاد تھے۔

جیل کی مناسبت سے برطانیہ کی ایک اور جیل کا ذکر مناسب ہوگا، ۹ستمبر کی شام میں میری ایک ملاقات (Ramton) کے جیل میں رکھی گئی، یہ برطانیہ کی سب سے اہم جیل ہے، جس میں ملک کے ڈھائی سو سب سے زیادہ خطرناک مجرمین کو رکھا گیا ہے، یہ جیل دیواروں اور آہنی جالیوں کے حصاروں کے اندر واقع ہے، اس جیل میں اس وقت ۲۵ مسلمان قیدی تھے، جن میں زیادہ تر پاکستان اور کچھ صومالیہ اور افریقی ممالک سے تعلق رکھتے تھے، اس جیل کو

''دماغی ہاسپٹل'' کا نام دیا گیا ہے، چنانچہ یہاں باضابطہ دماغی ڈاکٹر اور نفسیاتی ماہرین قیدیوں کے علاج پر مامور ہیں، یہاں میری ملاقات صوبہ سرحد کے محمد جہانگیر نامی شخص سے ہوئی، جو وضع وقطع کے اعتبار سے دین دار ہیں، نماز وروزہ وغیرہ کے پابند بھی ہیں، انھوں نے اپنی بیوی، تین لڑکے اور لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیا تھا، ایک کمسن لڑکی کسی طرح چھپ جانے میں کامیاب ہوگئی، اس شخص کو اپنے جرم پر کوئی شرمندگی نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نے ایسا خدا کے حکم پر کیا تھا اور مجھے چاروں طرف گھر کے در و دیوار سے آواز آرہی تھی کہ تم سب کو قربان کردو، ظاہر ہے کہ وہ دماغی مریض ہے اور اسلام میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان شرعی احکام کا مکلّف ہے، محض خوابوں اور ذہن میں پیدا ہونے والی باتوں پر عمل کرنا اس کے لئے جائز نہیں، ایسے واقعات سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں جیل میں میری ملاقات ایک پادری سے کرائی گئی جو مذہبی شعبہ کا ذمہ دار ہے، وہ بہت اخلاق اور اکرام کے ساتھ پیش آئے اور خواہش نہ ہونے کے باوجود ان کے اصرار کی وجہ سے ان کی ضیافت سے بھی محظوظ ہونا پڑا، مختلف النوع موضوع پر گفتگو ہوتی رہی، میں نے دو تین باتیں خاص طور پر ان کو گوش گذار کیں، میں نے پہلی بات یہ کہی کہ آج مغرب اور خاص کر امریکہ یہ تصور دے رہا ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک سرد جنگ چھڑی ہوئی ہے، جیسے پچھلی صدی میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان معرکہ برپا تھا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج مذہب اور لامذہبیت کے درمیان جنگ برپا ہے، ایک گروہ چاہتا ہے کہ مذہب کو انسان کی زندگی سے بے دخل کر دیا جائے اور انسان خدا کے بجائے اپنی خواہشات کا بندہ بن جائے اور دوسرا گروہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو مذہب اور خدا کے احکام سے مربوط رکھے، اس گروہ میں پیش پیش مسلمان ہیں، اس لئے تمام مذاہب کے لوگوں کو مل کر اور مشترکہ کوششوں کے ذریعہ لامذہبیت کا مقابلہ کرنا چاہئے، میں نے انھیں توجہ دلائی کہ چرچ ویران ہو رہے ہیں، کلبوں اور شراب خانوں میں تبدیل ہو رہے ہیں، مسجد میں جتنے نمازی ہونے

چاہئیں، اتنے نمازی نہیں آتے، یہ سب لامذہبیت کی موجودہ مغربی لہر کا نتیجہ ہے۔

دوسری بات میں نے ان سے یہ کہی کہ مغرب اسلام کو نارواداراور شدت پسند مذہب سمجھتا ہے، حالاں کہ اسلام وہ دین ہے جس میں کوئی شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے بغیر مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، قرآن مجید میں سورہ فاتحہ کے بعد پہلی سورت ایک ایسے واقعہ سے منسوب ہے جو بنی اسرائیل سے متعلق ہے، قرآن میں حضرت مریم، بنی اسرائیل اور آل عمران کے نام سے مستقل سورتیں ہیں، حالاں کہ حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن کے نام سے کوئی سورت نہیں، تیسری بات میں نے ان سے یہ کہی کہ یہ سمجھنا کہ معاشی مسائل کو حل کرنے اور ذہنی علاج کے ذریعہ مجرم کو تبدیل کیا جاسکتا ہے کچھ حد تک ہی صحیح ہے، انسان جرم اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو قانون کی نگاہ سے محفوظ پاتا ہو، اس لئے اصل چیز خدا کا اور آخرت کا خوف ہے، اصل یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا خوف اور آخرت میں جواب دہی کا احساس پیدا کیا جائے، اسی لئے قرآن نے اکثر گناہوں کے ذکر کے آگے پیچھے تقویٰ اور آخرت کے ثواب وعذاب کا ذکر کیا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ پادری پر میری ان باتوں کا بہت خوشگوار اثر پڑا، اس نے توجہ سے سنا، اس کی تائید کی اور بڑے اکرام کے ساتھ ہم لوگوں کو رخصت کیا اور ہمارے سفر برطانیہ کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کو اس ملک میں بار بار آنا چاہئے۔

۲۸ اگست کو ہم لوگوں کو نوٹنگم (Not Tingam) سے ہوتے ہوئے ڈربی جانا تھا، نوٹنگم میں حیدرآباد (انڈیا) سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کی لڑکی کا عقد تھا، ان کی بہت زیادہ خواہش پر نکاح میں شریک ہوا اور نکاح سے پہلے ۱۵-۲۰ منٹ خطاب کیا، میں نے اس خطاب میں اسلام میں نکاح کی اہمیت، شرح نکاح کے کم ہونے کے نقصانات، اسلام میں عورتوں کے حقوق نیز مردوں اور عورتوں کے حقوق میں توازن و اعتدال جیسے اہم موضوعات کو چھیڑا، کیوں کہ شرکاء میں بعض انگریز بھی تھے، مولانا فاروق ملا صاحب نے اس کا انگریزی میں

ترجمہ کیا، نوٹنگم میں مسلمان کم ہیں، لیکن یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے اور نوٹنگم یونیورسٹی کے احاطہ میں ایک بہت ہی نفیس فنکش ہال ہے، اسی ہال میں یہ تقریب رکھی گئی تھی۔

اس تقریب سے فارغ ہوکر ہم لوگ آگے بڑھے اور ڈربی پہنچے، یہاں ایک ادارہ ''الاکرم اسلامک سنٹر'' کے نام سے ہے، جس کے ذمہ دار عام طور پر پاکستان کے لوگ ہیں، عصر کے بعد اسی سنٹر کے کانفرنس ہال میں حدیث، فقہ اور اجتہاد کے عنوان سے ہمیں خطاب کی دعوت دی گئی، شرکاء میں زیادہ تر ڈاکٹر، جدید تعلیم یافتہ حضرات اور بعض نومسلم انگریز بھی تھے، راقم الحروف نے قرآن کی معنوی حفاظت میں حدیث کے کردار کی اہمیت، حدیث وفقہ کے ربط اور اجتہاد وتقلید پر روشنی ڈالی، اور اپنی دانست میں اس اہم علمی موضوع کو آسان اور عام فہم اُسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی، اخیر میں حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے گئے، یہ بڑی اچھی علمی، فقہی اور فکری مجلس رہی اور حاضرین نے بھی مسرت کا اظہار کیا، پھر ہم لوگ شب میں ہی لیسٹر واپس آگئے، ۲۹ اور ۳۰ اگست کو صبح ۱۰ بجے سے شام ٦ بجے تک تربیت قضاء کے سلسلہ میں علماء کی خصوصی نشست تھی، ان نشستوں میں ۲۰ - ۲۵ علماء مختلف شہروں سے شریک تھے، جن میں زیادہ تر دارالعلوم کراچی پاکستان کے فضلاء تھے اور عام طور پر یہ حضرات افتاء کے کام سے منسلک تھے، آخری نشست سوالات کے جواب کے لئے مخصوص رکھی گئی تھی، علماء نے اس پروگرام میں گہری دلچسپی لی، راقم الحروف کے محاضرات کے نوٹس لئے اور بہت سے سوالات کئے۔

خوشی کی بات ہے کہ برطانیہ میں غیر سودی بینک کاری کی اجازت مل گئی ہے اور خود برٹش بینک نے اپنے یہاں غیر سودی کاؤنٹر کھولا ہے، دنیا کے مختلف ممالک میں غیر سودی بینک کاری کا خوشگوار تجربہ ہورہا ہے، جن میں ملیشیاء اور دبئی خاص طور پر قابل ذکر ہے، برطانیہ میں اب ایک مستقل غیر سودی بینک ''برٹش اسلامک بینک'' قائم ہو چکا ہے، اس بینک کے منیجر پاکستان نژاد ایک مخلص اور دردمند مسلمان ہیں، بینک کی طرف سے ایک تعارفی سیمینار الارقم

کے وسیع کانفرنس ہال میں منعقد ہوا، جس میں مہمان خصوصی کے طور پر یہ حقیر مدعو تھا، اس سیمینار میں خاص طور پر علماء اور دانشوروں کو دعوت دی گئی تھی، راقم الحروف نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ غیر سودی بینک کاری کے نظام کو کامیاب بنانا اور مسلمانوں کو سود کی لعنت سے بچانا اس دور کا سب سے بڑا علمی وفکری جہاد ہے، علماء سے عرض کیا گیا کہ صرف کسی بات کو حرام و ناجائز قرار دے دینا کافی نہیں، بلکہ اگر کوئی چیز ناجائز ہو، لیکن اس سے ایسی سہولتیں متعلق ہوں، جو اس دور میں لوگوں کے لئے ضرورت کا درجہ اختیار کر گئی ہوں اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کا متبادل ممکن ہو، تو علماء کا فریضہ ہے کہ وہ ایسی حرام چیزوں کا حلال متبادل بھی پیش کیا کریں، اسی لئے قرآن مجید میں محرمات کے ساتھ اور پہلو بہ پہلو حلال چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، سود کی حرمت کے ساتھ تجارت کے حلال ہونے کا، حرام غذاؤں کے ساتھ حلال غذاؤں کا اور محرم رشتوں کے ساتھ حلال رشتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

بینک کے منتظمین سے عرض کیا گیا کہ اسلام کے نظام سرمایہ کاری کی بنیاد چار معاملات پر ہیں، مضاربت، شرکت، اجارہ اور مرابحہ، ان میں سے اصل پہلی دو چیزیں ہیں، اجارہ یعنی کرایہ پر لگانا اور مرابحہ یعنی کسی سامان کو کم قیمت میں خرید کر زیادہ قیمت میں فروخت کرنا، اگر چہ کہ نقصان کے اعتبار سے زیادہ محفوظ طریقہ ہے، لیکن اس میں نفع بھی کم حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ کاری میں ان کا درجہ رخصت کا ہے، اس لئے اجارہ اور مرابحہ کو بینکنگ کی مستقل اساس نہ بنانی چاہئے، نیز اس بات پر بھی توجہ دلائی گئی کہ مرابحہ میں شریعت کے جو اُصول ہیں، آج کل اسلامک بینک ان کا پوری طرح لحاظ نہیں رکھتے، بعد میں لوگوں نے سوالات بھی کئے، جن میں بعض احکام شریعت سے متعلق تھے جس کا جواب راقم الحروف نے دیا اور بعض انتظامی اُمور سے متعلق، ان کے جواب پروگرام کے منتظمین نے دیئے۔

۲۹ اگست کو مغرب کے بعد لیسٹر کی معروف مسجد ''الفلاح'' میں انڈین مسلم سوسائٹی کے زیر اہتمام خطاب عام تھا، میں نے اپنے خطاب میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ

مسلمان غیر مسلموں کے مقابلہ میں داعی ہیں اور داعی کو مدعو سے یکطرفہ محبت مطلوب ہے، میں نے یہ بات بھی عرض کی کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ ''اپنے'' اور ''غیر'' کی اصطلاح مناسب نہیں ہے اور قرآن کے مزاج کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء اپنی قوم کو: اے میری قوم! (یا قومی) کہہ کر خطاب کرتے تھے، میں نے اس بات پر بھی توجہ دلائی کہ اگر آپ نے اس ملک میں مکان اور دکان حاصل کرلیا اور عیش وعشرت کے اسباب کو پالیا، لیکن اپنی نسلوں کو اسلام اور اسلامی تہذیب پر قائم نہیں رکھ سکے، تو آپ نے پایا نہیں ہے کھویا ہے!

یہ مسجد بہت کشادہ ہے، مسجد میں سامعین کی بڑی تعداد موجود تھی اور ایک اچھی خاصی تعداد شہر اور مضافات کے علماء کی بھی تھی، نیز یہ نظم رکھا گیا تھا کہ یہ خطاب شہر کے مکانات میں بھی ریڈیائی طریقہ پر نشر ہو، اس لئے گمان ہے کہ خواتین کی بھی بڑی تعداد نے اسے سنا ہوگا۔

مسلسل اور تھکا دینے والے ان پروگراموں کی وجہ سے عصر کے بعد ہم لوگ تفریح کے لئے لیسٹر کے ایک وسیع وعریض پارک (Abbey Park) میں گئے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولانا ہاشم صاحب اور ان کے فرزندان کے ساتھ تفریح کا لطف اُٹھایا، اس پارک میں چھوٹی سی جھیل بھی ہے، کھیل کا میدان بھی ہے اور پرندوں کا بھی ایک چھوٹا سا پارک ہے، جس میں دنیا بھر کے چھوٹے، بڑے رنگ برنگ کے پرندے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ کسی ماہر نقاش نے اعلیٰ درجہ کی مہارت اور بلند ذوقی کے ساتھ اس کے پروں کو پینٹ کردیا ہے، واقعہ ہے کہ ان مخلوقات کو دیکھ کر خدا پر انسان کا ایمان بڑھتا ہے اور اس کی قدرت وحکمت پر یقین سوا ہوتا ہے۔ سُبْحَانَکَ ربنا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً۔

لیسٹر میں مولانا محمد آدم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور ان کے زیر انتظام چلنے والی دینی درسگاہ 'جامعہ علوم القرآن' میں حاضری کا بھی موقع ملا، مولانا موصوف دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں ہیں، اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں، ان کے زیر انتظام

اس جامعہ میں غیر اقامتی درسگاہ ہونے کے باجود لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے دورۂ حدیث شریف تک تعلیم کا نظم ہے، راقم الحروف سے اساتذہ وطلبہ نے باصرار خواہش کی کہ وہ فقہ کی کسی کتاب کا ایک سبق پڑھادیں، اتفاق سے اس وقت ہدایہ اول کا گھنٹہ تھا، چنانچہ جہاں سے سبق ہونا تھا وہاں سے اس حقیر نے درس دیا، اساتذہ اور طلبہ اس میں شریک رہے۔

۱۳ اگست کو صبح میں دارالعلوم لیسٹر کا معائنہ تھا اور یہاں اساتذہ وطلبہ سے خطاب، اس دارہ کے ذمہ دار مولانا محمد اسماعیل صاحب ہیں جو ایک دردمند عالم دین ہیں، یہ مدرسہ کچھ مشکل حالات سے گذرتے ہوئے اب اپنی عمارت میں واقع ہے، اساتذہ اور طلبہ سے کچھ دیر خطاب کا بھی موقع ملا۔

آج ہم لوگوں کو برطانوی اتحاد میں شامل ایک اور ملک اسکاٹ لینڈ کے لئے نکلنا تھا، اسکاٹ لینڈ جاتے ہوئے ہم لوگ کچھ دیر لیسٹر سے مضافات میں واقع اسلامک فاؤنڈیشن میں ٹھہرے اور فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مناظر احسن صاحب کی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھے، کیوں کہ ہمیں چند روز بعد فاؤنڈیشن آنا ہی تھا، بھیگے ہوئے موسم میں نماز مغرب ''ڈیوز بری'' میں ادا کی گئی، نماز کے فوراً بعد ہم لوگ ''باٹلی'' آگئے اور مفتی یوسف ساچا کے یہاں رات میں مقیم ہوئے، اس مناسبت سے یہاں باٹلی کے علماء ومشائخ کی اچھی خاص تعداد جمع ہوگئی اور ہم کلامی اور ہم طعامی کا شرف حاصل ہوا، یہیں مولانا مرغوب احمد لاجپوری سے ملاقات ہوئی، مفتی ساچا اور مولانا لاجپوری دونوں صاحبِ ذوق علماء میں ہیں اور فقہ وافتاء میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں، یہیں مولانا لاجپوری نے اپنے جدامجد اور ہم نام حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ مفتی اعظم برما کے فتاویٰ کا مجموعہ دکھایا، جسے وہ مرتب کررہے ہیں، اس پر خود مرتب نے ایک بہت تفصیلی مقدمہ فقہ وافتاء پر لکھا ہے، جسے وہ الگ سے بھی شائع کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے خواہش کی کہ اس مقدمہ پر بھی اور اصل مجموعۂ فتاویٰ پر بھی یہ حقیر اپنے تاثرات لکھ دے، جسے سعادت سمجھ کر قبول کیا گیا، دورانِ سفر مسودہ کا اکثر

حصہ نظر سے گذر گیا اور تعمیل حکم کی گئی، مرتب نے اس مجموعہ کے حواشی اور ترتیب و تحقیق میں اچھی محنت کی ہے۔

رات کو آرام کر کے فجر کے فوراً بعد ہمارے قدیم اور بزرگ کرم فرما مولانا یعقوب کاوی صاحب کے یہاں ڈیوز بری میں صبح کا ناشتہ ہوا، حضرت مولانا یعقوب صاحب پرانے علماء میں ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بخاری پڑھی ہے، علامہ ابراہیم بلیاوی اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ سے استفادہ کیا ہے، مولانا اس ملک میں سب سے پہلے دعوت وتبلیغ کے کام کا تحفہ لے کر گئے، وہ ۱۹۶۶ء میں برطانیہ آئے، اس وقت پورے ملک میں صرف ۷/ ۸ مسجدیں تھیں اور اب صرف ایک شہر ڈیوز بری میں ۱۱ مسجدیں ہیں، ڈیوز بری اور باٹلی جڑواں شہر ہے اور ان کی مجموعی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے جن میں سات آٹھ ہزار مسلمان ہیں، یہاں مولانا یعقوب صاحب کے زیر اہتمام ''مسجد زکریا'' کے نام سے ایک اہم مرکز ہے، جس میں چار سو پچاس طلبہ و طالبات بنیادی تعلیم حاصل کرتے ہیں، مولانا محترم 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کی مجلس علمی کے رکن بھی ہیں اور وہ اکثر اس کے سیمیناروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں، قدیم ملاقات اور مناسبت کی وجہ سے یہ ملاقات ہمارے لئے مسرت انگیز اور خوش کن تھی اور وہ بھی اس حقیر کے ساتھ پرانے تعلق کی بنیاد پر بہت شفقت و محبت کے ساتھ پیش آئے۔

یہاں سے ہم لوگ اسکاٹ لینڈ کے لئے روانہ ہوئے، جو یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر ہے اور طویل فاصلہ ہی کی وجہ سے ہمارے میزبان نے ڈیوز بری اور باٹلی میں وقفہ رکھا تھا، تاکہ زیادہ تکان نہ ہونے پائے، یہ پورا راستہ سرسبز پہاڑیوں اور میدانوں سے ہو کر گذرتا ہے، بھیگے ہوئے موسم نے اس سفر کو مزید خوشگوار بنا دیا اور ہم لوگ ظہر کے قریب اسکاٹ لینڈ کے سب سے بڑے شہر اور تجارتی مرکز گلاسگو پہنچے، چوں کہ ظہر کے بعد میرا خطاب تھا اور وقت کم رہ گیا تھا، اس لئے ہم سیدھے سنٹرل مسجد آئے، یہ بہت ہی بڑی، بہت کشادہ

اور خوبصورت مسجد ہے، مسجد کے ساتھ لائبریری اور ایک اسلامک سنٹر بھی ہے، مسجد کے ایک طرف کھلے ہوئے صحن میں بوڑھے لوگوں کے لئے ورزش کا تربیتی مرکز ہے اور یہ وہاں کی گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جب ہم لوگ پہنچے تو ایک انگریز خاتون ورزش کی تربیت دے رہی تھی، اس مسجد میں مختلف قومیتوں کے مسلمان نماز ادا کرتے ہیں اور ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افریقہ اور عرب ممالک کے نمازی یہاں نظر آتے ہیں، یہیں بعد نماز ظہر میرا پہلا خطاب ہوا، اس خطاب کا عنوان رکھا گیا تھا ''تارکین وطن مسلمانوں کے مسائل''، راقم الحروف نے اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ تارکین وطن نے اپنے اخلاق وکردار کے ذریعہ غیر مسلم ممالک میں کس طرح اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دیا ہے؟ انھیں ان کے فرائض کی طرف متوجہ کیا اور انسانی اُخوت کے رشتہ سے غیر مسلم بھائیوں کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں؟ اس کی وضاحت کی، بحمد للہ لوگوں پر اچھا تاثر رہا، ادھیڑ عمر کے ایک صاحب میرے خطاب کے فوراً بعد کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ کاش! آپ پہلے اس ملک میں آئے ہوتے، کیوں کہ ہم نے اسی منبر سے بعض مقررین کو غیر مسلموں کے خلاف نہایت ہی پرتشدد خطاب کرتے ہوئے سنا ہے۔

عصر کے بعد اسی مسجد کے کانفرنس ہال میں گلاسگو اور اسی کے مضافات کی مساجد کے ائمہ اور مساجد کمیٹی کے ارکان کی خصوصی نشست رکھی گئی تھی، جس میں مجھے ''غیر مسلم ممالک میں مساجد کا کردار'' کے عنوان سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، میں نے قرن اول کے نظام مساجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مساجد کی دعوتی، تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی کردار کی طرف اشارہ کیا اور عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو ارشاد فرمایا ہے: ''الإمام ضامن'' اس کو صرف نماز ہی کے ساتھ مخصوص نہ سمجھنا چاہئے، بلکہ امام مسلمانوں کی اعتقادی، معاشرتی اور سماجی مسائل کا بھی ضامن ہے، نماز مغرب کے بعد پھر اسی مسجد میں پہلے سے کئے ہوئے اعلان کے مطابق ''عملی زندگی میں فقہ کی ضرورت'' کے عنوان سے کچھ عرض کیا گیا۔

یہ ستمبر کی پہلی تاریخ تھی، دوسرے دن جمعہ کو'مدرسہ تعلیم الاسلام پولک سپلز' کی مسجد میں جمعہ سے پہلے خطاب تھا، اس مسجد کے امام مولانا اختر صاحب ہیں جن کا تعلق پاکستان سے ہے، یہ مسجد ابھی زیر تعمیر ہے اور اس مسجد سے پورے شہر میں خطاب کی ریڈیائی ترسیل کا انتظام ہے، چنانچہ پون گھنٹہ، بچوں کی تربیت اور ان کے دین وایمان کی حفاظت کی اہمیت، پر روشنی ڈالی گئی، آج ہی نماز عصر کے بعد مسجد کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹروں کے لئے خصوصی نشست رکھی گئی، جس میں ان کے سوالات کے جوابات دیئے گئے، زیادہ تر سوالات طبی اخلاقیات، مصنوعی آلۂ تنفس کی علاحدگی اور اعضاء کی پیوندکاری وغیرہ سے متعلق تھے، مغرب کے بعد پھر اسی کانفرنس ہال میں 'فقہ الاقلیات' کے موضوع پر علماء کرام سے خصوصی خطاب رکھا گیا تھا۔

۳ ستمبر کو بھی ظہر، عصر اور مغرب کے بعد خطاب کا سلسلہ رہا، عصر بعد کا خطاب خواتین سے تھا اور موضوع تھا ''غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان عورتوں کے مسائل'' —— راقم الحروف نے اس خطاب میں عورتوں سے متعلق اسلامی تعلیمات اور مغربی دنیا کے تصورات اور دونوں کے اثرات ونتائج کو پیش کرنے کی سعی کی اور اس پس منظر میں عورتوں کی ذمہ داریاں واضح کرنے کی کوشش کی گئی، پھر مغرب کے بعد فقہ حنفی سے متعلق خطاب رکھا گیا، گلاسگو میں ہمارے داعی سنٹرل مسجد کے خطیب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے، جو دارالعلوم بری کے فاضل ہیں اور آبائی وطن پاکستان ہے، نوجوان، کھلا ہوا رنگ، دراز قامت، خوش مزاج اور فہیم وسلیم، داعیانہ ذہن کے حامل، بڑی محبت وتواضع سے ملے، وہ ان دنوں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مکتوبات پر کام کررہے ہیں، اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں اور شہر کے نوجوانوں پر ان کی خاصی گرفت ہے، نیز یہاں ہم لوگوں کا قیام محترم جناب حاجی شمیم احمد صاحب کے پاس تھا، یہ پاکستان کے علاقہ پنجاب کے رہنے والے ہیں، بڑے ہی خلیق، ملنسار، مہمان نواز اور بہت جلد گھل مل جانے والے، گلاسگو میں واقع ایک بڑے پارک کے قریب ہی ان کا مکان ہے، ایک میزبان اپنے مہمان کو جو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچا سکتا ہے، اس کا انھوں

نے انتظام کیا اور اپنی محبت کے نقوش دلوں پر ثبت کردیئے، ان کے ایک صاحبزادے حافظ قرآن بھی ہیں اور ان کی اہلیہ کو بھی قرآن مجید کے دروس سے بڑی دلچسپی ہے، اس لئے پورے گھر پر دین داری کی چھاپ ہے۔

گلاسگو میں مولانا محمد فاروق اور جناب شمیم احمد صاحب نے دو دن تفریح کے لئے بھی رکھے تھے، چنانچہ ۴ستمبر کو ہم لوگ 'اسکاٹ لینڈ' کی راجدھانی 'ایڈمبرا' گئے، یہ شہر تو بہت بڑا نہیں ہے، لیکن خوبصورت اور تاریخی شہر ہے، یہاں ایک قلعہ بھی ہے، عام طور پر لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں، لیکن واقعہ ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ یا قطب شاہی قلعوں کی جو شان ہے، وہ یہاں نظر نہیں آئی، یہاں سڑکوں پر وضاحت کے لئے مختلف رنگ کی قطاریں بنی ہوئی ہیں، بعض قطاریں سرخ اور بعض سبز ہیں، جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ بسوں کی گذرگاہ ہے، یا یہ جگہ پارکنگ کی ہے، ایڈمبرا سے ہم لوگ ظہر کے قریب گلاسگو واپس آئے اور اس شہر کے میوزیم کو دیکھا، یہ ایک بڑے پارک میں واقع ہے، جہاں مختلف محروس ممالک کی کچھ بقیات ہیں، اور دنیا بھر کے نوع بنوع درخت اور پھول لگے ہوئے ہیں، یہ جگہ ''جارج اسکوائر'' کہلاتی ہے، عمارت کے سامنے ایک ٹاور بنا ہوا ہے، جس میں یادگار شخصیتوں کے مجسمے نصب ہیں، ہم لوگ گلاسگو میں سیٹی سنٹر کے علاقہ میں بھی پہنچے، یہ بھی شہر کا خوبصورت علاقہ ہے، جہاں بہت چہل پہل رہتی ہے اور یاد ش بخیر! یہاں 'جنگ عظیم' میں کام آنے والے اسکارٹش فوجیوں کے نام بھی کندہ ہیں۔

اگلے روز بھی ہم لوگوں کا زیادہ تر وقت تفریح میں گذرا، گلاسگو سے ۶۰-۷۰ میل کے فاصلہ پر ایک جھیل ہے، جو بہت ہی طویل رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے، اندازاً ۱۵-۲۰ میل سے کم اس کا مستطیل رقبہ نہیں ہوگا، یہ جھیل یہاں کی خاص تفریح گاہ ہے، جو ہفتہ واری تعطیل کے ایام (ہفتہ اور اتوار) کو بہت آباد رہتا ہے، اتفاق سے آج بھی اتوار کا دن تھا، وہیں کھانا کھایا اور ظہر کی نماز ادا کی، پھر تھوڑا وقت گذار کر آگے بڑھے، جھیل ختم ہوئی تو اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ

شروع ہوا، ایسی پہاڑیاں جن کو سبز دوپٹوں نے ڈھانک رکھا تھا، درمیان میں ایک آدھ جگہ ہم لوگ اُترے اور سفر جاری رکھا، کچھ فاصلوں کے بعد پھر جھیلوں کا سلسلہ شروع ہوا، ہم لوگ برطانیہ کے ایک تاریخی مقام 'فورٹ ولیم' سے گذرتے ہوئے 'بن نیوس' پہنچے، یہ اس ملک کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اور اس کے دامن میں بھی بڑی جھیل ہے، ہندوستان کے پہاڑوں کے لحاظ سے اس کی اونچائی کچھ بہت زیادہ نہیں، تاہم یہاں پر قدرتی مناظر قابل دید ہیں، جب ایک طرف جھیل اور اس سے متصل خوبصورت سبزہ زار اور پھر پہاڑیاں اور اس پر سنہری دھوپ کی گلکاریاں سامنے آتی ہیں تو اللہ کی قدرت یاد آتی ہے۔

اسکاٹ لینڈ انگلینڈ کے بعد برطانیہ میں شامل چار ریاستوں میں سب سے اہم ریاست ہے، اس کا اپنا جھنڈا بھی ہے، اپنی تہذیب وثقافت ہے، اور چیک کا کپڑا ان کے قومی لباس کا خاص حصہ ہے، خاص موقعوں سے یہ بڑی خوبصورت کا مدار سیاہ مخملی ٹوپی بھی اپنے سر پر رکھتے ہیں، گلاسگو میں قیام کے دوران ایک دن اسکاٹ لینڈ اور کسی اور ملک کے درمیان فٹ بال کا میچ تھا، اس وقت دیکھنے میں آیا کہ بڑے، چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کا ایک سیلاب اسٹیڈیم کی طرف رواں دواں ہے، ہاتھوں میں اسکاٹ لینڈ کا جھنڈا، جسم پر چیک والے کپڑے اور بعض لوگوں کے سروں پر مخملی ٹوپیاں۔

یوں تو پورا یورپ اور برطانیہ حیا کی چادر اُتار چکا ہے اور شراب کی کثرت ہے، لیکن سر راہ گذرتے ہوئے محسوس ہوا کہ برطانیہ کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں اسکاٹ لینڈ کا حال زیادہ ہی خراب ہے، کثرت سے شراب کی دکانیں ہیں، ایسی دکانیں بھی ہیں جو اٹھارہویں صدی کے اواخر سے شراب بیچ رہی ہیں، اور دکان پر فخریہ اسکا سن تاسیس لکھا گیا ہے، نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں آوارگی، عریانیت اور بے شرمی کھلے عام محسوس کی جاسکتی ہے، ہفتہ اور اتوار کے دن شریف لوگوں کے لئے راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے اور نشہ میں مخمور لوگ ہر جگہ تھرکتے نظر آتے ہیں، لیکن صفائی ستھرائی، سڑکوں کی کشادگی، عمارتوں کی خوبصورتی اور قدرتی

مناظر کے اعتبار سے یہ علاقہ بہت بہتر نظر آیا۔

۵ ستمبر کو ہی عصر کے بعد ہم لوگ 'مانچسٹر' کے لئے روانہ ہوئے، مانچسٹر میں ایک اہم تعلیمی وتبلیغی ادارہ ''مسجد امدادیہ'' ہے، جس کے موجودہ ذمہ دار حافظ اقبال احمد رنگونی ہیں، ان کے مختلف رسائل، مختلف فرقوں کی رد میں ہیں، اور کچھ تصوف سے متعلق بھی ہیں، نوجوان دبلے پتلے، جسم پر جبہ، سر پر عمامہ، متواضع اور منکسر المزاج، نیز صاحبِ ذوق فاضل ہیں، انھوں نے اس حقیر کی آمد کی مناسبت سے یہاں ''امام ابوحنیفہؒ کانفرنس'' رکھ دی تھی، میں دیر سے پہنچ سکا، آخری خطاب میرا ہی تھا، جو عشاء سے پہلے تھا، چنانچہ موضوع کی مناسبت سے 'فقہ حنفی کی تدوین، اس کی خصوصیات اور موجودہ زمانہ کے مسائل کے حل میں فقہ حنفی کی اہمیت وضرورت' پر روشنی ڈالی گئی، حاضرین کی اچھی خاصی تعداد تھی، جو خاص طور پر ''تحریک تحفظ ختم نبوت'' سے وابستہ تھے، شہر اور مضافات کے علماء بھی جمع ہو گئے تھے، نمازِ عشاء اور عشائیہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ رات ہی میں پرسٹن (Preston) کے لئے نکل گئے، مانچسٹر برطانیہ کے چند بڑے شہروں میں ایک ہے، اس شہر کو سرسری نظر ہی دیکھا جا سکا، رات میں پرسٹن میں قیام رہا، یہاں ہمارے میزبان مولانا محمد شعیب صاحب تھے، بڑے ہی مخلص، مہمان نواز، علم دوست اور باذوق شخصیت کے حامل ہیں، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بھی ان کے دولت خانہ پر قیام کر چکے ہیں، مزاج کی ہم آہنگی کی وجہ سے مولانا موصوف سے بڑی مناسبت محسوس ہوئی اور انھوں نے بڑے اکرام کا معاملہ فرمایا، اگلے دن عصر بعد یہاں کے قریب ساحلی علاقہ ''سینٹ اینس'' جانا ہوا، یہ ایک بڑی ساحلی پٹی ہے، جہاں سڑک کے کنارے وسیع سبزہ زار ہے، لوگ ہواخوری کے لئے یہاں آتے ہیں اور چہل قدمی کرتے ہیں، ہم لوگوں نے عصر کی نماز یہیں ادا کی اور ساحل پر مغرب کے قریب تک چہل قدمی کرتے رہے، مغرب کے بعد پرسٹن کی جامع مسجد میں خطاب رکھا گیا تھا، یہاں اس حقیر کی حاضری کی مناسبت سے علماء کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، اس لئے عوام اور علماء دونوں کی مناسبت سے کچھ عرض کیا گیا اور موجودہ

حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری پر روشنی ڈالی گئی، مولانا محمد شعیب صاحب نے صبح میں اس شہر کی سیر بھی کرائی اور اس کے بڑے بڑے شاپنگ کمپلکس بھی دکھائے، پھر آج ہی شب میں ہم لوگ بلیک برن(Black Burn)واپس ہوگئے۔

بلیک برن(Black Burn) بھی انگلینڈ کے اہم شہروں میں ہے اور تجارتی اعتبار سے اسے خاص اہمیت حاصل ہے، ہمارے محترم دوست مولانا محمد ہاشم فلاحی اسی شہر کے متوطن ہیں، ان کا مکان نوتعمیر شدہ ہے اور بہت وسیع اور سہولت بخش ہے، پھر اس پر مولانا کی ضیافت اور مولانا کے دونوں سعید وسلیم صاحبزادے مولوی محمد الیاس اور مولوی محمد قاسم (فضلاء جامعہ محمودیہ ساؤتھ افریقہ) کی خدمت سے ایسا محسوس ہوا کہ گویا ہم اپنے ہی گھر میں ہیں، ان کے مکان کے بالکل سامنے ایک اچھا خاصا پارک ہے، اس لئے باہر کا منظر بھی بڑا خوبصورت محسوس ہوتا ہے، دو تین دنوں میرا یہیں قیام رہا، ۶ ستمبر کو صبح 'دارالعلوم بری' جانا ہوا، یہ برطانیہ کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی دینی درسگاہ ہے، جہاں دورۂ حدیث شریف تک تعلیم کا نظم ہے، مدرسہ کا احاطہ بھی کافی وسیع ہے، مولانا محمد یوسف متالا (جو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے خلفاء میں ہیں) اس کے ذمہ دارِ اعلیٰ ہیں اور وہی بخاری شریف کا درس بھی دیتے ہیں، مولانا موصوف بڑی محبت سے ملے اور اپنے دولت خانہ پر ضیافت بھی کی، یہاں افتاء کا کام مفتی شبیر احمد صاحب کرتے ہیں، جو صاحبِ ذوق آدمی ہیں، کتب خانہ کے ناظم مولانا محمد دیدات ہیں، واقعی انھیں ناظم کتب خانہ ہونے کا حق حاصل ہے، کتابوں پر بڑی نظر ہے، کون کتاب کہاں سے کب شائع ہوئی؟ کون سا مخطوطہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے؟ اس بارے میں گویا ایک انسائیکلو پیڈیا ہیں، بڑی محبت سے پیش آئے اور میری قیام گاہ پر بھی ملاقات کے لئے آئے، دارالعلوم کا کتب خانہ بھی کتابوں کی مقدار اور ترتیب ہر دو اعتبار سے اچھا ہے، کئی کتابیں (جن کے دیکھنے کا مشتاق تھا) یہاں نظر آئیں، اس سے خوشی ہوئی، ہم لوگ ظہر تک بلیک برن واپس آگئے۔

یہاں سے قریب ایک مقام 'بلیک پول' ہے، یہ سمندر کے ساحل پر واقع ہے، یہاں ہر سال ۱۵ دنوں کا روشنیوں کا ایک ثقافتی تہوار ہوتا ہے، سمندر کے کنارے ایک بڑے حصہ کو قمقموں سے آراستہ کیا جاتا ہے، روشن قمقموں ہی کے ذریعہ مختلف تہذیبوں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں، بچوں کے لئے ان کی مناسبت سے روشنی کے کارٹون بنے ہوتے ہیں، گویا روشنیوں کا ایک سمندر رواں رہتا ہے، بسیں، گاڑیاں اور ٹرینیں مسلسل سیاحوں کو لاتی اور لے جاتی ہیں، اخبار میں بھی اس بارے میں اطلاع آئی تھی، مولانا محمد ہاشم اور مولانا شعیب صاحب کی رائے ہوئی کہ برطانیہ کے اس خصوصی روشنی تہوار کو دیکھا جانا چاہئے، چنانچہ ہم لوگ وہاں بھی پہنچے، گاڑی سے اُترنے کی نوبت نہیں آئی اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹہ ہم لوگ اسی اتھاہ روشنی کے سایہ میں چلتے رہے، مجھے خیال ہوا کہ مغرب نے حقیقت کے بجائے ہر جگہ مصنوعی شکلوں کو اپنالیا ہے، اس لئے دین اور روحانیت کی روشنی پر تو کوئی توجہ نہیں؛ لیکن مصنوعی روشنی کا اس درجہ اہتمام ہے۔

بلیک برن میں بھی ایک بڑا دارالعلوم ہے، جس کے ذمہ دار مفتی عبدالصمد صاحب ہیں، یہ گجرات کے مشہور عالم مولانا محمد اسماعیل منوبری (مہتمم دارالعلوم کنتھاریہ) کے صاحبزادہ ہیں، نظم ونسق کا بڑا سلیقہ رکھتے ہیں اور منکسر المزاج عالم دین ہیں، انھوں نے اپنی کوششوں سے بہت کم وقت میں اس دارالعلوم کو ملک کی بڑی دینی درسگاہوں میں سے ایک بنادیا ہے، یہاں کے اساتذہ میں مفتی محمد اکرام الحق صاحب بھی ہیں، یہ مولانا محمد اسلام الحق (سابق شیخ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر) کے صاحبزادے ہیں، جو اپنے عہد کے بہت مقبول اساتذہ حدیث میں تھے، خود مفتی محمد اکرام الحق صاحب طویل عرصہ تک حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحبِ فتاویٰ رحیمیہ کے ساتھ رہے ہیں، وہ افتاء میں ان کے معاون اور معتمد خاص تھے، بلیک برن کی ہی ایک بڑی مسجد میں امام بھی ہیں، طبیعت میں سادگی اور بڑی کسر نفسی ہے، دارالعلوم میں بھی ملاقات رہی اور پھر قیام گاہ پر بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے، یہاں اساتذہ وطلبہ

سے خطاب بھی ہوا اور خطاب کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ بھی رہا، جس میں خاص طور پر قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔

پاکستان میں ایک ادارہ ''صدیقی ٹرسٹ'' ہے، جو کم قیمت پر کتابیں فراہم کرتا ہے اور بعض چھوٹے رسائل شائع کر کے مفت تقسیم بھی کرتا ہے، اس ادارہ کی طرف سے برطانیہ کے شہر بولٹن میں ''اسلامک بک سنٹر'' کے نام سے ایک تجارتی مکتبہ ہے، راقم الحروف وہاں حاضر ہوا، ماشاء اللہ عربی اُردو کی کافی کتابیں یہاں موجود ہیں، راقم الحروف نے یہاں سے بعض کتابیں بھی خریدیں، مکتبہ کے ذمہ دار (جن کا نام اب ذہن میں نہیں ہے) نے جب میرا نام سنا تو بڑے تپاک سے ملے اور وقت نہ ہونے کے باوجود بہ اصرار کباب اور چائے سے ضیافت کی، ذرائع مواصلات کی سہولت نے اب دنیا کے فاصلے گھٹا دیئے ہیں اور برطانیہ جیسے ملک میں عالم عرب کی کتابیں ہندوستان کے بہ نسبت زیادہ ملتی ہیں، میرا مولانا محمد فاروق ملا کی رفاقت میں لندن کے ایک تجارتی مکتبہ میں بھی جانا ہوا، وہ اس سے بھی بڑا مکتبہ ہے اور کتابوں کی قیمتیں بھی مناسب ہیں، وہیں سے اس حقیر نے ''محیط برھانی'' اور ''التجنیس والمزید'' خریدی، ایک نئی کتاب احادیث احکام پر نظر آئی، جسے پاکستان کے ایک فاضل نے مرتب کیا ہے، یوں سمجھئے کہ یہ ''اعلاء السنن'' کی تلخیص ہے، چوں کہ یہاں مدارس اور علماء کے پاس قوتِ خرید بھی بمقابلہ برصغیر کے زیادہ ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ کتابیں بھی خاصی مقدار میں فروخت ہوتی ہیں۔

آج بعد مغرب بولٹن ہی میں عوامی خطاب بھی تھا، بولٹن میں ایک نئی مسجد ''مسجد زکریا'' کے نام سے تعمیر ہوئی ہے، یہ بہت ہی خوبصورت، کشادہ، دو منزلہ مسجد ہے، اس کے ساتھ ساتھ مکتبہ کا نظام بھی ہے، برطانیہ میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہفتہ، اتوار کو قبرستان بھی بند رہتے ہیں، اس لئے اگر ان دنوں انتقال ہو جائے، تو تدفین کا مسئلہ بڑی دشواری کا ہو جاتا ہے اور مردہ خانہ میں رکھنا پڑتا ہے، چنانچہ اس مسجد میں مردوں کو غسل دینے اور ان کی لاش کو فریزر

میں محفوظ کرنے کا بھی بہت ہی اعلیٰ اور جدید انتظام ہے، نماز کے بعد خطاب ہوا اور عشاء کی نماز پڑھ کر ہم لوگ مولانا محمد اسماعیل کاپودروی کے دولت خانہ پر لے جائے گئے، یہ ہمارے بزرگ حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی (سابق مہتمم جامعہ فلاح دارین ترکیسر گجرات) کے صاحبزادہ ہیں اور خود بھی ماشاء اللہ صاحبِ ذوق ہیں، یوں بھی اور خاص کر والد صاحب کے تعلق کی نسبت سے بڑی محبت کے ساتھ ملے، یہیں رات کا کھانا کھایا گیا، شہر کے بہت سے علماء بھی یہاں جمع ہو گئے تھے، جن میں مولانا اسماعیل برکودروی، مولانا محمد علی، مولانا محمد شعیب صاحب، مولانا محمد ہاشم لمباداا اور ان کے صاحبزادگان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، چنانچہ رات دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ رہا اور رات میں مولانا شعیب صاحب کے یہاں 'پرسٹن' میں قیام ہوا۔

بولٹن میں ایک دارالعلوم بھی ہے، جس کے قیام پر زیادہ عرصہ نہیں ہوا، لیکن ماشاء اللہ دورۂ حدیث تک اب وہاں تعلیم ہوتی ہے، یہ دارالعلوم جس عمارت میں قائم ہے، وہ پہلے ہاسپٹل تھا، دارالعلوم کے ذمہ داروں نے ہاسپٹل کو خرید لیا، اس کے مہتمم قاری محمد یعقوب نانجی صاحب ہیں، وہ بڑے فعال اور فاضل ہیں، اس کے شیخ الحدیث مفتی عنایت اللہ مفتاحی ہیں، جو نوجوان ہی ہیں اور حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کے صحبت یافتہ ہیں، یہاں بھی اساتذہ و طلبہ سے خطاب ہوا، گجرات کے معروف علماء میں ایک مولانا محمد اسماعیل موٹا ہیں، وہ بھی یہاں تشریف لے آئے تھے، ان سے بھی گفتگو ہوئی، بڑی شفقت و محبت کا معاملہ فرمایا۔

۹ستمبر کو پھر ہم لوگوں کا لیسٹر کی طرف واپسی کا سفر شروع ہوا، آج صبح میں لیسٹر کے مضافات میں واقع ''اسلامک فاؤنڈیشن'' کا معائنہ اور وہاں خطاب تھا، قریب صبح ۱۰ بجے ہم لوگ فاؤنڈیشن پہنچے، یہ ایک وسیع خطہ اراضی میں واقع ہے، عمارتیں بڑی خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں، لائبریری بھی بہتر ہے، عربی، اُردو اور انگریزی کی کافی کتابیں اور رسائل لائبریری میں موجود ہیں، مغرب کی مناسبت سے یہاں بہت ساری کتابیں طبع ہوئی ہیں، ۱۹۷۳ء میں

اس کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کے سابق ذمہ داروں میں پروفیسر خورشید احمد (نائب امیر جماعتِ اسلامی پاکستان) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس وقت اس کے ذمہ دار ڈاکٹر مناظر احسن ہیں۔

فاؤنڈیشن دعوتی، اشاعتی اور تربیتی کاموں کے علاوہ انگلینڈ کی مختلف یونیورسیٹیوں سے طلبہ کو اسلامک اسٹڈیز، اسلامک ہسٹری اور اسلامک فینانس میں ایم اے بھی کرواتی ہے اور فضلاء دینی مدارس اور طلبۂ اسلامیات کے لئے مختلف قسم کے ورکشاپ بھی رکھتی ہے، جب میں حاضر ہوا تو اسلامک بینکنگ کے موضوع پر ایک ورکشاپ کا اعلان لگا ہوا تھا، جس میں خصوصی محاضرہ کی حیثیت سے مولانا محمد تقی عثمانی آنے والے تھے، ڈاکٹر مناظر احسن بہت ہی معتدل الفکر، دینی مزاج کے حامل، ایک دردمند صاحبِ علم اور صاحبِ قلم ہیں، جو اصل میں بہار کے رہنے والے ہیں، تقسیم ہند کے وقت بنگلہ دیش گئے اور پھر بنگلہ دیش سے پاکستان ہوتے ہوئے برطانیہ پہنچے، وہ برطانیہ کے حالات پر بہت متفکر تھے اور اس سلسلہ میں دینی حلقوں کی غفلت اور بے خبری پر متاسف اور فکر مند بھی، ان کو ۲۰۰۰ء میں برطانوی گورنمنٹ کی طرف سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

یہاں اساتذہ سے اس حقیر کا خطاب بھی رکھا گیا، پاکستان کے علاوہ بعض اساتذہ ترکی اور مصر سے تعلق رکھتے ہیں، راقم الحروف نے اپنے خطاب میں کئی باتیں کہیں، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مستشرقین کے مقابلہ ہمارے یہاں تین طرح کا ردعمل ہوا، ایک وہ لوگ تھے جو مغرب کی ہر بات کو قبول کرتے چلے گئے اور اس کے لئے وہ اسلام کے بعض بنیادی افکار میں معنوی تحریف کے مرتکب بھی ہوئے، اس گروہ کے سرخیل ہندوستان کے ایک صاحبِ علم ہیں (سرسید احمد خاں) جو تھے تو مخلص، لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے مغربی صنعتی ترقی اور مغربی تہذیب وافکار کو ایک دوسرے کا سبب سمجھ لیا اور اس لئے مسلمانوں کو مغربی ثقافت کے سامنے سرنگوں ہوجانے کی دعوت دی، اس فکر کے لوگ دوسرے علاقہ میں بھی پیدا ہوئے،

خاص کر مصر، ــــ میں دوسرا ردِّعمل یہ تھا کہ مغرب کی ہر چیز قابل نفرت ہے، یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے مغرب کی نسبت کی وجہ سے انگریزی زبان کی بھی مخالفت کی اور انھوں نے مستشرقین کا جواب دینے میں مناظرانہ اُسلوب اختیار کیا، چنانچہ انیسویں صدی میں برصغیر میں جو تحریریں مغربی مصنفین کے رد میں لکھی گئی ہیں، ان میں اس اُسلوب کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

تیسرا طریقہ وہ ہے جسے 'معروضی اُسلوب' کہتے ہیں، یعنی مستشرقین کے اعتراضات کا رد کیا جائے، لیکن انداز مناظرانہ نہ ہو، تحریر میں جذباتیت نہ ہو اور مستشرقین کے اُسلوب میں ہی ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے، مصر میں ڈاکٹر رشید رضاؒ اور ہندوستان میں علامہ شبلیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کو اس اُسلوب کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے، موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ مغرب کے مقابلہ یہ تیسرا اُسلوب اختیار کیا جائے اور اس کے لئے مستشرقین کی تحریروں سے پوری آگہی اور علومِ اسلامی کے اصل مصادر و مآخذ پر گہری بصیرت مطلوب ہے اور اسلامک فاؤنڈیشن چوں کہ مغرب کے قلب میں قائم ہے، اس لئے وہ اس کام کو بہتر طریقہ پر کرسکتا ہے، مولانا محمد فاروق ملا نے میرے خطاب کو انگریزی کا جامہ پہنایا، ایک صاحب جو غالباً پاکستانی ہیں، کہنے لگے کہ آج بہت عرصہ کے بعد اتنی خوبصورت اور میٹھی اُردو سننے کا موقع ملا ہے۔

برطانیہ کا ایک تاریخی شہر 'لنکن' ہے، یہاں ایک بہت بڑا اور قدیم چرچ بھی ہے، یوں تو یہ چرچ بھی دوسرے چرچوں کی طرح ویران ہی ہے، لیکن اس کی قدامت اور تاریخی حیثیت کی وجہ سے کثرت سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں، مغرب کے بعد یہاں مسجد میں خطاب ہوا، لنکن میں مسلم آبادی کم ہے، لیکن اچھے پڑھے لکھے لوگوں کی آبادی ہے، سامعین میں بھی زیادہ تر ڈاکٹر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات تھے، لوگوں نے بڑی توجہ سے بات سنی، پھر ایک صاحب کے یہاں عشائیہ ہوا، جو پاکستان نژاد برطانوی ہیں اور خلیق و مہمان نواز ہیں۔

مولانا محمد فاروق ملا کے ادارہ میں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک قابل ذکر شخصیت جناب عبدالرحمٰن صاحب کی ہے، وہ انگریز نومسلم ہیں، ان کے والد برطانیہ کے مشہور جرنیلوں میں تھے، خود وہ آرکٹکٹ ہیں، اپنے مطالعہ کی مدد سے ۱۹۹۷ء میں انھوں نے اسلام قبول کیا، وہ اب اپنا سابق نام زبان پر لانا بھی نہیں چاہتے ہیں، انھوں نے چار ماہ تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگایا ہے اور ہندو پاک کے مختلف شہروں کا سفر کیا ہے، پہلے زمبابوے میں رہتے تھے اور اب لندن میں مقیم ہیں، نے میں ان سے دریافت کیا کہ ان کے اسلام قبول کرنے کا سبب کیا ہوا؟ تو انھوں نے دو باتیں بتائیں: ایک یہ کہ میری والدہ نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ خریدا تھا، میں اسے زیادہ سمجھ تو نہیں پایا، لیکن میرے دل نے اپنے آپ دو باتوں کی گواہی دی، ایک یہ کہ یہ کتاب خدا ہی کی ہے، دوسرے: خدا کا اصل نام اللہ ہی ہوگا، پھر میں اسلام کے بارے میں پڑھتا رہا، میں نے محسوس کیا کہ اسلام میں عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے بڑی سادگی ہے، کوئی فلسفہ اور ژولیدگی نہیں ہے، عام سے عام آدمی بھی اسے سمجھ سکتا ہے، اس سادگی نے ہمیں متاثر کیا اور میرے اسلام لانے کا سبب ہوا۔

ان پر تھوڑی سی جذب کی کیفیت بھی طاری رہتی ہے، مختلف تہذیبوں اور علاقوں کی تاریخ پر وسیع نظر ہے، آج کل وہ اس پر کام کر رہے ہیں کہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے اعتبار سے کعبۃ اللہ زمین کے ٹھیک مرکز یعنی ''ناف ارض'' پر بنا ہوا ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے انھوں نے بہت سے جغرافیائی نقشے کمپیوٹر پر تیار کئے ہیں، جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر اس کے بجائے آپ انگریزوں میں دعوت اسلام کا کام کریں، تو زیادہ مفید بات ہوگی اور آپ کی یہ کوشش عند اللہ بھی زیادہ مقبول ہوگی، جناب عبدالرحمٰن صاحب بڑے نرم خو اور خلیق انسان ہیں، ان کی داڑھی اور عمامہ کو دیکھ کر کسی دینی درسگاہ کے شیخ الحدیث کا گمان ہوتا ہے، اُردو زبان انھیں بے حد پسند ہے، اور وہ بہت اچھی اُردو بولتے ہیں، پوری پوری رات کمپیوٹر پر عملی و تحقیقی کاموں میں گذارتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کی ہدایت

کا ذریعہ بنائے۔

لیسٹر میں جن اہل علم سے ملاقات ہوئی، ان میں دو شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک تو مولانا احمد لاجپوری مدظلہ کی، یہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں ہیں، عمر ۸۰ سے متجاوز ہوگی، بڑھاپا جسم کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہے، تکلیف کے ساتھ ہی چل پاتے ہیں، ایک زمانہ تک زامبیا میں تعلیم قرآن کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں، اب اپنے بال بچوں کے ساتھ لیسٹر میں مقیم ہیں، ان کی سند حدیث بہت عالی ہے اور ایک واسطہ سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، تواضع اور انکساری اتنی زیادہ ہے کہ ہم جیسے کوتاہ علم کو بھی شرمساری ہوئی، راقم الحروف نے صحاحِ ستہ سے ایک ایک حدیث پڑھ کر ان سے حدیث کی اجازت حاصل کی، انھوں نے زبانی بھی حدیث کی اجازت دی اور تحریری اجازت بھی مرحمت فرمائی، پھر مسجد الفلاح اور اسلامک بینکنگ کے پروگرام میں تشریف لائے اور مجھ سے مل کر فرمایا کہ تمہاری وجہ سے پروگرام میں آیا ہوں، اسلامی بینکنگ والے پروگرام کے اختتام پر میں نے اصرار کر کے انھیں سے دُعاء کرائی، واقعی وہ سلف کی سادگی، بے تکلفی اور شفقت ومحبت کا نمونہ ہیں، اللہ تعالیٰ تادیر عافیت کے ساتھ ان کا سایۂ عاطفت قائم رکھے۔

دوسری شخصیت مولانا محمد اقبال اعظمی کی ہے، یہ ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ سے بہت قریبی تعلق رہا ہے، مولانا اعظمیؒ کے ساتھ اسفار میں رفاقت بھی انھیں رہی ہے، چنانچہ مولانا علی میاںؒ کی متعدد کتابوں کو انھوں نے برطانیہ سے خوبصورت انداز پر اچھے گیٹ اپ کے ساتھ اور بعض میں عناوین اور فرہنگ کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہے، سیرتِ نبوی ﷺ پر ان کی ایک کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوچکی ہے اور اسے اہل علم میں بڑی قبولیت حاصل ہوئی ہے، مولانا موصوف بڑے اخلاق اور محبت سے ملے اور کئی بار میری قیام گاہ پر بھی

تشریف لائے۔

۱۰ ستمبر کو ظہر کے بعد لیسٹر سے تھوڑے فاصلہ پر واقع شہر گرانتھم میں ڈاکٹروں سے خطاب تھا، یہ اجتماع ڈاکٹر شفقت صاحب کے مکان پر ہوا، جس میں مرد و خاتون ڈاکٹرس اکٹھا ہوئے تھے، میں نے تھوڑی دیر اسلام میں خدمتِ خلق کی اہمیت اور ڈاکٹروں کے فرائض اوران کے داعیانہ کردار کے پہلو پر روشنی ڈالی، پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، زیادہ تر سوالات جدید میڈیکل مسائل سے متعلق تھے اور کچھ زکوٰۃ سے متعلق، بعض دیگر سوالات بھی کئے گئے، یہ مجلس علمی و فقہی اعتبار سے بڑی مفید رہی اور لوگوں کا اچھا تاثر رہا۔

۱۱ ستمبر کو ہم لوگ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق 'بلیک فورڈ' پہنچے، یہاں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے، علماء بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ چند سال میں یہاں مسلمان اکثریت میں آجائیں گے، عام طور پر پاکستان نژاد مسلمان ہیں، یہاں کثرت سے اُردو سائن بورڈ بھی نظر آتے ہیں، شہر میں علماء کے لئے ایک روزہ تربیتی پروگرام رکھا گیا تھا، پروگرام وہاں کے ایک مسلم اسکول کے کانفرنس ہال میں تھا، تقریباً پچاس سے زیادہ علماء جمع ہوگئے تھے، آنے والوں میں مولانا محمد اسماعیل کچھولوی، جو قدیم علماء میں ہیں اور قاری عرفان صاحب (نائب صدر جمعیتِ علماء برطانیہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس پروگرام کے داعی اور ہمارے میزبان مولانا مفتی زبیر صاحب تھے، جو لیسٹر کے تربیتِ قضاء پروگرام میں بھی شریک ہوئے تھے، یہ دارالعلوم کراچی کے فاضل ہیں، اور صاحبِ ذوق نوجوان فضلاء میں ہیں، صبح کی نشست میں ''جدید مسائل اور اس کے حل کا طریقہ'' کے عنوان سے اس حقیر کا خطاب ہوا، دوسری نشست جو ظہر کے بعد منعقد ہوئی، میں غیر مسلم ممالک میں نظام قضاء اور مسلم پرسنل لاء کی اہمیت پر گفتگو کی گئی اور سوالات کے جواب دیئے گئے، ایک ساتھ اتنے سارے علماء اساتذہ اور مشائخ سے ملاقات کرکے بڑی مسرت ہوئی۔

آج شام میں ہمارا پروگرام ''باٹلی'' میں رکھا گیا تھا، باٹلی اور ڈیوزبری جڑواں شہر ہیں،

یہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے اور علماء و مشائخ بھی بڑی تعداد میں ہیں، وہاں مسجد دعوۃ الاسلام کے نام سے مولانا مفتی محمد یوسف صاحب کی کوششوں سے ان کے مکان کے سامنے ہی ایک بڑی خوبصورت مسجد تعمیر ہوئی ہے، اس مسجد میں اصلاحی بیانات کے سلسلہ کا آغاز کرنے کے لئے اس حقیر کو مدعو کیا گیا اور عصر بعد خطاب ہوا، خطاب میں علماء اور عوام کے ارتباط کی اہمیت اور نہی عن المنکر کی طرف توجہ کی ضرورت پر کچھ باتیں کہی گئیں، یہاں لوگ عام طور پر مغرب سے پہلے ہی رات کا کھانا کھا لیتے ہیں، چنانچہ مفتی صاحب کے یہاں کھانا کھایا گیا، جو بڑا ہی پر تکلف تھا، اس پروگرام کی مناسبت سے آئے ہوئے علماء بھی کھانے میں شریک تھے، جو اچھی خاص تعداد میں تھے۔

باٹلی میں ایک اچھا سلسلہ کچھ علماء اور اربابِ افتاء نے ہفتہ وار ''مجلس فقہی'' کا قائم کر رکھا ہے، یہ مجلس مفتی صاحب کے مکان پر ہوتی ہے اور باٹلی اور ڈیوزبری کے اصحابِ افتاء جمع ہوتے ہیں اور ہفتہ بھر میں جو مشکل سوالات سامنے آتے ہیں، ان پر اجتماعی طور سے غور و فکر کرتے ہیں، معمول کے لحاظ سے آج اس مجلس کا وقت نہیں تھا، لیکن اس حقیر کی آمد کی وجہ سے احباب نے آج ہی مجلس رکھ دی تھی، مفتی مرغوب احمد لاجپوری نے اس حقیر کا اپنے حسن ظن کے مطابق تعارف کرایا اور پھر مجھ سے خطاب کرنے کی خواہش کی، میں نے عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ اُمت اشاعتِ دین، حفاظتِ دین اور تحقیق دین کا فریضہ انجام دے، ان میں اشاعتِ دین کا کام تو عوام بھی کر سکتی ہے اور ایک حد تک کر بھی رہی ہے، لیکن تحقیق دین اور حفاظتِ دین علماء کی ذمہ داری ہے، اگر عوام اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، تو اس سے گمراہی کا راستہ کھل جائے گا اور نئے مسائل کا حل تحقیق دین میں داخل ہے، راقم الحروف نے اس سلسلہ میں بزرگوں کی خدمات اور خاص کر ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کی خدمات اور طریقۂ کار پر بھی روشنی ڈالی، اخیر میں برطانیہ میں پیش آنے اور اس مجلس میں زیر بحث آنے والے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، سوالات کئے گئے

اور راقم الحروف نے اپنی معلومات کے مطابق جواب دیئے، اس مجلس میں بھی ڈیوز بری باٹلی سے اہل علم اور اربابِ افتاء کی اچھی خاصی تعداد اکٹھا ہوگئی تھی اور ان کے سوالات سے خود مجھے بہت نفع ہوا۔

مولانا محمد ہاشم لمبادا اور ان کے فرزندان کی خواہش بلکہ محبانہ اور مخلصانہ اصرار پر یہ حقیر آج پھر بلیک برن واپس گیا، اگلے دن ۱۲ستمبر کو ان دوستوں نے تفریحی پروگرام رکھا اور اس کے لئے یہاں کے ایک مشہور علاقہ لیک ڈسٹرکٹ کا انتخاب کیا، یہ جھیلوں کا علاقہ ہے اور اس پر ایک بہت بڑی جھیل ہے، جو سیاحوں کا مرکز ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی اپنے سفر نامہ میں اس علاقہ میں جانے کا ذکر کیا ہے، اس جھیل کے مختلف کناروں پر بڑے بڑے پارک اور سیاحوں کی ضروریات کے مرکز بنے ہوئے ہیں، ہم لوگوں نے جھیل کے ایک کنارے کنسٹن لیک (Coniston Lake) پر ظہرانہ تناول کیا، پھر ایک اور علاقہ امبل سائٹ Amble Site میں ایک سبزہ زار پر نمازِ ظہر ادا کی اور اخیر میں لیک وِنڈر میری Lake Winder Mere نامی جگہ پر —— جو قدرتی مناظر کے اعتبار سے بڑی خوبصورت اور سرسبز و شاداب جگہ ہے، —— تھوڑی دیر ٹھہر کر چائے وغیرہ پی اور پھر بلیک برن واپس ہوئے، اس سفر میں مولانا محمد شعیب صاحب کی رفاقت بھی حاصل رہی۔

اس کے بعد لیسٹر ہوتے ہوئے چند دنوں لندن میں قیام رہا، لندن میں برٹش میوزیم دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ بہت بڑا اور غیر معمولی میوزیم ہے، اس کا احاطہ بھی بہت وسیع ہے، جس میں مصر، ترکی، چین، ہندوستان، افریقہ، یونان، فارس اور یورپ وغیرہ کے الگ الگ ہال ہیں، ان ہالوں میں بہت سی قابل دید چیزیں ہیں، ایسے حجری ستون بھی دیکھنے کو ملے جو بارہ سو قبل مسیح کے خیال کئے جاتے ہیں، فرعون کی لاش گو مصر میں ہے، لیکن فرعون کے بعض وزراء اور مقربین کی لاشیں ممی کی ہوئی یہاں موجود ہیں، اسی طرح وہ سنگی تابوت بھی قابل دید ہیں جو مصر میں فراعنہ کے عہد میں استعمال کئے جاتے تھے، نمرود کے شاہی دربار کے سنگی ستون و محراب بھی

رکھے گئے ہیں، جو۸۳۳ قبل مسیح کے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وہ نمرود نہیں ہوسکتا، جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سابقہ پیش آیا تھا، بلکہ یہ بعد کا عراقی حکمراں ہے، فارس کی گم شدہ تہذیب کی بقیات بھی یہاں رکھی گئی ہیں، ہندوستان کی بھی بہت سی چیزیں اس میوزیم میں نظر آئیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اس ملک کو انگریزوں نے لوٹا اور کھسوٹا ہے، اس میں ایک گیلری سکوں کی بھی ہے، جس میں نقری اور طلائی سکے نظر آتے ہیں، سکوں کو ڈھالنے سے پہلے کرنسی کے طور پر لوہے کے ٹکرے اور کوڑیاں استعمال کی جاتی تھیں، یہ بھی اس گیلری میں موجود ہیں، طلائی سکوں میں سب سے بڑا سکہ شاہ جہاں کے عہد کا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانوی استعماریت سے پہلے ہندوستان معاشی اعتبار سے یورپ کے مقابلہ کہیں ترقی یافتہ تھا۔

میوزیم میں ایک گیلری اسلامی یادگاروں کے لئے بھی ہے، جس میں مختلف ملکوں کی تہذیبوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور قرآن مجید کے دوسری صدی سے لے کر ماضی قریب تک کے نسخے رکھے گئے ہیں، میوزیم کی مدوّر عمارت کے وسط میں ایک بڑی لائبریری بھی ہے، جس میں نادرونایاب کتابیں (مطبوعہ ومخطوطہ) رکھی گئی ہیں اور اس کے ساتھ مطالعہ کی سہولت بھی ہے۔

میوزیم کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں جو تاثر قائم ہوا، وہ یہ کہ سترھویں صدی میں جو صنعتی انقلاب شروع ہوا اور مغرب نے صنعت اور ٹکنالوجی میں ترقی کی، اس سے پہلے مشرق کو مغرب پر علمی واقتصادی بالادستی حاصل رہی ہے اور یورپ جس عہد تاریک کا ذکر کرتا ہے، وہ تاریک عہد اس کی فضاؤں میں آیا تھا، نہ کہ مسلم اور مشرقی ممالک میں، یہ میوزیم ایک حد تک ہم جیسوں کے لئے احساسِ کمتری کو دور کرنے کا سامان بھی ہے۔

لندن کے قیام میں محترم دوست مفتی محمد برکت اللہ قاسمی کے ساتھ برٹش لائبریری بھی جانے کا اتفاق ہوا، مفتی صاحب نے ۱۹۷۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت اور ۱۹۷۴ء میں

افتاء کیا ہے، پھر انھوں نے برطانیہ میں جدید علوم بھی حاصل کئے ہیں اور کئی ڈگریوں کے حامل ہیں، ایک زمانہ تک انھوں نے کتبِ فقہ کو کمپیوٹر پر لانے کی کوشش کی ہے، ان دنوں ان کا خاص موضوع ''اسلامک بینکنگ'' ہے، وہ مختلف اسلامک بینکوں میں مشیر شرعی کی حیثیت سے کام کررہے ہیں، میں نے ان سے خواہش کی کہ ہندوستان میں بھی ہم لوگ اسلامک بینکنگ پر ورکشاپ رکھیں گے، وہ اس میں مربی کی حیثیت سے شریک ہوں، اس وقت انھوں نے ایک ہیلپ لائن قائم کر رکھی ہے، جس کے ذریعے استفتاء کے جواب دیتے ہیں، ان ہی کے ہمراہ یہ حقیر برٹش لائبریری پہنچا، یہ دنیا کی چند عظیم لائبریریوں میں سے ایک ہے، لائبریری کی لابی میں پریس کی ایجاد اور ماقبل پریس دور سے متعلق بہت سی یادگاریں رکھی گئی ہیں اور دورانِ مطالعہ جن چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی ہیں، ان کی دکانیں بھی ہیں، لائبریری سے استفادہ کے لئے ممبر بننا ضروری ہے، چنانچہ مفتی صاحب مجھے لائبریری کے آفس میں لے گئے، آفس کے عملہ نے بڑے اخلاق و ہمدردی کا معاملہ کیا اور مختصر سی کارروائی کے بعد مجھے ممبر شپ کا کارڈ مل گیا، وقت بہت کم تھا، کیوں کہ جمعہ کا دن تھا اور مجھے بھی اور مفتی صاحب کو بھی دو الگ الگ مقامات پر جمعہ کی نماز پڑھنی تھی، اس لئے میں سیدھا مخطوطات والے حصہ میں گیا، میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا یہاں ''فوائد ظہیریہ'' کا کوئی مخطوطہ موجود ہے؟ مسودہ نظر آ گیا، اس کے لئے درخواست مفتی برکت اللہ صاحب کے حوالہ کرائی، اُمید ہے کہ جلد ہی اس کی مائیکروفلم مجھ تک پہنچ جائے گی، ان شاء اللہ، آج کل انڈیا آفس لائبریری کو برٹش لائبریری ہی کا حصہ بنا دیا گیا ہے، اس میں ہندوستان کی بہت سی ''مغصوبات'' جمع ہیں، جسے انگریز لے گئے تھے اور برطانوی استعمار کی پوری تاریخ روز بروز کی تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اگر کوئی شخص ہندوستان کی تاریخ لکھنا چاہے، تو شاید اس عہد کے متعلق ہندوستان میں اتنا مواد نہیں مل سکے، جتنا مواد یہاں اسے دستیاب ہوسکتا ہے۔

قریب ۱۱ بجے ہم لوگ لائبریری سے نکلے اور لندن میں اپنی قیام گاہ کو واپس آتے

ہوئے یہاں کی ایک تاریخی مسجد پہنچے، یہ 'شاہ جہاں بیگم مسجد' ہے، جو اس ملک میں تعمیر ہونے والی سب سے پہلی مسجد ہے، اسے نواب شاہ جہاں بیگم بھوپال نے ۱۸۸۹ء میں تعمیر کرایا تھا، اس مسجد کی تعمیر کے محرک پروفیسر لائٹز تھے، وہ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے، وہ چالیس سے زیادہ زبانوں سے واقف تھے، مسلمانوں سے ان کے بہت قریبی روابط رہے، اس لئے وہ برطانیہ میں ایک مسجد اور ایک اسلامک درسگاہ قائم کرنے کے خواہش مند تھے، یہ مسجد ان ہی کی تحریک اور کوششوں اور نواب صاحبہ کی مالی اعانت کا نتیجہ ہے، یہ مسجد زیادہ بڑی نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ مسجد کی ضروریات کے لئے ایک بڑی اور خوبصورت عمارت بھی ہے اور یہ سب کچھ ایک وسیع احاطہ بند سبزہ زار کے درمیان واقع ہے، لندن کے دو مختلف علاقوں میں مسجدوں میں خطاب ہوا، ایک کراوڈون (Croydon) میں اور ایک لیٹن (Leyton) میں، کراوڈون میں مفتی یوسف صاحب امام ہیں، جو برمی نژاد ہیں اور بڑا اچھا علمی و تحقیقی ذوق رکھتے ہیں، انھوں نے دارالعلوم کراچی میں افتاء کیا ہے، یہ دونوں مسجدیں علاقہ کی بڑی مسجدیں ہیں، جہاں تعلیمی اور دعوتی سرگرمیاں بھی منظّم انداز پر انجام دی جاتی ہیں۔

معروف صاحبِ علم اور صاحبِ قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (جو دراصل ان کے علمی و قلمی جانشیں ہیں) طویل عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں، ان سے بھی ملاقات کا اشتیاق تھا، چنانچہ لندن میں قیام کے دوران مولانا سنبھلی کے دولت خانہ پر بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے، راقم الحروف نے ان سے ذکر کیا کہ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں الفرقان کی فائل میں ''دین میں حکمت عملی کا مقام'' کے عنوان سے مولانا مودودیؒ کے رد میں آپ کی تحریر پڑھی تھی، اس وقت سے آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا، مولانا سن کر ہنسے اور فرمایا کہ بہت سے بزرگوں کی توجہ میری طرف اس تحریر کے ذریعہ ہوئی، مولانا کی عمر اسّی کے آس پاس ہوگی، ان کا قلم بہت شستہ ہے اور فکر میں گہرائی ہے، آپ نے ہندوستان کی آب و ہوا کے

موافق نہ ہونے کی وجہ سے لندن کو اپنی مستقل قیام گاہ بنالیا، مولانا کا مکان جس علاقہ میں واقع ہے، اس کے قریب راسخ العقیدہ یہودیوں کی ایک مشہور آبادی ہے، ہم لوگ اس آبادی سے گذرتے ہوئے مولانا کی قیام گاہ پہنچے، راستہ میں پہلی بار اتنے سارے یہودیوں پر نظر پڑی، بہت بڑی سینہ کو پار کرتی ہوئی داڑھیاں، سر پر زلفیں، چھوٹی سی سیاہ ٹوپی، جو تالو کے حصہ کو ڈھکتی ہے، چہرہ کے دونوں طرف کانوں سے پہلے مونڈھے تک لٹکتی ہوئی بالوں کی دو ہلکی چوٹیاں، سیاہ لمبے کوٹ اور سیاہ پینٹ، اور بعض اوقات سر پر سیاہ ہیٹ بھی، اس علاقہ میں چھوٹے بچوں کو بھی دیکھا کہ وہ سیاہ ٹوپی پہنتے ہیں اور ان کی بھی چوٹیاں لٹکی ہوتی ہیں، یہودی خواتین عام طور پر سر پر وگ پہنی ہوئی نظر آئیں، بعض حضرات نے بتایا کہ مذہبی یہودی خواتین بال منڈا لیتی ہیں اور سر پر بال نما وگ استعمال کرتی ہیں، کیوں کہ یہودی مذہب میں شوہر کے سوا کسی اور کو عورت کے سر کا بال نظر نہیں آنا چاہئے۔

لندن میں دوسری اہم شخصیت جن سے ملاقات ہوئی وہ مولانا محمد شمیم احمد باگیہ ہیں، یہ دارالعلوم ثابو برما کے فضلاء میں ہیں، مفتی محمود داؤد، مفتی اعظم برما، مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری وغیرہ ان کے اساتذہ میں ہیں، ۳۰ سال سے برطانیہ میں مقیم ہیں، اعلیٰ ذوق کے حامل ہیں اور مخطوطات پر اچھی نظر رکھتے ہیں، ان کی لائبریری میں دنیا کی مختلف اہم لائبریریوں کی فہرستِ مخطوطات موجود ہیں، یہ ''طبقاتِ حنفیہ'' پر بڑا اہم کام کررہے ہیں اور بقول ان کے تین چوتھائی کام ہو چکا ہے، جو پندرہ ہزار تراجم کو شامل ہے، ایک اور کام اس کے ذیل میں مکہ کے علماء احناف کے تراجم واحوال جمع کرنے کا بھی آپ نے کیا ہے، یہ تشنہ تکمیل ہے، اب اس وقت ''تاریخ الآداب الاسلامیہ'' آپ کا موضوع ہے اور اس سلسلہ میں آپ کی کوششیں جاری ہیں، انھوں نے اپنے اثاثہ کا بڑا حصہ ان کاموں کے لئے کتابوں کی خریداری اور فوٹو اسٹیٹ کاپی پر خرچ کر دیا ہے، کبرسنی، علالت اور تجرد کی زندگی کی وجہ سے مزاج میں جھنجھلاہٹ اور تندی سی ہے، انھیں برطانیہ کی دینی درسگاہوں سے شکوہ ہے کہ ان کے

اس علمی وتحقیقی سفر میں ان اداروں کی طرف سے کثیر وسائل ہونے کے باوجود کوئی تعاون نہیں رہا، لیکن ان کے گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مزاج اور زبان وبیان کی تندی کی وجہ سے شاید لوگ ان سے قریب نہیں ہو پاتے اور اس طرح نئے فضلاء ان کے فیض علم سے محروم ہیں، خدا کرے کہ ان کی یہ کاوشیں جلد منظر عام پر آئیں اور اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملے۔

لندن سے ہم لوگ پھر لیسٹر واپس آئے اور ۱۹ستمبر کو ہمارا سفر گلاسٹر (Gloucester) کا ہوا، آج شعبان کی پندرہویں شب تھی، اس مناسبت سے گلاسٹر کی جامع مسجد میں مغرب بعد خطاب رکھا گیا، مسجد اوپر نیچے بھری ہوئی تھی، چنانچہ کچھ اصلاحی گفتگو کی گئی اور کچھ موجودہ حالات کی مناسبت سے، گلاسٹر میں ہمارا قیام مفتی عبداللہ صاحب کے یہاں رہا، یہ دارالعلوم آزاد وِل جنوبی افریقہ سے ۱۹۹۲ء میں فارغ ہوئے، پھر دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث اور افتاء کیا، گلاسٹر کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے اور مسلمانوں کی آبادی تین ہزار، لڑکیوں کا اسکول ہے، مولانا موصوف صاحب ذوق عالم دین ہیں، انھوں نے ایک اسلامک اکیڈمی بھی قائم کر رکھی ہے، جس کے تحت اسکول بھی ہے، نیز دینی کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی یہاں سے شائع کئے جاتے ہیں اور ایک اہم کام حلال وحرام غذاؤں کی تحقیق کا یہ ادارہ کرتا ہے، یہاں جس مقام میں ہم لوگ مقیم تھے، معلوم ہوا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ برطانیہ تشریف لے گئے تو اس مکان میں ان کا بھی قیام تھا، اس حسن اتفاق سے فطری طور پر مسرت ہوئی۔

اگلے دن گلاسٹر سے واپس ہوتے ہوئے ہم لوگ آکسفورڈ آئے، آکسفورڈ ایک متوسط درجہ کا شہر ہے، جو دیکھنے میں چرچوں کا شہر معلوم ہوتا ہے، اس شہر کے نام پر آکسفورڈ یونیورسٹی ہے، جیسے ہمارے یہاں مسجدوں میں تعلیم کا انتظام ہے ویسے ہی یہاں مختلف چرچوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام تھا، جو آہستہ آہستہ عصری تعلیم کے کالج میں تبدیل ہوتا گیا، چنانچہ یہ مختلف خودمختار کالج ہیں، جن کی انتظامیہ الگ الگ ہے، تعلیمی فیسیں اور طلباء وطالبات کے

لئے سہولتیں بھی مختلف ہیں، لیکن ان کا ایک وفاق ہے، یہی وفاق ’آکسفورڈ یونیورسٹی‘ کہلاتا ہے، علی گڑھ، عثمانیہ یونیورسٹی یا ہندوستان کی کسی اور یونیورسٹی کی طرح اس کا کوئی اپنا کیمپس نہیں ہے، اس یونیورسٹی کی لائبریری بہت بڑی اور قابل دید ہے، افسوس کہ وقت کی کمی اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے میں صرف باہر ہی سے ایک جھلک دیکھ سکا۔

لائبریری کے سامنے جو سڑک گذرتی ہے اور جس کے گرد کئی کالج نظر آتے ہیں، وہاں سڑک کے کنارے تھوڑی سی جگہ میں کچھ اُبھرے ہوئے پتھر ہیں، یہ وہ جگہ ہے جہاں سائنس دانوں کو ان کے جذبۂ تحقیق پر سزا دی جاتی تھی اور زندہ نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا، کیوں کہ چرچوں کی طرف سے علمی تحقیق پر پابندی تھی اور اسے مذہب کے خلاف بغاوت سمجھا جاتا تھا، مغرب میں مذہب کے خلاف اس وقت بغاوت اور انکار کی جو فضاء ہے، اس کا اصل سبب یہی ہے کہ چرچوں نے اپنے دورِ اقتدار میں سائنس دانوں پر بڑے مظالم روا رکھے تھے۔

آکسفورڈ کے مختلف کالجوں اور لائبریری کے احاطہ کی عمارتیں بہت ہی قدیم یا قدیم طرز کی ہیں، یہاں تک کہ اینٹوں اور اینٹ نما پتھروں کے فرش بھی بعض جگہ پرانے ہونے کی وجہ سے گھس گئے ہیں، یہ یورپ کی قدامت پرستی اور اپنے قدیم ورثہ کی حفاظت کا نمونہ ہے اور کہا جاتا ہے مسلمانوں کو اور اہل ایشیاء کو، کہ وہ قدامت پرست ہیں!

آکسفورڈ میں اسلامک سنٹر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، جس کی بنیاد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہاتھوں رکھی گئی تھی اور وہ اس سنٹر کے پہلے صدر بھی تھے، اب اس کے صدر ڈاکٹر سید سلمان ندوی جنوبی افریقہ (صاحبزادہ علامہ سید سلیمان ندویؒ) ہیں، جناب فرحان نظامی (صاحبزادہ ڈاکٹر خلیق نظامی) اس کے ڈائرکٹر ہیں، چند افراد یہاں علمی اور انتظامی کام کرتے ہیں، جن میں ایک نمایاں نام مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی کا ہے، مولانا ندوی سے میری ملاقات اس زمانہ کی ہے جب وہ ندوہ میں زیر تعلیم تھے، یا نئے نئے فارغ ہوئے تھے، انھیں یہ ملاقات یاد تھی، اس لئے متعدد بار فون پر رابطہ قائم کیا، آکسفورڈ میں ہم لوگ ان ہی کے سنٹر میں

پہنچے، بڑی محبت سے پیش آئے، وہ ان مسلمان خواتین کے تذکرے جمع کر رہے ہیں، جو علمی وادبی اعتبار سے ممتاز رہی ہیں اور اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی تعداد کا تعارف انھوں نے کتابوں سے اکٹھا کیا ہے، یہ ایک اہم کام ہوگا اور مستشرقین کے اعتراض کا مثبت اور مسکت جواب ہوگا، اللہ کرے جلد اس کی اشاعت عمل میں آئے! اس سنٹر کے تحت اس وقت مختلف فقہاء، محدثین اور علمی سلسلوں کے شجرے مرتب کئے گئے ہیں، انشاء اللہ علوم اسلامی کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ ایک بڑا کارنامہ ہوگا، تاہم اس سنٹر کے محل وقوع اور اس کے وسائل کے لحاظ سے میرا احساس ہے کہ اس سے اور بھی زیادہ مفید اور وسیع کام لیا جاسکتا ہے اور اہل تحقیق کا ایک کارواں 'دارالمصنفین' کی طرح یہاں سے تیار کیا جاسکتا ہے، خدا کرے ذمہ داروں کو اس جانب توجہ ہو۔

۳۱ستمبر کو ظہر کے بعد ہم ہندوستان واپسی کے لئے لیسٹر سے ہیتھرو ایرپورٹ کے لئے نکلے، مولانا محمد فاروق ملا کے علاوہ مولانا محمد سلیمان صاحب، مولانا امین الدین صاحب اور حافظ محمد حسن صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے، ہم لوگوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو کیمبرج کی طرف سے ہوتے ہوئے گذرتا ہے، تاکہ برطانیہ کی دوسری شہرۂ آفاق یونیورسٹی کیمبرج کو دیکھنے کی حسرت باقی نہ رہ جائے، کیمبرج یونیورسٹی کا احاطہ آکسفورڈ سے غالباً زیادہ وسیع ہے اور عمارتیں بھی زیادہ سلیقہ اور قرینہ کی ہیں، کیمبرج ہی میں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا، ان یونیورسٹیوں میں بہت بڑی تعداد غیر ملکی طلبہ کی ہے اور خاص طور سے آج کل چینی طلبہ وطالبات کی بڑی تعداد یہاں نظر آتی ہے، چین اس وقت انگریزی زبان اور مغربی ٹکنالوجی کے حصول پر ایک منصوبہ کے ساتھ توجہ دے رہا ہے، اس لئے مغربی درسگاہوں میں ان کی بڑی تعداد ہے، معلوم ہوا کہ آکسفورڈ میں طلبہ وطالبات کی مجموعی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے، کم وبیش اتنی ہی تعداد کیمبرج میں بھی ہوگی۔

کیمبرج سے گذرتے ہوئے ہم لوگ پھر 'ساؤتھ آل' پہنچے اور یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر

ایرپورٹ پر وارد ہوئے، ہتھرو ایرپورٹ ایسا لگتا ہے جیسے ایک بہت بڑا مارکٹ ہو، ایرپورٹ کی عمارت کے اندونی حصہ میں ساری ضروریاتِ زندگی دستیاب ہیں، مولانا محمد فاروق صاحب نے اپنی محبت میں فرمایا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا آپ کل ہی آئے تھے، اس پورے سفر میں مولانا محمد فاروق ملا اور ان کے رفقاء مولانا محمد ہاشم لمبادا اور ان کے صاحبزادگان مولوی محمد الیاس اور مولوی محمد قاسم (جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں تخصص فی الفقہ کر چکے ہیں) نے جس محبت اور لطف وعنایت کا معاملہ کیا اور اس پورے عرصہ میں اپنے تمام کاموں کو چھوڑ کر میرے ساتھ ساتھ رہے اور ہر طرح کی سہولت اور آسانی پہنچاتے رہے، الفاظ کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ ان سبھی دوستوں کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، کہ ان کی یہ محبت یقیناً ''حب فی اللہ'' میں داخل ہے۔

راقم سطور نے برطانیہ کے مختلف شہروں اور مختلف اجتماعات میں علماء اور طلبہ کے خطاب میں ان باتوں پر خاص طور پر توجہ دلائی کہ علم وتحقیق کا ذوق زندہ ہونا چاہئے، اختلاف رائے کو برداشت کرنے اور مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کا احترام پیدا ہونا چاہئے، جو ہمارے سلفِ صالحین کا معمول تھا، نیز احکام دین کی تبلیغ وتلقین اور نقطۂ نظر کے اختلاف پر اظہار خیال میں احکام کے مدارج کو ملحوظ رکھنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ زیادہ اہم احکام کے بارے میں رویہ نرم ہو اور نسبتاً کم درجہ کے احکام کو زیادہ اہمیت دی جائے، کہ مدارجِ احکام کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے افراط وتفریط پیدا ہوتی ہے اور یہ اُمت میں انتشار اور بعض دفعہ دین سے نفرت اور بُعد کا سبب بن جاتا ہے۔

راقم الحروف نے اس بات پر بھی خصوصیت سے توجہ دلائی کہ کچھ اختلافات ان فرقوں اور گروہوں کی جانب سے ہیں، جو اسلام کے دائرہ میں ہیں اور دوسرا حملہ بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہے، خاص کر مستشرقین اور مغرب زدہ لوگوں کی طرف سے، اس وقت علماء کو اس بیرونی فتنہ کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، جیسا کہ امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ

عز الدین بن عبدالسلامؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ وغیرہ نے کیا، نیز موجودہ عہد میں اسلام کے خلاف ہونے والی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ علماء اسرارِ شریعت اور احکام دین کے عقلی پہلو کا مطالعہ کریں اور آج کے اُسلوبِ استدلال کے مطابق اسلام کی حقانیت وصداقت کو پوری دنیا پر واضح کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں، راقم الحروف نے یہ بھی عرض کیا کہ چوں کہ کائنات اور انسان کا خالق خدا ہے اور شریعت کے احکام بھی خدا کی طرف سے ہیں، اس لئے شریعت کا کوئی حکم فطرت کے خلاف نہیں ہوسکتا اور آج کی مشاہداتی سائنس میں اس کو ثابت کرنا زیادہ آسان ہے۔

عوام سے خطاب میں اس پہلو کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی گئی کہ اسلام نے پوری انسانیت کو وحدتِ آدمیت کے دھاگہ میں باندھا ہے، اس لئے انسانی رشتہ سے غیر مسلم بھی ہمارا بھائی ہے، وہ ہماری ہمدردی اور بہی خواہی کا مستحق ہے؛ اس لئے ہمیں بہتر برتاؤ کے ذریعہ غیر مسلم بھائیوں کے دل ودماغ کو فتح کرنا چاہئے، میں نے کہا کہ جیسے ماں باپ کی اپنی اولاد سے یک طرفہ محبت ہوتی ہے، اسی طرح داعی کو اپنے مدعو سے یک طرفہ محبت اور جذبۂ ہمدردی ہونا چاہئے، مسلمان اپنی منصبی حیثیت کے لحاظ سے داعی کے منصب پر فائز ہیں اور پوری انسانیت ان کے لئے مدعو ہے۔

اس بات کو دیکھ کر افسوس ہوا کہ جو اختلاف اور باہمی آویزشیں ہندوستان میں دیکھنے میں آتی ہیں، ہندو پاک سے جو لوگ گئے ہیں، وہ یہ سارے اختلافات کسی قدر شدت اور اضافہ کے ساتھ لے کر وہاں پہنچے ہیں، دیوبندی، بریلوی اور حنفی، غیر مقلد معرکہ آرائیاں وہاں بھی جاری ہیں، بلکہ خود ایک مکتبۂ فکر کے لوگوں کے درمیان بھی جماعتوں اور شیوخ کی نسبت سے آویزشیں اور کدورتیں محسوس ہوتی ہیں، جو لوگ ہندو پاک سے جا کر وہاں آباد ہوئے ہیں ان میں نہ صرف ملکوں کی بنیاد پر تعصب ہے، بلکہ صوبوں اور ایک صوبہ کے دو شہروں اور ضلعوں اور ایک ہی شہر سے متعلق ہوں تو برادریوں کا تعصب بھی فاصلوں کا سبب بنا ہوا ہے،

چاند اور اوقاتِ نماز کا مسئلہ ایسا ہوگیا ہے کہ باپ اور بیٹے کی عید اور بھائی بھائی کا رمضان ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اگر مسلمان اس طرح کے اختلافات کو بھلا کر اس ملک میں غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتے، تو کتنا مفید کام ہوتا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریز ایک سادہ لوح قوم ہے اور ان میں قبولیت کی صلاحیت بہت ہے، اگر دعوت کی نسبت سے ان پر تھوڑی بھی محنت کی جاتی، تو بہت آسانی سے اس ملک میں اشاعت اسلام کا کام ہوسکتا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس حقیر کو اپنے علم کے مطابق اس ملک میں دعوتِ دین کی سنجیدہ اور منصوبہ بند و پُر عزم کوشش کہیں نہیں نظر آئی ، ۷ جولائی کے بم دھما کہ کے بعد وہاں کے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں اور حکومت جو قانون لانا چاہتی ہے، وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کے لئے بہت ہی خطرناک ہے، لیکن باہمی آویزشوں کی وجہ سے اس کے تدارک کے لئے کوئی اجتماعی اور مشترکہ کوشش نظر نہیں آئی ، میں نے ان دوستوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ جیسے ہندوستان میں ’ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ‘ نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ پر جمع کر دیا ہے، اس طرح کا پلیٹ فارم مسلمانانِ برطانیہ کو قائم کرنا چاہئے اور مشترک مسائل میں متحدہ موقف اختیار کرنا چاہئے۔

دو باتیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ، ایک تو مکاتب کا نظام ، خاص کر جہاں گجراتی نژاد مسلمان آباد ہیں، وہاں مکاتب کا بڑا بہتر نظام ہے، اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے لئے بارہویں جماعت تک کا مکاتب کا نصاب ہے ، اور اس نصاب کو بڑے اہتمام کے ساتھ والدین اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں ، مقامی مسجد میں اس کا انتظام ہوتا ہے اور اس کی باضابطہ درسگاہیں ہوتی ہیں، بعض مکاتب میں تو کئی کئی ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں، بہت سے طلبہ ان مکاتب میں حفظ قرآن مجید کی تکمیل کر لیتے ہیں ، واقعہ ہے کہ گجراتی مسلمانوں کا یہ نظام ایک آئیڈیل نظام ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ ہر علاقہ میں اس نظام کو رائج کریں۔

دوسری بات جسے دیکھ کر مسرت ہوئی وہ برطانیہ میں اُردو زبان کا رواج ہے، میں جس

دن پہنچا، اگلی صبح ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کے لئے اخبار لے کر آیا ہوں، میں نے سوچا کہ کوئی انگریزی اخبار لائیں گے اور میں بہ تکلف ان کی سرخیاں ہی پڑھ پاؤں گا، تھوڑی دیر میں جب وہ آئے تو دیکھا کہ ہاتھ میں روزنامہ جنگ ہے اور اڈیشن لندن کا ہے، ۱۶صفحہ کا اخبار جس میں ۱۲صفحات اُردو میں اور ۴صفحات انگریزی میں، میرے لئے یہ بات بہت ہی باعثِ حیرت تھی، لوگوں نے بتایا کہ یہاں سے ۵ اُردو اخبارات چھپتے ہیں: جنگ، اوصاف، نوائے وقت، نیشن، اور ایک اور اخبار، نیشن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ خاص کر لندن سے نکلتا ہے، گو ان اخبارات میں پاکستان کی خبریں غالب ہوتی ہیں، لیکن برطانیہ اور یورپ کی خبریں بھی اچھی خاصی ہوتی ہیں، جنگ میں خصوصاً اور دوسرے اخبارات میں عموماً اچھے کالم نویس ہیں اور ان کے سیاسی تجزیے بہت وقیع ہوتے ہیں، بعض بازاروں میں میں نے دیکھا کہ سائن بورڈ بھی اُردو کے ہیں، اسی طرح حکومت کی طرف سے خاص مقامات پر جو ہدایات ہوتی ہیں، ان میں بھی انگریزی کے علاوہ فرنچ، اُردو اور چائنیز زبان میں اور کہیں عربی میں بھی ہدایات موجود ہوتی ہیں، یہاں سے دو تین عربی اخبارات بھی نکلتے ہیں، ایک بنگالی اور چائنیز زبان میں نکلتا ہے، اُردو رسائل اور کتابیں بھی طبع ہوتی ہیں، اسی لئے یہاں بک اسٹالوں پر اُردو کی کتابیں بھی کثرت سے نظر آتی ہیں اور بعض انگریز بھی ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عام طور پر لوگ مسلمانوں کو یا مشرقی قوموں کو ''قدامت پرست'' کہتے ہیں، مغربی ممالک اس پہلو سے تو قدامت پرستی سے آزاد ہوگئے ہیں کہ انھوں نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا ہے اور مذہب بیزاری مغربی سماج کے رگ و ریشہ میں رچ بس گئی ہے، لیکن تہذیبی اعتبار سے جتنی قدامت پرستی مغرب میں ہے شاید ہی کسی قوم میں ہو، انھوں نے اپنے طرزِ تعمیر کو آج تک جوں کا توں بچا کر رکھنے کی کوششوں کی ہے اور انھیں اس پر بہت ناز بھی ہے۔

مذہب سے آزادی کے نتیجہ میں لذت کوشی ان کے اندر اپنی انتہا پر ہے اور اس سلسلہ

میں وہ کھلے عام قانون فطرت سے بغاوت پر کمر بستہ ہیں، اس لئے مردوں کے مردوں سے اور عورتوں کے عورتوں سے نکاح کو قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے، شرحِ نکاح کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، لوگ نکاح کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے ہیں، شرح پیدائش بھی بہ مقابلہ شرحِ اموات کے ایک تہائی رہ گئی ہے اور اس میں بھی زیادہ شرح پیدائش تارکین وطن کے یہاں ہے، شرحِ پیدائش کے کم ہونے کا سبب یہی ہے کہ ایک تو بچوں کو لوگ اپنی عیش پرستی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، دوسرے مرد وعورت کے تعلق میں جو خودغرضی کا رجحان ہے اس کی وجہ سے انھیں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا اور دونوں کو ایک دوسرے سے خطرہ رہتا ہے کہ نہ جانے کب وہ ساتھ چھوڑ دے، ایسی صورت میں بچوں کی پرورش دشوار ہو جاتی ہے؛ اس لئے لوگ پہلے ہی سے ایک دو سے زیادہ بچہ کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، چنانچہ وہاں پارکوں اور تفریح گاہوں میں بچے بہت کم نظر آتے ہیں، نوجوانوں کی جگہ کلب اور شراب خانے ہیں، زیادہ تر بوڑھے لوگ لاٹھیوں کے سہارے ان مقامات پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں، عورتیں عام طور پر ملازمت کرتی ہیں؛ لیکن ایشیاء کی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے بارے میں ایثار اور بے غرضی کا جذبہ نہیں رکھتے، عورتوں کی آزادی کے نام پر عورتوں کا جس قدر استحصال ہوتا ہے، وہ بہت ہی افسوس ناک ہے، مردوں کا لباس ایڑیوں کو چھوتا ہوا ہوتا ہے اور عورتیں ایسے لباس پہنتی ہیں کہ گویا یہ لباس ان کے لئے ایک بوجھ ہو، علامہ اقبالؒ نے کہا ہے :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ہندوستان میں تو اس کا تجربہ ہوتا ہی رہتا ہے، یورپ میں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی کہ عقیدۂ توحید سے محروم ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں بھی توہم پرستی بہت زیادہ ہے، بلی کے سامنے سے گذرنے کو وہ بھی منحوس اور بدفالی سمجھتے ہیں اور ۱۳ کا عدد استعمال کرنے سے بچتے

ہیں، چنانچہ وہاں کے اُردو اخبارات میں تقریباً نصف صفحہ عاملوں سے متعلق اشتہارات سے بھرا رہتا ہے، اس میں مسلمان عاملوں کا بھی ذکر ہوتا ہے اور ہندوؤں کا بھی اور ایک سے ایک دعوے لکھے ہوتے ہیں، اس لئے حقیقت یہی ہے کہ کوئی قوم چاہے تعلیم یافتہ اور معاشی اور صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہو، اگر اس کے اندر عقیدۂ توحید نہ ہو تو توہم پرستی سے آزاد نہیں رہ سکتی، یہ بات پوری طرح انگریزوں پر بھی صادق آتی ہے۔

اس وقت عالم اسلام پر امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے جو یورش ہورہی ہے، یہ سمجھنا کہ پوری انگریز قوم اس میں شریک ہے، خلافِ حقیقت ہوگا، انگریزوں میں ایک بہت بڑی تعداد انصاف پسند لوگوں کی بھی ہے، وہ اس جنگ کے خلاف ہیں، برطانیہ میں اپنی تاریخ کی سب سے بڑی احتجاجی ریالی عراق جنگ کے خلاف ہی منعقد ہوئی ہے، سیاسی پارٹیوں کے بہت سے قائدین کے بیانات وزیر اعظم ٹونی بلیر کے خلاف آئے ہیں، پھر جولائی کے بم دھماکہ کے واقعہ کے بعد برطانیہ جو قانون لانا چاہ رہا ہے، انسانی حقوق کی تنظیمیں شدت سے ان کی مخالفت کررہی ہیں، یہاں اس بات کا تذکرہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ برطانیہ میں احتجاج کے لئے ایک خاص جگہ مقرر ہے، وہیں احتجاج کیا جاتا ہے، برصغیر کی طرح عام راستے بند نہیں کئے جاتے اور لوگوں کو دشواری نہیں ہوتی، زیادہ تر علامتی احتجاج ہوتا ہے، یہاں ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں ہر شخص کو سب کچھ کہنے کی اجازت ہے، یہاں تک کہ اگر وہ چاہے تو کسی کو نام لے کر گالی دے اور اس کے بارے میں مغلظات بکے۔

ان کی بعض اخلاقی خوبیاں بڑی ہی قابل تعریف ہیں، جیسے جھوٹ نہ بولنا، دھوکہ نہ دینا، نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا، اُصول وضوابط کی رعایت کرنا، شاید و باید یہاں کوئی ٹریفک اُصول کی خلاف ورزی کرتا ہے، چاہے رات کا سناٹا ہو، لیکن جب تک اپنی باری نہ آجائے گاڑی آگے نہیں بڑھاتے ہیں، ہارن غیر معمولی حالات میں ہی بجائے جاتے ہیں، اس لئے راستہ میں شور و ہنگامہ نہیں ہوتا، پیدل راہرؤوں کی خاص رعایت کی جاتی ہے، بوڑھے اور معذور لوگوں کا

خیال رکھا جاتا ہے، ہر شخص مسکرا کر اور اکرام کے ساتھ ملتا ہے، ٹرینوں اور بسوں میں ہر شخص لائن لگا کر اپنی باری میں چڑھتا ہے، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، ان اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے برطانوی معاشرہ ایک پرامن اور محفوظ معاشرہ ہے۔

حکومت لوگوں کو سہولت پہنچانے کی پوری پوری کوشش کرتی ہے، راستوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے مفت فون کی سہولت ہے، جس سے پولیس کو فون کیا جاسکتا ہے، اگر کوئی حادثہ ہو تو پولیس فوراً ایمبولینس کے ساتھ پہنچ جاتی ہے اور دور دراز مقام ہو تو 'ایمبولینس ہیلی کاپٹر' استعمال کرتی ہے، انسانی جان کا بڑا احترام ہے، معلوم ہوا کہ ایک بچہ پائپ میں گر گیا تو بڑی دشواریوں سے اسے نکالا گیا اور جب بچہ زندہ نکل آیا تو اس کی خوشی میں پورے ملک میں ایک روز کی تعطیل دے دی گئی۔

اس ملک میں بھی سرکاری ٹیکس اچھا خاصا عائد ہوتا ہے، لیکن اس ٹیکس کا نفع عوام کی طرف لوٹتا بھی ہے، اس لئے ٹیکس چوری کرنے کا عام مزاج نہیں پایا جاتا، اگر وہ کسی آفس میں ملازمت کرتے ہوں اور ان کی تنخواہ گورنمنٹ کے مقررہ معیار سے کم ہو، تو حکومت اس کمی کی تلافی کرتی ہے، جن لوگوں کے پاس رہنے کو مکان نہ ہو، ان کے لئے مکان فراہم کرتی ہے، بوڑھے، ضعیف اور بیمار لوگوں کے لئے خدمت کا بھی نظم کیا جاتا ہے، یہ اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ مغرب میں خاندانی نظام کے بکھر جانے کی وجہ سے والدین اور اولاد کے درمیان خدمت اور تعاون کا جو مزاج ہونا چاہئے وہ مفقود ہے، والدین یا تو تنہا اپنے مکان میں رہتے ہیں یا اولڈ ہاسٹل میں، سال میں ایک دن 'پیرنٹس ڈے' ہوتا ہے، اس روز بچے ملاقات کے لئے آجاتے ہیں، اگر کسی کے بچے ہفتہ اور مہینے میں ایک دن آکر مل لیں، تو والدین اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتے ہیں، والدین اپنی جوانی میں بچوں کو اپنے آپ سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور جب بچے جوان ہوتے ہیں، تو وہ والدین کو اپنی خوش عیشی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، اس لئے ان سے دامن بچاتے ہیں، یہ وہ صورتِ حال ہے جس کو دیکھ کر اسلام کے خاندانی نظام کی رحمت کا پہلو

خاص طور پر سامنے آتا ہے، اس لئے سوشل سیکوریٹی مغربی معاشرہ میں ایک بہت بڑی ضرورت ہے، ہماری حکومتیں بھی ٹیکس اسی قدر وصول کرتی ہیں اور قدرتی وسائل ہمارے یہاں برطانیہ سے زیادہ ہیں، لیکن عوام کی فلاح کے لئے بہت کم کام کئے جاتے ہیں، اس لئے ہمارے یہاں گداگروں، معذوروں اور بھیک مانگتے ہوئے بیماروں اور فٹ پاتھ پر سونے والے کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے، کاش! ایشیاء کی حکومتیں ان معاملات میں مغرب کی تقلید کریں۔

برطانیہ کے اس سفر میں کئی اہم شرعی مسائل بھی لوگوں نے پیش کئے، ان کا تذکرہ بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا، رؤیتِ ہلال اور اوقاتِ نماز کا مسئلہ وہاں بہت معرکۃ الآراء بنا ہوا ہے، ایک گروہ سعودی عرب کی رؤیت پر اعتماد کرتے ہوئے رمضان اور عید وغیرہ کرتا ہے اور ایک گروہ برطانیہ سے قریب ترین مسلم ملک مراکش کی رؤیت کا اعتبار کرتا ہے، اسی طرح برطانیہ میں بعض ایام ایسے آتے ہیں جب رات محض ۳-۴ گھنٹوں کی ہوتی ہے، اس میں مغرب، عشاء اور فجر ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت میں عشاء کی نماز کب ادا کی جائے اور فجر کی کب؟ اس میں بھی اختلاف ہے، کیوں کہ بعض اوقات شفق ڈوبتا ہی نہیں ہے، میں ان مسائل کے بارے میں اظہارِ خیال سے گریز کرتا رہا اور کہا کہ اس سلسلہ میں مقامی علماء کرام اجتماعی طور پر کوئی بات طے کرلیں، تاکہ عام مسلمان انتشار کا شکار نہ ہوں، البتہ اگر ان مسائل کو طے کرنے میں ہند و پاک کے علماء کا تعاون مطلوب ہو تو ان سے مدد لی جاسکتی ہے اور ایسی نشست میں ان کو مدعو کیا جاسکتا ہے، بعض علماء نے کہا کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی ان مسائل کے بارے میں یہی بات کہی تھی اور اپنی رائے دینے سے احتراز کیا تھا۔

ایک اہم مسئلہ وہاں عدالت کے ذریعہ طلاق کا ہے، راقم الحروف کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر مرد نے طلاق کی درخواست دی ہو اور عدالت نے طلاق کا فیصلہ کیا ہو تو شرعاً بھی عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی، کیوں کہ عدالت کی حیثیت مرد کی جانب سے طلاق کے وکیل کی ہوگی اور اگر عورت نے طلاق کی درخواست دی، عدالت نے شوہر کو طلب کیا، وہ حاضر

ہوا اور شوہر نے عدالت کو یہ بات لکھ کر دی کہ وہ اس مطالبہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہے، یا یہ کہ عدالت جو مناسب سمجھے فیصلہ کردے، تب بھی سمجھا جائے گا کہ مرد نے عدالت کو طلاق کا وکیل بنایا ہے، لہٰذا شرعاً طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر مرد نے طلاق دینے سے انکار کیا، یا وہ حاضر نہیں ہوا اور یک طرفہ طور پر فیصلہ ہوا تو شرعاً یہ طلاق واقع نہیں ہوئی، ایک سوال یہ بھی تھا کہ عدالت طلاق کا فیصلہ کرنے کے بعد بھی چھ ماہ کی مدت رکھتی ہے کہ اس میں فریقین صلح کی کوشش کریں، اگر اس میں صلح نہیں ہوسکتی تب عدالت طلاق کو نافذ کرتی ہے، اس سلسلہ میں عرض کیا گیا کہ جس تاریخ سے عدالت طلاق کو نافذ کرے، اس تاریخ سے وقوعِ طلاق سمجھا جائے گا۔

اسی طرح بوسیدہ قرآن مجید، مریض کا آپریشن کرنے کی وجہ سے ڈاکٹر کے لئے جمع بین الصلوٰتین، ہیلتھ انشورنس، ایسی دکانوں کی ملازمت جس میں حلال وحرام دونوں طرح کی اشیاء بکتی ہیں، چہرہ کا پردہ، خواتین سے مصافحہ، غیر مسلموں سے نکاح، عمارتوں میں مسجدیں، ڈیجیٹل قرآن وغیرہ بہت سے مسائل دریافت کئے گئے۔

بحیثیت مجموعی اس حقیر کا احساس ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں میں دعوتی روح بیدار کرنا اور علماء کے اندر باہمی اختلافات کے بجائے اسلام کے خلاف ہونے والی فکری یورشوں کا علمی وقلمی سطح پر مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا بہت ہی ضروری ہے، ورنہ اس ملک میں آباد مسلمانوں کی آئندہ نسلیں دین سے بے گانہ ہوتی چلی جائیں گی اور مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت دشوار ہو جائے گی۔

❑ ❑ ❑ ❑

فردوسِ ارضی میں چند دن

اگر پوچھا جائے کہ جغرافیائی اعتبار سے کون سا علاقہ ہندوستان کا تاج ہے؟ تو یقیناً اس کا جواب ہوگا ''کشمیر''، جو ہندوستان کی سب سے اونچی ریاست ہے اور اپنے حسن و جمال، قدرتی مناظر اور خوش گوار فضا کے اعتبار سے خوابوں کی زمین ہے، عرفی کا شعر قدرتی حسن کے شاہکار اس خطہ کے لئے مشہور ہے :

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس خطہ کو عہد قدیم سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی اس خطہ کی بڑی اہمیت تھی، ابوریحان بیرونی (متوفی: ۴۴۰ھ) محمود غزنوی کے ساتھ کشمیر آچکا ہے، اس نے اپنی معروف کتاب 'تحقیق مافی الہند' میں لکھا ہے کہ پورے ہندوستان میں علم کے دو اہم مراکز ہیں، کشمیر اور بنارس، کشمیر مختلف مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے، ہندو مذہب ایک زمانے میں اس پورے خطے کا مذہب تھا، اسی لئے کشمیر سنسکرت زبان کا بھی بڑا اہم مرکز رہا ہے، پھر یہاں تبت اور چین کی طرف سے بودھ بھی آئے اور اس مذہب کو بھی یہاں مقبولیت حاصل رہی، جس کی بقیات لداخ کے علاقہ میں ابھی تک موجود ہیں۔

چودہویں صدی عیسوی میں اس وقت یہاں اسلام کا سورج طلوع ہوا، جب یہاں کے ایک راجہ نے ایک نو وارد شخص سید شرف الدین شاہ بلبلؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنا نام صدر الدین رکھا، صدر الدین نے قبول اسلام کے بعد چار سال حکومت کی، اس کی وفات کے بعد کچھ طوائف الملوکی پیدا ہوئی اور بالآخر صدر الدین کی فوج میں شامل سرحد کے علاقہ

کے ایک مسلمان شاہ مرزا نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی اور سلطان شمس الدین کے نام سے بادشاہ بنا، گو اس کی وفات تین ہی سال میں ہوگئی، لیکن اس کی اولاد میں ڈھائی سو سال تک حکومت باقی رہی، اس دور کو 'شاہ میری' دور کہا جاتا ہے، جس میں سلطان شہاب الدین، سلطان قطب الدین، سلطان زین العابدین اور سلطان سکندر جیسے عظیم سلاطین پیدا ہوئے، سلطان قطب الدین کے عہد میں دعوتی مقصد سے سید میر علی ہمدانیؒ ایران سے یہاں تشریف لائے اور سولہ سال یعنی ۱۳۷۳ء سے ۱۳۸۹ء تک کشمیر میں مؤثر دعوتی خدمت انجام دی، انھوں نے حکومت سے تصادم مول لینے کے بجائے حکومت کے ساتھ تعاون کا راستہ اختیار کیا، سلطان قطب الدین ان کا گہرا معتقد ہوگیا، بادشاہ کی دین سے بے خبری کا حال یہ تھا کہ دو سگی بہنیں اس کے نکاح میں تھیں، شیخ کے حکم سے اس نے فوراً ہی ایک کو طلاق دے دی، شیخ کی تعلیمات کے اثر سے بعد میں جو حکمراں آئے، ان میں بڑے دین دار لوگ تھے، شاہ میری دور میں بہت سے اسلامی مدارس قائم ہوئے، مسجدیں تعمیر ہوئیں، ایران وعراق کے علاقہ سے بڑے بڑے علماء یہاں آئے، کتب خانے بنائے گئے، یہی اسلامی اعتبار سے کشمیر کا سب سے سنہرا دور تھا، پھر ایک اچھا خاصا دور شیعوں کا گزرا، جنھوں نے اہل سنت والجماعت پر عرصۂ حیات تنگ کر کے رکھ دیا، صحابہ کی شان میں کھلے عام تبراء ہونے لگا، قاضی موسیٰ کو صرف اس لئے نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا کہ انھوں نے اذان میں ''**أشهد أن علياً ولي الله**'' اور ''**حي على الصلوٰة**'' کی بجائے ''**حي على خير العمل**'' کے جائز ہونے کا فتویٰ نہیں دیا۔

اس کے بعد مغلوں نے حملہ کیا اور ۹۹۴ھ میں شیعہ حکومت اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئی، یہ زمانہ مغل باشاہ اکبر کا تھا، گویا یہ پہلا موقع تھا، جب کشمیر دہلی کی عمل داری میں آیا، مغلوں اور خاص کر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں یہاں بڑے پیمانے پر علمی اور ثقافتی خدمات انجام پائیں اور مدارس اور خانقاہوں نے اس پورے خطہ کو علم وعمل کی روشنی سے ضیا بار کر دیا، یہاں

تک کہ افغان کی طرف سے ایک بلائے بے درماں بن کر احمد شاہ ابدالی کشمیر میں داخل ہوئے، یہ ۱۷۵۲ء کی بات ہے اور اپنے مزاج کے مطابق پورے کشمیر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا، بہت سے ممتاز علماء کشمیر سے ہجرت کر گئے، یہاں تک کہ احمد شاہ ابدالی کی موت کے بعد افغانیوں کی حکومت کمزور ہوگئی اور سکھ جو پہلے سے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کر چکے تھے، نے والیٔ کشمیر جبار خاں کو شکست فاش دے کر کشمیر پر قبضہ کر لیا، سکھوں نے مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے اور ان کا جینا دوبھر کر دیا، یہ ظلم رنجیت سنگھ کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا، چنانچہ ایک کشمیری شاعر کہتا ہے :

جرمِ ما مارا چو دامن گیر شد
قوم سنگاں وارِدِ کشمیر شد

یعنی ہماری پاداش عمل میں سکھ قوم کشمیر پہنچی، ۱۸۲۸ء سے ۱۸۴۲ء تک ۲۷ سال ظلم کے ننگے ناچ کے بعد جموں سے ڈوگرا نامی ایک ہندو قبیلہ برسر اقتدار آیا، انگریزوں نے محض پچیس ہزار روپئے میں کشمیر جیسی ریاست ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کر دی، اس معاہدہ میں ریاست کی زمین کے ساتھ ساتھ اس کے تمام اسباب اور باشندگان کو بھی شامل رکھا گیا تھا، گویا یہ سب کے سب فروخت کر دیئے گئے، اقبال نے اپنے اشعار میں بھی اس ارزاں فروشی کا شکوہ کیا ہے، اور ۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اس قبیلہ نے یہاں حکومت کی، سکھوں اور ڈوگروں کا دور اس ریاست کے علمی اور ثقافتی زوال کا دور رہا ہے، یہاں تک کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد کشمیر کا آدھا حصہ پاکستان کے قبضہ میں چلا گیا اور آدھا حصہ اس وقت ہندوستان میں ہے۔

کشمیر میں بڑی اہم علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، خاص کر فن حدیث میں اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے، یہیں کے علماء میں علامہ داؤد مشکوتی ہیں جو 'مشکوٰۃ المصابیح' کے حافظ تھے، مولانا محمد سعید کندسو (متوفی: ۱۲۰۸ھ) ہیں، جنھیں پوری بخاری شریف حفظ تھی، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے ممتاز تلامذہ اس سرزمین کی رونق رہے ہیں،

ماضیٔ قریب میں بھی بڑے بڑے علماء کشمیر سے پیدا ہوئے ہیں، مولانا رشید الدین دہلوی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ اصل میں کشمیری ہی تھے، علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر اور علامہ سید انور شاہ کشمیری جیسے محدث اسی سرزمین کی دین ہیں، یہاں کئی ممتاز اور معروف شیعہ علماء اور مصنفین بھی پیدا ہوئے، مگر افسوس کہ ادھر عرصہ سے غالباً کشمیر کے خصوصی حالات نے کشمیر کی شب کو صبح نا آشنا کر کے رکھ دیا ہے۔

ان نسبتوں کی وجہ سے عرصہ سے سیر کشمیر کی خواہش دل میں مچلتی تھی، ایک بار پندرہ، بیس سال پہلے اپنے بعض احباب کے اصرار پر، بلکہ ان ہی کی معیت میں کشمیر جانے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن یہ ایک نا تمام سفر تھا، جس نے تشنگی بجھانے کے بجائے اس میں اور اضافہ ہی کر دیا۔

ادھر کچھ عرصہ سے معروف داعی اور میرے خاص کرم فرما جناب مولانا محمد کلیم صدیقی (پھلت) نے کئی بار مجھ سے کشمیر کے سفر کے بارے میں اصرار کی حد تک تقاضہ کیا، لیکن کچھ اپنی مصروفیات اور کچھ وہاں کے حالات کی وجہ سے میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا، آخر ایک دن ان کا ٹیلیفون آیا، جس میں انھوں نے ازراہ مذاق کہا کہ لوگوں نے یہاں مجھے کمرے میں بند کر رکھا ہے کہ آپ کے سفر کی بات طے کرادوں، جب ہی وہ مجھے چھوڑیں گے، ان کے اس لطیف اور ظرافت آمیز حسنِ طلب نے مجبور کر دیا اور میں نے سفر کی تاریخیں متعین کر دیں، جناب محمد طارق (مالک طارق ٹکسٹائل فرم)، مولانا عدنان احمد ندوی اور شعبہ اسلامک اسٹڈیز کشمیر یونیور سٹی کی طرف سے یہ مشترک دعوت تھی، چنانچہ یہ حقیر دہلی ہوتا ہوا ۲۶ جون کو جیٹ ایرویز کے ذریعہ سری نگر پہنچا، میرا لڑکا ظفر عابدین بھی میرے ساتھ تھا، ایرپورٹ پر مولانا عبداللہ ندوی، مولانا بلال ندوی اور عزیزی مولوی نیاز احمد سلمہ موجود تھے، جہاز جوں ہی کشمیر کے قریب پہنچا، برف کے سفید دوپٹے اوڑھے ہوئے پہاڑ دور سے دعوت نظارہ دے رہے تھے، برف پوش پہاڑی چوٹیوں کے نشیب میں ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ اور جا بجا مچلتی ہوئی ندیاں ایک خاص لطف پیدا کر رہی تھیں، جیسے جیسے سرینگر اور اس کا ایرپورٹ قریب آتا گیا، ویسے ویسے اس

میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ ہم لوگ سرینگر ایرپورٹ پر اُتر رہے تھے، یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ شہر ریاستی راجدھانی ہے اور سیاحتی اعتبار سے اسے عالمی اہمیت حاصل ہے، لیکن ایر پورٹ بہت چھوٹا ہے، اتنا چھوٹا کہ متوسط ریلوے جنکشن بھی اس سے بڑا ہوتا ہے، عمارتیں بھی عصری معیار سے کمتر درجہ کی ہیں اور رن وے اتنا چھوٹا ہے کہ بمشکل پانچ چھ جہاز ہی اُتر سکیں، جہاز سے اُترنے کے بعد بیرونی گیٹ تک پہنچانے کے لئے کسی بس تک کا بھی انتظام نہیں اور لطف یہ ہے کہ کھلے میدان میں دور تک خود ہی چلنا پڑتا ہے اور ٹرالی بھی ایک اچھے خاصے فاصلے کے بعد مہیا ہوتی ہے، پھر قدم قدم پر پولیس کی چیکنگ ایسا دردسر ہے جو نو واردوں کو دہشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ایر پورٹ پر مختلف حصوں میں بڑے چھوٹے بینکر بنے ہوئے ہیں اور اس پر مٹی اور گھاس اس طرح اُگائی گئی ہے کہ اوپر سے اندازہ نہ ہو، یہ غالباً کشمیر کے خصوصی حالات میں دفاعی مقصد کے تحت تیار کئے گئے ہیں، اللہ اللہ کر کے باہر نکلے اور اپنے مخلص اور کرم فرما میزبان کے ساتھ جناب طارق صاحب کے گھر کے لئے روانہ ہوئے، راستہ میں جگہ جگہ سڑک کے دائیں بائیں فوج کے جوان بندوقیں تانے ہوئے کھڑے ہیں، کہیں کہیں آدھی سڑک تھوڑے فاصلوں پر مختلف سمتوں سے چن دی گئی ہیں یا رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں، تاکہ کوئی گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ چکمہ دیکر نکل نہ سکے، بعض حساس مقامات پر ریت کی بوریوں کے ذریعہ بینکر بنائے گئے ہیں جن میں اوپر سے آہنی چادر کی عارضی چھت تو ہے ہی، ساتھ ساتھ دیوار سے چھت تک لوہے کی دبیز جالیاں بھی ہیں، معلوم ہوا کہ یہ جالیاں دستی بموں کو روکنے کے لئے ہیں، ایسے مقامات پر فوجی مشین گنوں سے بھی مسلح ہیں، یہ مناظر نئے آنے والوں کے لئے ایسے خوفناک اور کڑوے ہیں، جو سیر کشمیر کی حلاوتوں اور لذتوں کو بعض اوقات بے معنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ایک دو مقام پر چیکنگ ہوئی اور ہم لوگ سرینگر کے نئے شہر سے گذرتے ہوئے

''صورہ'' نامی معروف اور قدیم آبادی میں پہنچے، یہ بہت اچھی آبادی ہے اور غالبًا اس علاقہ میں اہل ثروت لوگوں کا قیام ہے، جناب طارق ہم لوگوں کے انتظار میں گھر پر موجود تھے، بڑے تپاک اور محبت سے ملے، مولانا عدنان احمد ندوی جو وقت پر ایرپورٹ نہیں پہنچ پائے تھے اور ہم لوگوں کی گاڑی دیکھ کر واپس آرہے تھے، وہ بھی پہنچ گئے، ان کے خلوص اور تواضع وانکساری نے پہلی ہی ملاقات میں گویا اجنبیت کے سارے حجاب اُٹھا دیئے، طارق صاحب کا مکان نہایت خوبصورت، نیا اور نئی سہولتوں سے آراستہ اور کشمیری فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے، جہاں فرش پر خوبصورت سنگ مرمر اور اس پر دیدہ زیب قالینیں قلب ونظر کو کھینچتی ہیں، وہیں دیواروں پر خوبصورت اور خوش رنگ لکڑیوں کا سرتاپا غلاف اور چوبی اور کامدار چھت دیدۂ دل کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے، مکان کے باہر کشمیر کی روایت کے مطابق وسیع سبزہ زار ہے، انھیں کے گھر پانچ دنوں تک قیام رہا اور جناب طارق صاحب اور ان کے متعلقین بالخصوص ان کے صاحبزادے مولوی نیاز احمد سلمہ متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے خدمت اور راحت رسانی کا حق ادا کردیا۔

مختلف اہل علم جو ایرپورٹ نہیں آپائے تھے، یہاں ملاقات کے لئے تشریف لائے، جن میں مولانا بشیر احمد قاسمی مہتمم دارالعلوم سوپور، مفتی مظفر قاسمی صدر مفتی، مولانا حمید اللہ لون جو مدرسہ سواء السبیل کھانڈی پورہ، اسلام آباد کے مہتمم اور حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب (جلال آباد) ومولانا ابرارالحق صاحب (ہردوئی) کے خلیفہ ہیں، نیز مدرسہ بلالیہ سرینگر کے مہتمم مفتی عبدالرشید مفتاحی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یہ سبھی حضرات وادی کشمیر کے نمائندہ علماء میں ہیں، ان بزرگوں اور دوستوں کے خلوص ومحبت اور غائبانہ تعارف کی بنا پر اس حقیر کے ساتھ ربط وتعلق نے بہت متاثر بھی کیا اور شرم سار بھی۔

عصر بعد مولانا عدنان احمد ندوی اور مولانا محمد بلال ندوی کے ساتھ تفریح کے لئے نکلے، عزیزی مولوی نیاز احمد سلمہ گاڑی ڈرائیو کرتے رہے، ہم لوگ سرینگر کی شہرہ آفاق ڈل جھیل کے عقبی حصہ سے گذرتے ہوئے سرسبز پہاڑی پر واقع پری محل پہنچے، یہ خاصی بلندی پر پتھر کی

سلوں کا بنا ہوا ایک پُرشکوہ اور قدیم قلعہ نما محل ہے، جہاں سے اس وسیع وعریض جھیل کے علاوہ سرینگر شہر کا اکثر حصہ نظر آتا ہے، یہ دراصل ایک بزرگ کی خانقاہ ہے، جو مغلیہ عہد میں تعمیر ہوئی ہے، یہاں سے اُتر کر ہم لوگ چشمہ شاہی پر پہنچے، یہ بھی پہاڑی پر واقع ہے، اور ایک محل نما عمارت ہے، یہاں پانی کا ایک چشمہ جاری ہے جو پہاڑ سے برف پگھل پگھل کر آتا ہے، یہاں اس کی ایک پختہ نہر سی بنی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ چھوٹا سا پارک بھی ہے، حیرت انگیز طور پر اس کا پانی نہایت شیریں اور اسی قدر ٹھنڈا ہے، سیاح ڈبوں اور بوتلوں میں پانی بھر بھر کر محفوظ کررہے تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ پانی بے حد ہاضم ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے لئے روزانہ سرینگر سے پہلے اور آخری جہاز کے ذریعہ یہاں کا پانی بھیجا جاتا تھا اور اسے ہی وہ پیا کرتی تھیں۔

یہاں سے اُتر کر ہم لوگ جھیل کے کنارے آئے اور شکارے میں بیٹھ کر چار چناری تک پہنچے، یہ اس وسیع وعریض جھیل کے اندر گویا چھوٹا سا جزیرہ ہے، جس کے چاروں کونوں پر چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں، ان کے گھنے سایہ میں یہ پورا جزیرہ ڈھکا رہتا ہے، خشکی کے اس پورے حصہ پر دوبھیاں اس طرح ہیں کہ گویا سبز قالینیں بچھی ہوئی ہیں، یہیں ہم لوگوں نے مغرب کی نماز ادا کی اور اسی شکارہ سے کنارے تک واپس آئے، کشمیر کے یہ شکارے بھی مشہور ہیں اور ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں، مستطیل کشتی جس پر آگے کشتی کا ناخدا، اس سے متصل آرام دہ گدے بچھے ہوئے، جس پر دو آدمی بسہولت دراز ہو سکتے ہوں، سامنے اور پیچھے دو نفری سیٹیں، اس طرح ایک چھوٹا موٹا کنبہ بسہولت اس پر تفریح کا لطف اُٹھا سکتا ہے، ہم لوگ بھی آٹھ افراد تھے، جو اسی شکارہ کے کاندھوں پر سوار تھے، کنارے اُتر کر ڈل جھیل کی دوسری سمت سے نہرو پارک اور سرینگر کے مشہور لال چوک سے گذرتے ہوئے ہم اپنی منزل پر واپس پہنچے۔

۲۷ جون کی صبح ہم دار العلوم سوپور کی دعوت پر وہاں کے لئے روانہ ہوئے، سوپور سرینگر سے قریب ڈیڑھ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، سوپور کو ''ایپل ٹاؤن'' (شہرِ سیب) بھی کہا جاتا ہے،

یہاں کثرت سے سیب کے باغات ہیں، سیب کے گہرے سبز، کم قامت، چھتری نما درختوں کے جھنڈ بڑے خوشنما نظر آتے ہیں، اور طبیعت ان کی طرف کھنچتی ہے، سوپور ریاست کے حساس ترین شہروں میں ہے، اس لئے یہاں قدم قدم پر فوجیوں کی بہتات ہے، گذرنے والوں کو بار بار چیکنگ سے گذرنا پڑتا ہے، بکتر بند اور مشین گن بردار گاڑیوں کی دوڑ دھوپ ایک وحشت ناک منظر پیش کررہی تھی، ہم لوگ بازار سے گذرتے ہوئے دارالعلوم سوپور پہنچے، یہ ریاست کی سب سے قدیم دینی درسگاہ ہے، جس میں چار سو طلبہ مقیم ہیں، اس کی کئی شاخیں بھی سرگرم خدمت ہیں، یہاں مشکوٰۃ شریف تک تعلیم ہے، تربیت افتاء کا شعبہ بھی ہے اور دارالافتاء بھی ہے، دارالافتاء سے عملاً دارالقضاء کی خدمت بھی انجام دی جاتی ہے، مولانا بشیر احمد قاسمی صاحب فعال شخصیت کے مالک ہیں، وہ ناظم ہیں اور مولانا مظفر صدیقی مفتی، دارلعلوم کے اساتذہ کے ساتھ مختصر نشست ہوئی، پھر دارالعلوم کی مسجد میں اساتذہ وطلبہ کے اجتماع سے خطاب کا موقع ملا، راقم الحروف نے اپنے خطاب میں کہا کہ جن ابتلاؤں اور آزمائشوں سے آپ گذر رہے ہیں ان کی حیثیت طوفان کی ہے، جو آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں، آزمائشیں کتنی بھی سخت ہوں، ان کے زخم جلد مندمل ہوجائیں گے، لیکن فکری یلغار کا حملہ اور اس کا زخم کاری ہوتا ہے اور نسلوں تک اس کے اثرات باقی رہتے ہیں، علماء کا فریضہ اسی فکری یلغار کا مقابلہ کرنا ہے اور اس وقت جب کہ حالات کی ناہمواری سے فائدہ اُٹھا کر باطل تحریکیں یہاں سرگرم عمل ہوگئی ہیں، علماء کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔

۱۰ بجے سوپور کی بارکونسل میں خطاب اور سوال وجواب کی نشست رکھی گئی تھی، یہاں سو کے قریب وکلاء اور ججس موجود تھے، ان میں خواتین بھی تھیں، سینئر ایڈوکیٹ جناب سید شریف الدین صاحب اس پروگرام کے محرک تھے، راقم الحروف نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ غیر مسلم ممالک میں بھی مسلمانوں پر واجب ہے کہ پرسنل لاء کے مسائل میں وہ شریعت اسلامی کے متبع ہوں، —— خاص کر کشمیر جو ہندوستان کی واحد مسلم اکثریت ریاست ہے، —— میں مسلم

پرسنل لاء کا نافذ نہ ہونا اور میراث کے سلسلہ میں رواجی قانون پر عمل کیا جانا نہایت افسوس ناک ہے، قانون شریعت کی فطرت و مصلحت سے ہم آہنگی اور مختلف قوانین میں شریعت اسلامی سے خوشہ چینی کے پہلو کو بھی واضح کیا گیا اور مسلم پرسنل لاء کے نفاذ کے لئے کوشش کرنے کی ترغیب دی گئی، اس گفتگو کا اچھا اثر ہوا اور ان میں ایک تحریک پیدا ہوئی، انھوں نے خواہش کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا وفد کشمیر آئے، ہم لوگ ان کی ہدایات سے فائدہ اٹھا کر اس کوشش کو آگے بڑھائیں گے، خطاب کے بعد سوالات کئے گئے۔

آج ہی ۲ بجے دن سے کشمیر یونیورسٹی میں ''فقہ اسلامی پر تبدیلیِ حالات کے اثرات'' کے عنوان سے اس حقیر کا خطبہ رکھا گیا تھا، چنانچہ ہم لوگ سوپور سے سرینگر آئے اور سیدھے یونیور سٹی گئے، کشمیر یونیورسٹی اپنی بلڈنگ اور ماحول کی خوبصورتی کے اعتبار سے شاید ہندوستان کی تمام یونیورسیٹیوں پر فائق ہے، مرکزی عمارت علامہ اقبال لائبریری کی ہے، جو کئی منزلہ ہے، وسیع میدان، سبزہ زار اور سایہ دار درختوں کے درمیان یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی دیدہ زیب عمارتیں اس طرح تعمیر کی گئی ہیں کہ ہر عمارت کی بالائی چھت چھپر نما ہے اور چھپر کے سبز ٹائلس کی وجہ سے حسن کا مرقع ہے، یونیورسٹی کی ایک جانب 'نسیم باغ' ہے، جس میں لسانیات اور اسلامک اسٹڈیز وغیرہ کے شعبے قائم ہیں، صرف یہی ایک باغ چنار کے بارہ سو درختوں پر مشتمل ہے، چنار کا درخت اونچا بھی ہوتا ہے اور اس کی شاخیں بھی دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں، پتے بھی اتنے سبز کہ گویا نچوڑے جائیں تو سبز رنگ ٹپکنے لگے، شاخوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے یہ اپنے گھنے سایہ کے لئے مشہور ہیں، اس کی عمر صدیوں پر محیط ہوتی ہے، بلکہ بعض درخت ہزار سال سے بھی زیادہ عمر کے ہوتے ہیں، اسی نسبت سے اس کی لکڑی بھی بہت مضبوط، خوبصورت اور دیرپا ہوتی ہے، کشمیر میں مشہور ہے کہ چنار کی کاٹی ہوئی لکڑی سو سال بعد محسوس کرتی ہے کہ اسے کاٹ دیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ تمام درختوں کی بہ نسبت یہ زیادہ آکسیجن دیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ فضائی آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، کشمیر یونیورسٹی کا یہ

کیمپس جہاں اپنی جاذب نظر عمارتوں کے لئے مشہور ہے، وہیں چنار کے ان درختوں اور ان کے گھنیرے سایہ سے بھی اس کی شناخت ہے۔

علامہ اقبال لائبریری کے تہ خانہ میں وسیع آڈیٹوریم ہے، جس میں تقریباً پانچ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور پروگرام کے لئے مطلوبہ تمام سہولتیں اس میں مہیا ہیں، یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر معراج الدین پروگرام کی صدارت کر رہے تھے، تلاوت قرآن مجید اور اس کے انگریزی ترجمہ کے بعد ڈین آف اکنامکس ڈپارٹمنٹ نے افتتاحی کلمات کہے، وہ علماء سے شکوہ سنج تھے کہ انھوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا اور موجودہ دور کے مسائل اجتہاد کے بغیر حل نہیں ہو سکتے، انھوں نے جنیٹک سائنس سے جڑے ہوئے مسائل اور یوتھنیز یا وغیرہ کی نسبت سے کہا کہ علماء ان سے بے خبر ہیں، راقم سطور کو ان کی اس بے خبری پر افسوس ہوا کہ ان مسائل پر عالم اسلام کے علاوہ خود اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا انٹرنیشنل سیمینار کر چکی ہے، مگر دانش ور حضرات ان سب سے بے خبر ہیں، پھر ڈاکٹر محمد یونس گیلانی نے تعارفی کلمات کہے، انھوں نے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی کہ کون سے مسائل محل اجتہاد ہیں؟ اس سلسلہ میں انھوں نے ''اولیات عمر رضی اللہ عنہ'' کا بھی ذکر کیا، اکیڈمی کا بھرپور تعارف کرایا، اس سے فطری طور پر مجھے خوشی ہوئی، البتہ میرے بارے میں ان کے مبالغہ آمیز تعریفی کلمات نے شرمسار کیا، انھوں نے بھی بعض ایسے فروعی مسائل چھیڑ دیئے جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس کے بعد مجھے خطاب کی دعوت دی گئی، میں نے عرض کیا کہ کسی بھی قانون میں ثبات و تغیر دونوں مطلوب ہے، اگر بنیادی قوانین میں ثبوت و دوام نہ ہو تو وہ موم کی ناک بن کر رہ جائے گا اور اقامت عدل کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا، برسر اقتدار گروہ اسے حسب منشاء بناتا اور توڑتا رہے گا، اور تغیر نہ ہو تو جمود پیدا ہو جائے گا اور مختلف احوال کا ساتھ دینے کے لائق نہ رہے گا، پھر میں نے بتایا کہ شریعت کے کونسے قوانین ناقابل تبدیل ہیں اور کون قابل تبدیل؟ نیز جو قابل تبدیل ہیں ان میں کن عوامل کے تحت تغیر کی ضرورت پیش آتی ہے؟ اس

ذیل میں یہ بات بھی عرض کی گئی کہ کونسے مسائل محل اجتہاد ہیں؟ اور یہ کہ جب جس حد تک اجتہاد کی ضرورت تھی، علماء نے اجتہاد کیا ہے اور موجودہ دور میں صحیح طریقہ ''اجتماعی اجتہاد'' کا ہے، ڈیڑھ گھنٹہ اس حقیر کا خطبہ رہا، اس بات سے مسرت ہوئی کہ حاضرین نے غیر معمولی توجہ اور انہاک سے سنا اور بہت سے حضرات نے نوٹس بھی لئے، یہ خطبہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز اور شعبہ لاء کے اشتراک سے رکھا گیا تھا، اس لئے دونوں شعبوں کے اساتذہ، طلبہ وطالبات اور بعض دیگر اہل دانش نیز شہر سے آئے ہوئے کچھ علماء بھی شریک تھے، شرکاء میں ڈاکٹر جنید نسیم رفیع آبادی (جو مولانا تقی امینی کے شاگرد ہیں)، ڈاکٹر نذیر احمد زرگر، ڈاکٹر محمد شفیع اور ڈاکٹر نسیم شاہ (جو پروگرام کے اناؤنسر بھی تھے)، نیز ایشین اسٹڈیز کے ڈاکٹر کھا کی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، خطبہ کے بعد چائے پر بھی یونیورسٹی کے اساتذہ سے ملاقات اور گفتگو رہی۔

ہمارے میزبانوں نے آج ہی 'گل مرگ' کا بھی پروگرام بنایا تھا، چنانچہ یونیورسٹی سے سیدھے ہم لوگوں کا قافلہ جو دو گاڑیوں پر مشتمل تھا، گل مرگ کی سمت روانہ ہوگیا، راستہ میں 'برنگ' نامی مقام پر رکنا ہوا، جو شاہراہ عام سے کسی قدر ہٹ کر ہے، کچی پکی سڑکوں سے گذر کر ہم لوگ یہاں پہنچے، یہ واقعی بڑی خوبصورت جگہ ہے، ایک سمت برفیلی پہاڑی اور ان سے نکلتے ہوئے آبشار، جو زمین میں آکر صاف وشفاف نہر کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے، پانی نہایت میٹھا اور اسی قدر ٹھنڈا، پانی کی ان سبک خرام لہروں کی وجہ سے ایسی نغمگی پیدا ہورہی تھی کہ گویا قدرت نے آب رواں کے پاؤں میں پائل باندھ دیئے ہیں، ہم لوگ کچھ دیر اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے، پانی کی ٹھنڈک کی وجہ سے بہ تکلف وضو کیا گیا اور ایک طرف برف پوش اور دوسری طرف سے سبز پوش پہاڑیوں کے دامن میں دو بھی ہی پر نماز عصر ادا کی گئی، اس وقت علامہ اقبالؒ کے ان اشعار کی جیتی جاگتی تشریح کو کتابِ فطرت سے پڑھنے کا موقع ملا :

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر ! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

نماز کے بعد ہم لوگ آگے بڑھے، راستہ میں 'ٹنک برگ' سے گذرنا ہوا، یہاں بھی خوبصورت قدرتی مناظر دعوتِ نظارہ دیتے ہیں، ہم لوگ ایک جگہ تھوڑی دیر کے پھر گل مرگ کی اونچائی کی طرف روانہ ہوئے، گل مرگ پہنچے تو ابھی مغرب میں کچھ وقت باقی تھا، یہ بڑا حسین منظر ہے، دور دور تک سرسبز دوبھیوں سے ڈھکا ہوا میدان، گویا قدرت نے سبز قالین بچھادی ہے، چاروں طرف بلند قامت پہاڑ، ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر شیشہ کی طرح برف، جیسے کسی دلہن کی پیشانی پر افشاں چھڑک دیا گیا ہے، پھر زمین کے نشیبی حصہ سے لے کر چوٹی کے نیچے تک گہرے سبز دراز قامت درخت، ہاتھ باندھے ساکت وصامت کھڑے ہوئے، بل کھاتے ہوئے راستے اور پہاڑوں سے گرتی اور گنگناتی ہوئی لہریں، یہ سب مل کر خدا کی قدرت اور اس کی صناعی پر ایمان کی تازگی کا باعث بنتے ہیں، یہیں نماز ادا کی گئی اور ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی گئی، یہ ریسٹورنٹ بھی بہت خوبصورت اور واردین کی پارٹیوں کے لئے مختلف ہالوں پر مشتمل ہے، یہاں زیادہ تر غیر ملکی سیاح نظر آئے، یہاں کچھ دیر بیٹھے اور مختلف تعلیمی اور ملی مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا، ریسٹورنٹ ٹورزم ڈپارٹمنٹ کا تھا، مگر انچارج ایک شریف مسلمان تھا، وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔

کسی قدر تاخیر سے ہم لوگ یہاں سے واپس ہوئے، اور راستہ میں واقع ''النور ماڈل اسکول ماگام'' پہنچے، اس کے بانی مولانا محمد ارشد ندوی ہیں اور ان کے رفیق خاص مولانا ثناء اللہ قاسمی ہیں، اس میں انگلش میڈیم سے میٹرک تک تعلیم کا نظم ہے، اور یہ ایک اقامتی اسکول ہے، ۱۲۵ طلبہ اس وقت زیر تعلیم ہیں، اس کے قیام کا مقصد مسلمان بچوں کو مشنری اسکولوں سے

بچانا ہے، یوں تو اس کی عمارت چار منزلہ اور متوسط درجہ کی ہے اور خوبصورت لگتی ہے، لیکن اصل قابل تحسین بات یہ ہے کہ اس نے بہت اچھے نتائج دیئے ہیں، اور اب اس کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، تعلیم معیاری ہے اور ماحول ایک دینی درسگاہ کی طرح کا ہے، جناب نذیر احمد صاحب اس کے پرنسپل ہیں، یہ نہایت مذہبی شکل وصورت کے آدمی ہیں اور بہت گھنی اور لمبی داڑھی رکھتے ہیں، وہ عرصہ تک عیسائی مشنری اسکول ''میسکو'' میں پڑھا چکے ہیں، میں نے لوگوں کو کہا کہ ''نذیر'' صاحب ایک ''نظیر'' ہیں کہ صلاحیت اپنے آپ کو منوالیتی ہے اور مخالف ماحول میں بھی لوگوں کو قدر دانی پر مجبور کر دیتی ہے!

رات ہم لوگوں نے اسی اسکول میں گزاری، فجر بعد اسکول کے وسیع احاطہ میں چہل قدمی کا موقع ملا اور وہاں کے قدرتی ماحول کے ساتھ ساتھ صبح کی نشاط انگیز فضاء نے بہت شاد کام کیا، ناشتہ کے بعد اساتذہ اور طلبہ کی مختصر نشست ہوئی اور حسب موقع کچھ عرض کیا گیا، گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ سائنس ہمیں بتاتی ہیں کہ چیز کیا ہے؟ لیکن یہ چیز کیوں پیدا کی گئی؟ کن کاموں میں اس کا استعمال ہونا چاہئے اور کن میں نہیں؟ یہ ہمیں اسلام کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے دینی تعلیم کے بغیر عصری تعلیم نامکمل ہے، یہاں سے ہم لوگ سرینگر واپس ہوئے اور تھوڑی دیر جناب طارق صاحب کے مکان پر توقف کرتے ہوئے گورنمنٹ میڈیکل کالج گئے۔

اس کالج کا احاطہ بھی بہت کشادہ ہے اور اس کے ساتھ ایک بڑا سا ہاسپٹل بھی ہے، کالج کا آڈیٹوریم بالکل نیا تعمیر شدہ ہے، خوبصورت بھی ہے اور سہولتوں سے آراستہ بھی، تین بجے دن سے یہاں پروگرام کا آغاز ہوا، کالج کے پرنسپل جناب ڈاکٹر مشتاق احمد شاہ نے صدارت فرمائی، ڈاکٹر عبدالمجید نے افتتاحی کلمات کہے اور موضوع کا تعارف کرایا، جو تجربہ کل یونیورسٹی میں ہوا تھا، وہی آج میڈیکل کالج میں بھی ہوا، کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے افتتاحی کلمات میں بعض ایسے مسائل اور ان سے علماء کی غفلت کا ذکر کیا، جن پر 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' باضابطہ سیمینار کر چکی ہے، پھر ڈاکٹر رفیق، جو کالج کے مقبول اساتذہ میں ہیں اور اپنی وضع

قطع اور تدین کی وجہ سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں، نے تعارفی کلمات کہے، وہی اس پروگرام کے اصل محرک بھی تھے، اس کے بعد راقم الحروف کا خطبہ میڈیکل سائنس کی ترقی اوراس سے پیدا ہونے والے طبی مسائل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر پر ہوا، ہال کالج کے اساتذہ، طلبہ، طالبات اور شہر سے آئے ہوئے ڈاکٹرز سے بھرا ہوا تھا اور سارے ہی لوگوں نے بہت توجہ سے پوری بات سنی، وقت زیادہ ہوجانے کی وجہ سے سوال و جواب کا موقع نہیں مل سکا اور بہت سے ڈاکٹر اور طلبہ نے مجھے گھیر لیا، آخر طے پایا کہ شہر میں ایک علاحدہ نشست صرف سوال و جواب کی رکھی جائے۔

یہاں سے ہم لوگ دارالعلوم بلالیہ احمد کدل پہنچے، یہ سرینگر کی سب سے بڑی دینی درسگاہ ہے، جس کی بنیاد مفتی عبدالرشید مفتاحی نے رکھی ہے، مفتی صاحب کی عمر چالیس کے اندر ہی ہوگی، لیکن اپنے ورع وتقویٰ اور سلامت فکر وطبع کی وجہ سے ان کو شہر میں مقبولیت حاصل ہے، وہ جلال آباد کے فارغ ہیں اور حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کے خاص خادموں میں رہے ہیں، اس دارالعلوم میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، جگہ کم ہے، لیکن عمارت دیدہ زیب اور کشادہ ہے اور مدرسہ سے متصل مسجدِ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہے، جو فن تعمیر کا ایک نمونہ ہے، اسی دارالعلوم میں وادیٔ کشمیر کے علماء کا ایک خصوصی اجتماع اس حقیر کی آمد کی مناسبت سے رکھا گیا تھا، عصر بعد ہی سے علماء کی آمد شروع ہوگئی جو کشمیر کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے تھے، لوگوں کی داستانیں سن کر احساس ہوا کہ گزشتہ سترہ سال کے عرصہ میں وہاں کے علماء اور مدارس ناقابل بیان آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گذرے ہیں، خود مفتی عبدالرشید صاحب ایک بڑے امتحان سے دوچار ہوئے، کپوارہ کے قریب کے ایک مدرسہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک جواں سال عالم دین نے مدرسہ کی بنیاد رکھی، فوج کا مستقل دباؤ تھا کہ انھوں نے مدرسہ کیوں قائم کیا؟ حالاں کہ بار بار انھیں مدرسہ دکھایا گیا اور انھیں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ ان مدرسوں کا علاحدگی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن پھر بھی انھوں

نے دباؤ جاری رکھا، یہاں تک کہ ایک دن بڑی بے دردی کے ساتھ انھیں شہید کر دیا، ان کے چھوٹے بھائی نے انتظام سنبھالا اور اس روح فرسا واقعہ کے ٹھیک ایک سال بعد انھیں بھی جام شہادت نوش کرنا پڑا، اب ان کے تیسرے بھائی مدرسہ کا نظم ونسق سنبھالے ہوئے ہیں، شقی القلب فوجیوں نے ان سے پوچھا کہ ابھی تک تم لوگوں نے مدرسہ بند نہیں کیا؟ انھوں نے کہا کہ ہم ابھی چھ بھائی زندہ ہیں، اس لئے کم از کم چھ سال تک تو مدرسہ چلے گا، اس کے بعد اللہ کی جو مرضی، یہ بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ہے اس خطہ میں علماء اور اہل مدارس کی قربانی کی!

نماز مغرب کے فوراً بعد دار العلوم بلالیہ کی تحتانی منزل کے وسیع، خوبصورت اور نوتعمیر شدہ ہال میں علماء کا اجتماع ہوا، شروع میں مولانا مفتی عبد الرحیم قاسمی نے تعارفی کلمات کہے اور اس حقیر کے ساتھ بڑی محبت اور حسن ظن کا معاملہ فرمایا، پھر مجھے خطاب کی دعوت دی گئی، سامعین کی تعداد دو سو سے اوپر ہی ہوگی، اس میں کم سے کم ڈیڑھ سو علماء اور بقیہ دینی مذہبی جماعتوں کے ذمہ داران تھے، علماء کے اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر اور ان آزمائشوں کا خیال کر کے جن سے وہ گزر رہے تھے طبیعت پر بڑا تاثر تھا، اس لئے خلاف معمول بات کچھ لمبی ہوگئی اور تقریباً دو گھنٹہ معروضات پیش کی گئیں، وہاں کے حالات کے پس منظر میں بار بار آنکھیں نم ہو جاتی تھیں اور دل بھر آتا تھا۔

میری معروضات کا خلاصہ یہ تھا کہ تحقیق دین اور حفاظت دین علماء کی خصوصی ذمہ داری اور حضور ﷺ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے، چوں کہ کشمیر کے حالات دوسری جگہوں سے مختلف ہیں اور مسائل بھی الگ ہیں، اس لئے یہاں علماء کا کوئی ایسا اجتماعی پلیٹ فارم ہونا چاہئے، جس میں یہاں کے مخصوص حالات کے پس منظر میں پیدا ہونے والے مسائل پر غور وخوض ہو سکے، دوسرے اسلام کے خلاف جو یلغار یہاں ہو رہی ہے، اس فکری یلغار کے مقابلہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے، میں نے خاص طور پر انھیں متوجہ کیا کہ یہاں عیسائی مشنریز کا جو جال بچھا ہوا ہے، اس کا مقابلہ آسان نہیں، صرف فتوے دے کر اور مسلمانوں کو روک کر ان کی

مضرتوں سے بچا نہیں جاسکتا، کیوں کہ کشمیر میں تعلیم کو عام کرنے میں ان اسکولوں کا بہت بڑا کردار ہے، یہاں تک کہ مختلف دینی جماعتوں کے سربراہان اور ذمہ داران بھی ان ہی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ ہیں اور دور دراز دیہاتوں میں انھوں نے تعلیم اور علاج کی جو سہولتیں بہم پہنچائی ہیں، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ مسلمانوں کی نئی نسل کو الحاد و تشکیک یہاں تک کہ ارتداد کی طرف لے جانے کا باعث بنی ہیں، اس لئے اس کا حل یہ ہے کہ علماء خود عصری تعلیمی ادارے قائم کریں اور پوری طرح دینی ذہن سازی اور اسلامی ماحول کو ملحوظ رکھیں، یہی اس وقت کا سب سے بڑا جہاد ہے۔

اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ کشمیر میں خواندگی کی شرح بہت اچھی ہے اور باضابطہ تعلیم کا تناسب بھی قابل اطمینان ہے، خاص کر لڑکیوں میں تعلیم کا اوسط اور تعلیمی رجحان بہتر ہے اور اس میں بڑا حصہ ان ہی مشنری اسکولوں کا ہے، یہاں سینٹ جوزف اسکول سو سال سے بھی زیادہ سے قائم ہے، جس کا مرکز بارہ مولہ میں ہے، پروٹسٹنٹ فرقہ کا ایک اسکول ''بیسکو'' کے نام سے ہے، جو ستر سال سے زیادہ عرصے سے خدمت کر رہا ہے، ''برنال'' اسکول کیتھولک فرقے کا ہے اور اس میں بہت بڑا چرچ بھی ہے، ممتاز اسکولوں میں ایک ''میلنسن'' اسکول بھی ہے، ان اسکولوں میں طلبہ و طالبات ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا نہ صرف بیوروکریسی کے لوگ اور منتخب عوامی نمائندے، بلکہ خالص دینی جماعتوں کے ذمہ دار بھی زیادہ تر ان ہی اسکولوں کے فیض یافتہ ہیں۔

راقم الحروف نے یہ بھی عرض کیا کہ اُمت کی قیادت اور رہنمائی کے لئے علم نبوی کے ساتھ ساتھ حکمتِ نبوی کا ادراک اور اس کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے، بعض دفعہ حکمت و مصلحت سے عاری علم و عمل بے فیض ہوجاتا ہے، یہ بات اس حقیر نے اس لئے کہی کہ حکومتِ ہند اور کشمیر کے جذباتی اور عاقبت نا اندیش علاحدگی پسندوں کے درمیان عوام پس رہے ہیں اور علماء اور سنجیدہ لوگ اپنی زبان پر تالا لگانے پر مجبور ہیں، میں نے وہاں کے خصوصی حالات

کے پس منظر میں تربیتِ قضاء کا کیمپ منعقد کرنے پر بھی توجہ دلائی اور اس بات پر بھی کہ اس وقت حالات کے ردعمل اور یاس وناامیدی کے پس منظر میں نوجوانوں کا ایک طبقہ جس تشکیک کے دلدل میں پھنس رہا ہے، ان کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ علماء احکام شریعت کے اسرار ورموز کا مطالعہ کریں اور اپنے آپ کو اس لائق بنائیں کہ انھیں مطمئن کرسکیں۔

الحمدللہ اس خطاب کا بہتر اثر محسوس ہوا، بہت سے علماء نے اپنے اپنے حلقہ میں ان ہی خطوط پر کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا، یہاں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اس جھیل کی طرف لایا گیا جو ڈل جھیل سے متصل ''نگن جھیل'' ہے، سرینگر میں ان جھیلوں میں بڑے بڑے بوٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں، یہ بوٹ باہر سے تو بہت سادہ نظر آتے ہیں، لیکن اندر سے کسی تھری اسٹار ہوٹل سے کم نہیں ہیں، یہیں ایک بوٹ ہاؤس میں اس شب میرے قیام کا نظم کیا گیا تھا، یہ بوٹ ہاؤس جناب منظور احمد وانگنو کا تھا، جن کی طرف سے قیام کی پیش کش تھی، اس میں دو کشادہ کمرے پورے فرنیچر اور منسلک باتھ روم کے ساتھ تھے، اس کے ساتھ ایک ڈرائنگ روم جسے کسی میٹنگ کے لئے بھی بآسانی استعمال کیا جاسکتا ہے، اور کچن بھی تھا، جو فریج اور چولھے وغیرہ کی تمام سہولتوں کے ساتھ ہے، بوٹ ہاؤس کی اگلی جانب جھیل کی طرف کچھ کھلا ہوا حصہ ہے، اور یہاں بھی بیٹھنے والوں کے لئے فرنیچر کا انتظام ہے، بوٹ ہاؤس کے عرشہ پر تفریحاً بیٹھنے اور چہل قدمی کرنے کا بھی معقول انتظام تھا، ظفر عابدین سلمہ کے علاوہ مولانا عدنان ندوی، مولانا بلال ندوی اور مولانا ارشد ندوی نے بھی آج میرے ساتھ رات گزاری، سیاحت کا زمانہ ہونے کی وجہ سے تقریباً سبھی بوٹ ہاؤس سیاحوں سے بھرے ہوئے تھے، ان بوٹ ہاؤسوں میں لائٹ، ٹھنڈے اور گرم پانی وغیرہ کا بھی نہایت معقول انتظام رہتا ہے، ہم لوگ رات دیر گئے تک اس کے بیرونی حصہ میں بیٹھے کچھ دینی، تعلیمی اور ملی مسائل پر گفتگو کرتے رہے اور صاف وشفاف جھیل اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنی، نیز مختلف حصوں میں موجود بوٹ ہاؤس پر لگے ہوئے قمقموں سے لطف اندوز ہوتے رہے

اور رات دیر گئے بستر پر گئے۔

۲۹ جون کو ہم لوگ باندی پورہ کے لئے روانہ ہوئے، یہ سرینگر سے تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے، راستہ میں ایک بڑی خوبصورت جھیل ''مالسن بل'' کے نام سے ملتی ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ ایشیاء کی سب سے خوبصورت جھیل شمار کی گئی ہے، سیاحوں کے لئے پرکشش بنانے کے خیال سے اس کے اطراف میں اچھے پارک بھی بنادیئے گئے ہیں، یہ جھیل پہاڑ کے دامن میں ہے اور واقعی بہت صاف وشفاف اور خوبصورت ہے، آگے بڑھے تو کچھ فاصلہ پر ایک اور جھیل ملی، جسے ''ولر لیک'' کہتے ہیں، لوگوں نے بتایا کہ یہ ایشیاء کی سب سے بڑی جھیل ہے، جو ۲۲۲ مربع کلومیٹر پر واقع ہے، یہ بات کہاں تک صحیح ہے یہ تو اللہ کے علم میں ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ اس جھیل کے ساتھ کافی دیر تک چلتے رہے۔

بہرحال اونچی نیچی پہاڑیوں اور سرو قامت درختوں کے جھنڈ اور بیچ میں آنے والی چھوٹی چھوٹی آبادیوں سے ہوتے ہوئے ہم لوگ باندی پورہ پہنچے، یہ اچھا خاصا شہر ہے، شہر کا کچھ حصہ نشیب میں ہے اور کچھ فراز پر، بالائی حصہ پر دارالعلوم رحیمیہ کا وسیع احاطہ واقع ہے، مولانا رحمت اللہ صاحب اس کے ناظم اور مفتی نذیر احمد صاحب مفتی ہیں، یہ اس وقت ریاست کشمیر کا سب سے بڑا ادارالعلوم ہے، پانچ سو طلبہ دارالاقامہ میں مقیم ہیں، دورۂ حدیث تک تعلیم ہے اور تربیت افتاء کا شعبہ بھی ہے، لائبریری بھی اچھی ہے، جس میں کچھ مخطوطات بھی ہیں، زیادہ تر مخطوطات فارسی زبان میں ہیں، دارالعلوم کی مختلف عمارتوں کے وسط میں عظیم الشان مسجد بنی ہوئی ہے، جو اندر اور باہر سے نہایت خوبصورت اور بہت ہی پرکشش ہے، اسی مسجد میں اساتذہ اور طلبہ سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔

یہاں سے ہم لوگ سرینگر لوٹے، سرینگر کی جامع مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی، یہ مسجد اعلیٰ اور نفیس فن تعمیر کا ایک نمونہ ہے، جامع مسجد دہلی کے طرز پر تین طرف سے بہت اونچے دروازے ہیں اور سمت قبلہ میں مسجد ہے، کشمیر کے موسم کے لحاظ سے باب الداخلہ کو اندر لیتے

ہوئے شمالی، جنوبی اور مشرقی جانب سے بھی نماز کے بہت بڑے بڑے ہال ہیں اور مغربی جانب کی عمارت میں منبر ہے، جامع مسجد دہلی ہی کی طرح صحن میں حوض ہے، لیکن یہاں وسط صحن میں حوض بنایا گیا ہے، اس لئے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے، صحن کی کھلی جگہ میں پختہ فرش کرنے کی بجائے سبزے لگائے گئے ہیں، اور راستوں کے دونوں کنارے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پودے لگے ہوئے ہیں، اس لئے بڑے خوبصورت نظر آتے ہیں، یہ تو مسجد کا بیرونی حصہ ہوا، اندرونی حصہ میں چھتیں بہت بلند ہیں اور تمام ستون چنار کی لکڑیوں کے ہیں، بہت نازک وضع، ہشت پہل، ہموار اور اونچے، درمیان میں کوئی پیوند نہیں، دور سے گمان ہوتا ہے کہ شاید پتھر کا ستون ہو، ایک ہی انداز کے تراشے ہوئے ستون، چھت کا مدار لکڑیوں سے آراستہ اور لکڑیوں کے کچھ حصے کو اونچا اور کچھ کو نیچا کر کے ایک ڈیزائن کی شکل دی گئی ہے، بہت ہی وسیع وعریض مسجد ہے، مسجد کے باب الداخلہ پر اس کی تفصیلات لکھی ہوئی ہیں، جس میں بتایا گیا ہے کہ اس میں تینتیس ہزار تین سو تینتیس نمازیوں کی گنجائش ہے، اس کی لمبائی چوڑائی ۳۸۱×۳۸۴ ہے اور اس میں ستونوں کی تعداد تین سو اٹھتر ہے، ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگ چوں کہ عام طور پر کشمیر نہیں پہنچتے، اس لئے اس مسجد کا شہرہ نہیں ہے، ورنہ درحقیقت یہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے، سلاطین کشمیر میں ایک نامور حکمراں سلطان زین العابدین بڈشاہ گذرا ہے، ان کے لڑکے سلطان سکندر شاہ نے یہ مسجد تعمیر کرائی ہے اور یہیں میرواعظ مولوی عمر فاروق کا خطبہ جمعہ ہوتا ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس خطبہ میں دینی باتیں تو کم ہوتی ہیں، لیکن عالمی اور ملکی سیاست کا تذکرہ بھرپور ہوتا ہے۔

آج دوستوں نے بیوپار منڈل، مہاراج گنج میں ایک خصوصی پروگرام تاجروں کے لئے رکھا تھا، یہ سرینگر کا نہایت اہم تجارتی مرکز ہے، یہیں ''رحیم ہال'' میں تاجروں کا اجتماع تھا، میرے کچھ عرض کرنے سے پہلے مفتی نذیر احمد صاحب نے افتتاحی کلمات کہے اور اس حقیر کا تعارف کرایا، ارادہ تھا کہ تجارت کے احکام اور بالخصوص اس موضوع سے متعلق نئے مسائل پر

تفصیلی گفتگو کروں اور سوالات کا جواب دوں، لیکن پروگراموں کی کثرت اور اس کثرت کی وجہ سے کم خوابی و بے آرامی، نیز مسلسل سفر کی وجہ سے طبیعت اتنی ٹوٹ چکی تھی کہ مشکل سے آدھ گھنٹہ سے کچھ اوپر بات کر پایا اور دو باتوں پر خصوصیت سے توجہ دلائی، ایک یہ کہ معاملات میں استقامت ورع وتقویٰ کا اصل معیار ہے، دوسرے تاجروں کے لئے داعیانہ کردار کی اہمیت، دُعاء پر مجلس ختم ہوئی اور ہم اپنے میزبان کے یہاں پہنچے اور کچھ دیر آرام کیا۔

آج میرے قیام کا آخری دن تھا، میزبانوں کی خواہش تھی کہ کچھ وقت تفریح کے لئے نکلے، چنانچہ عصر کے بعد وہ ہمیں یہاں کے پارک دکھانے کے لئے نکلے، ڈل جھیل کے قریب ہی مغلوں کے دور کے بنے ہوئے تین بڑے گارڈن ہیں، ایک نشاط گارڈن، دوسرے شالیمار گارڈن، تیسرے ہارزن گارڈن، بنیادی طور پر ان باغات میں وسطی حصہ سے ایک ایسی نہر نکالی گئی ہے، جو نشیب وفراز کو عبور کرتی ہوئی اوپر سے نیچے تک آتی ہے، اس نشیب وفراز کی وجہ سے اس میں آبشار اور آبجو کا دوہرا لطف جمع ہو گیا ہے، نہر کے دونوں کنارے اور اس کے عقبی حصہ میں دور دور تک خوش رنگ پتوں اور پھولوں کے پودے، اونچے اونچے سایہ دار درخت اور وسیع سبزہ زار بنے ہوئے ہیں، ان سب نے مل کر بڑا ہی جاذب نظر ماحول پیدا کر دیا ہے، یہی کشش ہے کہ سنگینوں کی چھاؤں میں بھی سیاح بڑی تعداد میں یہاں تتلیوں کی طرح ایک طرف سے دوسری طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں، اس طرح کے پارک اصل میں ایران میں بنا کرتے تھے، مغل جب ایران سے ہندوستان آئے تو وہ فن تعمیر کی یہ سوغات بھی اپنے ساتھ لائے، اسی طرح کا ایک گارڈن لاہور میں بھی ہے، ٹھیک لاہور کی جامع مسجد کے سامنے، اس کو بھی دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ لاہور کے باغ کو انسانی ہاتھوں نے سنوارا ہے اور کشمیر کے یہ باغات دست قدرت کے سنوارے ہوئے ہیں، اس لئے دونوں کے حسن میں کوئی نسبت نہیں ہے، پھر ان باغات کے سامنے وسیع وعریض جھیل اور عقب میں سبز پوش پہاڑیاں اس کے حسن کو اور چار چاند لگاتی ہیں۔

یہاں سے قریب ہی ایک نیشنل پارک واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سو تینتالیس مربع کلومیٹر پر واقع ہے، اس پارک میں چار چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان ایک بڑا خوش منظر علاقہ ہے، جس میں ہیلی پیڈ اور تمام سہولتوں کے ساتھ قیام گاہ تعمیر کی گئی ہے، ہندوستان کے وزراءاعظم جب سرینگر جاتے ہیں، تو یہیں ان کا قیام ہوتا ہے، کیوں کہ یہ جگہ خوبصورت محل وقوع کے اعتبار سے بھی بڑی دیدہ زیب ہے اور حفاظتی نقطۂ نظر سے بھی قدرتی طور پر محفوظ ہے، اس پارک کے قریب ہی ایک دینی درسگاہ ''مدرسہ کوثریہ'' کے نام سے قائم ہے، مولانا محمد نظام الدین ندوی اس کے ذمہ دار ہیں، یہ مسلکاً شافعی ہیں، اور بہت فعال شخصیت کے مالک ہیں، ان کے اصرار پر یہیں مغرب کی نماز ادا کی گئی، انھوں نے جلدی جلدی محلّہ کی اہم شخصیتوں کو بھی جمع کرلیا تھا، مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ بھی تھے، لیکن وقت کم تھا، اس لئے دُعاء پر اکتفاء کیا گیا۔

یہاں سے ہم لوگ سیدھے شاہ فیصل کالونی پہنچے، اس کالونی میں ڈاکٹر رفیق صاحب نے ایک دینی درسگاہ ''مدرسہ الٰہیہ'' کے نام سے قائم کی ہے، اس مدرسہ میں ڈاکٹرز اور میڈیکل کالج کے طلبہ عالم کورس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، مجھے یہ نظام بڑا اچھا معلوم ہوا، اس مدرسہ میں ان کے لئے رہائش کا نظم ہے، وہ دن میں کالج کرتے ہیں اور بقیہ وقت یہاں کی تعلیمی سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں، اسی درسگاہ کی مسجد میں ڈاکٹروں کے ساتھ سوال وجواب کی مجلس رکھی گئی تھی، مفتی نذیر احمد صاحب نے تمہیدی کلمات کہے اور اس کے بعد اس حقیر نے سوالات کے جوابات دیئے، نماز کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔

تیس جون کو ہمیں سرینگر سے واپس آنا تھا اور صبح ہی سے ملاقات کے لئے آنے والوں کا ہجوم تھا، کشمیر کے خصوصی حالات کے پس منظر میں ہم نے ہمیشہ اپنے آپ کو میڈیا سے دور رکھنے کی کوشش کی اور پہلے ہی سے اپنے میزبان کو بتادیا تھا کہ وہ اخبار میں کوئی خبر دینے سے احتراز کریں، لیکن آخر کشمیر کے مقبول ہفت روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' والوں نے پکڑ ہی لیا اور ان کے نمائندے انٹرویو لینے کے لئے آدھمکے، میں نے ان سے وضاحت کردی کہ سوالات مذہبی

اورعلمی مسائل تک محدود رہیں، سیاسی مسائل کے بارے میں کوئی سوال نہ ہو، انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور زیادہ تر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وغیرہ کی سرگرمیوں کے بارے میں سوالات کرتے رہے اور جوابات دیئے گئے۔

انھوں نے بھی انٹرویو میں بار بار اجتہاد سے متعلق سوال کو دہرایا، میں نے کہا کہ ہر عمل کی ایک قدرتی اور تدریجی رفتار ہوتی ہے اور ایک مقام پر پہنچ کر اس کی از خود تکمیل ہو جاتی ہے، یہ اس عمل کو بند کرنا نہیں ہے بلکہ مکمل کر دینا ہے، جیسے ایک عمارت کی تعمیر جاری ہو اور اب پروگرام کے لحاظ سے صرف اس کی بالائی منزل باقی ہو، تو اب معمار کو بنیاد سے تعمیر اُٹھانے کے بجائے حسب ضرورت بالائی منزل پر توجہ دینی چاہئے، یہی معاملہ اجتہاد کا ہے، تدوین فقہ کے ابتدائی دور میں بنیاد سے تعمیر کی ضرورت تھی، اس لئے فقہاء نے ہر ہر مسئلہ پر غور کیا، یہاں تک کہ چار صدیوں میں ایک مرتب نظامِ حیات کی حیثیت سے فقہ اسلامی وجود میں آ گئی، اب نئے سرے سے ہر مسئلہ میں اجتہاد فضول کوشش ہی کہلائے گی، ہاں! ہر دور میں جو مسائل پیدا ہوں، ان کو حل کرنا ضروری ہے اور علماء اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔

کوئی دس بجے میزبان کے مکان کے سامنے قائم ہونے والے ایک مکتب میں دُعاء کر کے ہم لوگ وہاں سے نکلے، راستہ میں کشمیر کی مشہور مسجد ''مسجد حضرت بل'' سے گزر ہوا، دوستوں کی خواہش پر دس پندرہ منٹ کے لئے یہاں رکے، یہ مسجد ڈل جھیل کے ایک کنارے پر واقع ہے اور سنگ مرمر سے تعمیر شدہ یہ مسجد ایک خاص شان کی مالک ہے، اس کا سفید مرمریں گنبد دور سے دعوتِ نظارہ دیتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ملک کی وسیع و کشادہ مسجدوں میں ایک ہے، اندر سے بھی بڑی آرائش کی گئی ہے، مشہور قائد شیخ عبداللہ مرحوم اسی مسجد میں نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے، اس پس منظر میں اسے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے، یہاں رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک بھی محفوظ ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی سند موجود ہے، سال میں دو بار زیارت کرائی جاتی ہے، اس لئے مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا ہے، جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے،

یہاں بھی بڑی بدعات ہوتی ہیں، عورت اور مرد سجدے کرتے ہیں، یہاں تک کہ مسجد کے زینہ کو چومتے اور چاٹتے ہیں، بعض مبالغہ آمیز اشعار بھی لکھے ہوئے ہیں، جن میں ایک مصرعہ اس طرح نظر آیا :

اصل شد احمد دار بر را م

ان احوال کو دیکھ کر افسوس ہوا کہ جو قوم خود داعیٔ توحید تھی، وہ کن خرافات میں کھوگئی ہے! بہرحال دوڑتے بھاگتے ہم لوگ ایر پورٹ پہنچے، جہاں سکیورٹی کا غیر معمولی بلکہ تکلیف دہ انتظام ہے، مجموعی طور پر صرف ایر پورٹ کے احاطہ میں آٹھ جگہ چیکنگ ہوئی اور خاصا پیدل چلنا پڑا، یہ کرواہٹیں سیرِ کشمیر کی حلاوتوں کو تلخ کامی کے قریب پہنچا دیتی ہیں، آخر اس جہاز سے ہم دہلی واپس آئے، اگر ٹرین اور بس کا سفر ہوتا تو نہ جانے کتنے امتحان سے گزرنا پڑتا۔

کشمیر کے موجودہ حالات نہایت افسوس ناک اور تکلیف دہ ہیں، ان حالات میں ایک طرف ہماری حکومت کا قصور ہے کہ اس نے کشمیر کے مسائل پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی، ہمیشہ یہاں مرکز کی طرف سے حکومتیں مسلط کی گئیں، کشمیر جیسی عظیم الشان سیاحتی ریاست کی سڑکیں انتہائی غیر معیاری ہیں، بعض اوقات قصبات کی سڑکیں بھی اس سے بہتر ہوتی ہیں، اس کے قدرتی حسن کو سنوارنے کے لئے بھی کبھی کوئی مؤثر کوشش نہیں کی گئی۔

پوری ریاست میں کوئی قابل ذکر فیکٹری نہیں، اب پچاس سال کے بعد ریلوے نظام لانے کی کوشش کی جارہی ہے، ریاست میں جو برقی پیدا ہوتی ہے، اس کا بہت بڑا حصہ ریاست کے باہر منتقل کردیا جاتا ہے، ایر پورٹ کی حالت اتنی خستہ ہے کہ اسے بیان کرنا دشوار ہے، پھر فوجیوں کی طرف سے انسانی حقوق کو تلف کرنا روزمرہ کا معمول ہے، لوگ اپنے ہی گھر میں قیدی بنے ہوئے ہیں، دوسری طرف مٹھی بھر وہ جذباتی نوجوان ہیں، جنھیں شر و فساد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے اور ان کی وجہ سے سمجھدار لوگ مہر بہ لب رہنے پر مجبور ہیں۔

میں نے اپنی نجی نشستوں میں لوگوں سے کہا کہ کشمیر کو غلام سمجھنا خلافِ واقعہ ہے، یہاں حکمراں آپ کے ووٹ سے منتخب ہوتے ہیں، آپ خود حکومت کرتے ہیں اور اپنے لئے قانون بناتے ہیں، اگر آپ غلام ہیں، تو پورے ہندوستان کو غلام سمجھنا ہوگا، کیوں کہ دفعہ ۳۷۰ کی بنیاد پر آپ کو دوسری ریاستوں کے مقابلہ زیادہ اختیارات حاصل ہیں اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین آپ پر لاگو نہیں ہوتے ہیں، جب تک خود آپ کی اسمبلی اسے منظور نہ کرلے، نیز کشمیر کے جغرافیائی حالات بھی ایسے ہیں کہ وہ اپنی بہت سی ضروریات میں دوسروں کا محتاج رہے گا اور کشمیر کا ہندوستان میں شامل رہنا مسلمانان ہند کے لئے تقویت کا باعث ہے، کیوں کہ یہ واحد ریاست ہے، جس میں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت ہے اور جس کی سرکاری زبان اُردو ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری حکومت زخموں پر نمک چھڑکنے کے بجائے مرہم لگائے، جن کے گھر تباہ و برباد ہوئے ہیں اور جن کے اعزہ مارے گئے ہیں، ان کا تعاون کرے، نوجوانوں کی بے روزگاری کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، زیادہ سے زیادہ کشمیر پولیس کو متعین کیا جائے، پولیس اور جوانوں کو تربیت دی جائے کہ وہ ظلم و زیادتی سے بچتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیں، دستورِ ہند کی حدود میں ان کے مطالبات کو قبول کیا جائے اور اس طرح جسم کو فتح کرنے کے بجائے دلوں کو فتح کرنے کی کوشش کی جائے۔

کشمیر جا کر محسوس ہوا کہ امن اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کتنی عظیم الشان نعمت ہے، جگہ جگہ بورڈ لگے ہوئے ہیں :

جوان اور عوام ، امن ہے مقام

لیکن عملاً یہ مقام امن سے محروم ہے، اس لڑائی میں اصل بندوق بردار پچیس فیصد مرے ہوں گے، ۷۵ فیصد بے قصور عوام مارے گئے ہیں، جس میں نوجوانوں کے ساتھ بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی شامل ہیں، ان مارے جانے والوں میں غالب تعداد تو محافظ

دستوں کے ہاتھوں ماری گئی ہے، لیکن بہت اچھی خاصی تعداد وہ بھی ہے، جنھیں بندوق برداروں نے مارا ہے، عوام کے لئے باعث پریشانی یہ ہے کہ رات میں بندوق بردار آتے ہیں اور وہ بندوق کی نوک پر گھروں میں قیام کرتے اور کھاتے پیتے ہیں اور دن میں فوج کے جوان پہنچتے ہیں، اور زیادتی کرتے ہیں، اس طرح یہ بیچارے دونوں طرف سے مظلوم ہیں۔

سرکاری انفرااسٹرکچر کو بہت نقصان پہنچا ہے، کئی جگہ پر دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ اساتذہ اور معلمات بچوں کو کھلے میدان میں پڑھاتے ہیں، معلوم ہوا کہ ان کے اسکول بندوق برداروں نے جلادیئے ہیں، اسی طرح جنگل، جو کشمیر کی بہت قیمتی متاع ہے، بہت سے مقامات پر فوجیوں نے کاٹ دیئے ہیں، کیوں کہ یہاں سے گھات لگا کر ان پر حملے کئے جاتے تھے۔

بظاہر کشمیر میں فقر وافلاس کی جو کیفیت ہونی چاہیئے، اللہ کا شکر ہے کہ وہ نظر نہیں آتی اور اس کی وجہ وہاں بعض قدرتی اور قیمتی وسائل کی فراوانی ہے، سیب، آلو بخارا، چیری، بادام اور اخروٹ وہاں وافر مقدار میں ہوتا ہے، زعفران کے لئے بھی یہ خطہ مشہور ہے، ریشم، قالین اور اونی کپڑوں اور لکڑی کے بنے ہوئے خوبصورت سامانوں کی صنعت کے لئے پوری دنیا میں اس کا شہرہ ہے اور سیاحت اس کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، کیوں کہ کم از کم تین ماہ یہاں پوری دنیا سے سیاحوں کا ورود ہوتا رہتا ہے اور ہوٹل اور بوٹ ہاؤس کے کمرے بک رہتے ہیں، اس لئے اگر تھوڑی توجہ کر لی جائے، اور خاص کر کشمیر کی صنعت اور سیاحت کو فروغ دیا جائے، تو یہ ملک کی متمول ترین ریاست بن سکتی ہے۔

اُردو یہاں کی سرکاری زبان ہے، لیکن اُردو کا حال یہاں دوسری ریاستوں سے بھی گیا گزرا ہے، عام طور پر دکانوں کے سائن بورڈ انگریزی میں ہیں، خال خال کہیں اُردو میں ہیں، یونیورسٹی اور میڈیکل کالج وغیرہ میں میں نے دیکھا کہ تمام پروگرام انگریزی میں ہوئے اور اکثر سائن بورڈ بھی انگریزی میں ہیں، سرکاری دفاتر پر اُردو بورڈ بھی لگے ہوئے ہیں، لیکن

ان کا خط اتنا خراب اور ناقص ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اس سے بہتر تھا کہ اُردو نویسی کی اس تہمت سے بھی انھیں فارغ ہی رکھا گیا ہوتا ، حالاں کہ آج کل کمپیوٹر سے لکھنے ،لکھانے کی بہترین سہولت موجود ہے، اُردو کے کئی اخبارات نکلتے ہیں، جن میں ''آفتاب'' اور ''کشمیر گزٹ'' زیادہ مشہور ہیں ، ان اخبارات میں بمشکل ایک تہائی حصہ خبروں کا ہوتا ہوگا ، بقیہ سب اشتہارات ہوتے ہیں، خبریں بھی زیادہ تر مقامی اور ان میں بھی مجرمانہ واقعات کو نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے، مثبت اور تعمیری خبریں بہت کم ہوتی ہیں اور حالات کے تجزیہ پر مضامین بھی نہیں ہوتے ، عام لوگ ''کشمیری'' بولتے ہیں ، جس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے، انگریزی زبان کا چلن بھی اچھا خاصا ہے ، مجھے محسوس ہوا کہ اُردو زبان کی یہ تحقیر اور سرکاری زبان ہونے کے باوجود اس سے بے نیازی مشنری اسکولوں کا ثمرہ ہے۔

عام طور پر سیاحتی مقامات میں بے حیائی اور بے شرمی بڑھ جاتی ہے اور لباس بھی نیم عریاں ہونے لگتا ہے، کشمیر ایسا خطہ ہے کہ اللہ نے مکان ہی نہیں ، بلکہ مکینوں کو بھی حسن و جمال سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے، اس لئے یہاں ایسی بے حیائی کے مواقع نسبتاً زیادہ تھے،، لیکن کھلے عام ایسے مناظر نظر نہیں آتے ، چہرے کے پردہ کا غالباً یہاں رواج نہیں ، لیکن پوری آستین کا کرتہ ، شلوار اور سر پر دوپٹہ خواتین کا عام لباس ہے اور اسے موجودہ حالات میں 'غنیمت' کہا جا سکتا ہے، البتہ نئی نسل میں دوپٹہ سر سے گردن کی طرف سرک آیا ہے اور دوسرے قرائن سے بھی اندازہ ہوا، کہ مغربی تہذیب اس مسلم اکثریتی ریاست کے دروازوں پر دستک دینے کے لئے بے چین ہے، بلکہ اس نے اپنے قدم رکھ دیئے ہیں ،لوگوں سے معلوم ہوا کہ اندر کی سطح پر سماجی حالات بھی کچھ بہتر نہیں ، ان حالات میں وہاں کے علماء اور اہل دین کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں ، کہ وہ سماجی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دیں ، ورنہ مستقبل میں یہ اس ملک میں بے حیائی اور اباحیت کا خدانخواستہ سب سے بڑا مرکز بن سکتا ہے۔

سرینگر اور مختلف شہروں میں جا بجا حکومت کی طرف سے بڑے بڑے سائن بورڈ نظر

آئے، جن پر حدیث کے حوالہ سے یہ دُعاء لکھی ہوئی ہے :

اللهم ضع في أرضنا بركتها و زينتها وسكنها .

خدوندا! ہماری زمین میں اس کی برکت، اس کی زینت اور امن رکھ دیجئے۔

میں جب بھی اس تحریر کے پاس سے گزرتا، تو بار بار اس پر آمین کہتا اور اب بھی اس پر آمین کہتا ہوں!!

❑ ❑ ❑ ❑

علم وصنعت کے گاؤں میں!○

اگست کی کوئی تاریخ ہوگی، ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، معلوم ہوا کہ مالیگاؤں سے مولانا سراج احمد صاحب بات کررہے ہیں اور استاذ گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کو اپنے مدرسہ ''جامعہ بیت العلوم'' میں بخاری شریف ختم کرانے کے لئے دعوت دینا چاہ رہے ہیں، بات آئی گئی ہوگئی، چند دنوں بعد پھر دوبارہ انھیں کا فون آیا، مولانا مدظلہ نے دعوت قبول کرکے تاریخ کی تعیین کردی، درمیان کی مدت میں کئی بار مولانا سراج صاحب یاد دہانی اور پروگرام کی قطعیت کے لئے فون کرتے رہے، مجھ سے بھی بات ہوتی رہی بالآخر ۲۸ستمبر۲۰۰۳ء کا پروگرام طے پایا۔

ان ہی تاریخوں میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے زیرنگرانی قائم دارالقضاء کمیٹی کی جانب سے ممبئی میں قائم شدہ دارالقضاء کا جائزہ اور وہاں کی عوام میں دارالقضاء کی اہمیت وضرورت کو بیان کرنے کے لئے پہلے سے ہی ایک پروگرام طے پاچکا تھا، جس میں دارالقضاء کمیٹی کے کنوینر مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)، مولانا عبیداللہ اسعدی (استاذ جامعہ عربیہ ہتھورا) اور مولانا مدظلہ کی شرکت ضروری تھی، اسی لحاظ سے مولانا مدظلہ کا پورا پروگرام طے پایا، خادم سفر کی حیثیت سے مولانا نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا، جو یقیناً میرے لئے سعادت کی بات تھی۔

مقررہ پروگرام کے مطابق ۲۶ستمبر کو ہم لوگ بذریعہ ٹرین ممبئی کے لئے روانہ ہوئے اور ۲۷ستمبر کی صبح ۵ بجے ممبئی کے وی ٹی اسٹیشن پر ہماری ٹرین ۷۹۰ کیلومیٹر طے کرکے پہنچی، کہا

○ مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی (متعلم جامعہ اُم القریٰ، مکہ مکرمہ)

جاتا ہے کہ علم کا ایک بڑا حصہ سفر سے حاصل ہوتا ہے، ممبئی تک کا ہمارا یہ سفر بھی کچھ اسی طرح کا ثابت ہوا، ہمارے سامنے کی سیٹ پر مہذب گھرانے کی تعلیم یافتہ ایک غیر مسلم خاتون تھیں، اپنے ساتھ سامان کی کثرت کی وجہ سے پریشان بنی ہوئی تھی، ہم لوگوں نے ان کی مدد کی اور بھرپور تعاون کا یقین دلایا، اس سے وہ اتنا متاثر ہوئی کہ موجودہ دور میں مسلمانوں پر عائد کئے جانے والے الزامات کا اس نے خود ہی دفاع کرنا شروع کردیا اور کہنے لگی کہ مسلمان تو آپ لوگ جیسے بااخلاق اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں، مگر لوگوں نے پروپیگنڈہ کرکے انھیں بدنام کردیا ہے، موجودہ زمانہ میں ایسے حقیقت پسند غیر مسلموں کی کمی نہیں، مگر ضرورت ایسے مسلمانوں کی ہے جو معمولی اخلاق کے ذریعہ غیر مسلموں کے دلوں کو فتح کرنے کا ہنر اپنے اندر پیدا کریں۔

قریب کی سیٹ پر جین مذہب کے ماننے والے ایک صاحب تھے، وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر ہمارے پاس آگئے اور جانوروں کی قربانی کے بارے میں سوالات کرنے لگے کہ "اسلام میں اس طرح بے دریغ جانوروں کو کھانے کی اجازت کیوں دی گئی ہے اور مسلمان اسے کیوں کھاتے ہیں؟ مولانا مدظلہ نے ان کے اعتراضات کا تشفی بخش اور متاثر کن جواب دیا، اور سلجھے ہوئے انداز میں ان سے بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی، مولانا نے کہا کہ "دنیا کی اکثر قومیں گوشت کھاتی ہیں اور اکثر ممالک میں گوشت کھایا جاتا ہے، ہندوستان کی بہت سی ریاستوں میں غیر مسلموں کی بھی یہ غذا ہے، اس لئے مسلمانوں پر یہ الزام لگانا کہ صرف یہی گوشت خور ہیں، درست نہیں، بلکہ یہ ایک فطری غذا ہے، جس سے ہر فطرت شناس لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے کام ودہن کو لذت بخشتا ہے، نیز قانون فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے، انسان کے معدہ میں ہضم کی صلاحیت رکھی ہے، گھاس کھانے والے جانوروں میں نہیں رکھی گئی ہے، مولانا نے بتایا کہ جانور اگر ذبح نہ ہوں تو ان کی کثرت سماج کے لئے نہایت ہی پریشان کن ہوجائے گی، وی ٹی اسٹیشن پر مولانا عبدالاحد فلاحی آگئے تھے، ان کے ساتھ ہم لوگ اپنی قیام گاہ تامل ناڈو

بیت الحجاج، بھنڈی بازار پہنچے، جہاں پہلے سے مولانا عتیق صاحب اور عبیداللہ اسعدی صاحب مقیم تھے۔

یہاں کا پروگرام پہلے سے ہی طے شدہ تھا، ۹ بجے سے مسجد نور میں شہر کے معززین، علماء، دانشوران اور تاجر حضرات کا ایک اجتماع منعقد کیا گیا تھا، یہ اجتماع مولانا منیر احمد صاحب مدظلہ کی صدارت میں شروع ہوا، مقامی علماء کے علاوہ بیرونی مہمانوں میں کنوینز دار القضاء کمیٹی اور مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب نے خطاب کیا، اخیر میں کلیدی خطاب مولانا کا ہوا، مولانا نے اپنے خطاب میں علماء کی تین اہم ذمہ داریوں کو بیان فرمایا اور کہا کہ ''موجودہ دور میں حفاظت دین، تنفیذ دین اور تحقیق دین کی بہت ہی ضرورت ہے، حفاظت دین کے تحت مولانا نے دینی مدارس کے قیام پر زور دیا اور فرمایا کہ فکری یلغار کے اس دور میں باصلاحیت علماء کی ضرورت ہے، جو نئے عہد کے نئے تقاضوں کا حل پیش کرسکیں، تنفیذ دین کے ضمن میں ہندوستان کے پس منظر میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تحت قائم شدہ دارلقضاء کو مضبوط بنانے، مسلمانوں کے عائلی اور غیر عائلی مسائل کو بھی دار القضاء میں لانے اور شریعت مطہرہ کے مطابق اپنے مسائل حل کرانے کی اہمیت پر زور دیا، تحقیق دین کے ضمن میں مولانا نے موجودہ زمانہ میں نو پیدا شدہ مسائل خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، معاشرت سے ہو یا تجارت سے، کو حل کرنے اور اس کے لئے اجتماعی اجتہاد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کی کوششوں کو سراہا اور اس کا تعارف کرایا۔

دن کا کھانا بمبئی کی مشہور بزرگ، صاحب نسبت شخصیت الحاج عبدالرحمٰن صاحب (خلیفہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ) کے یہاں تھا، جہاں ہم لوگوں کو کھانا کھلایا گیا، یہ وہی جگہ تھی جہاں آج سے اسی، پچاسی سال قبل تحریک آزادی ہند کے متوالوں اور جیالوں نے خلافت تحریک کے آغاز کے بارے میں سوچا تھا اور باہمی مشورہ سے اس تحریک کی بنیاد پڑی تھی، میں نے اس عمارت کو بہت غور سے دیکھا، دل میں خیال آیا کہ آزادئ ہند کے سرفروشوں نے

جن مقاصد کے تحت آزادی ہند کا خواب دیکھا تھا، آزادی کے بعد اگر اب وہ زندہ ہوتے تو شاید اس آزادی اور جمہوریت کی پامالی سے یقیناً وہ ناخوش ہوتے۔

کھانے کے بعد مغرب تک آرام کا وقفہ رکھا گیا تھا، مولانا مدظلہ اپنی قیام گاہ میں آرام فرمانے لگے، چوں کہ یہ میرا پہلا سفر ممبئی تھا، اور کچھ فطرتاً بھی طبیعت کو گوشہ پسندی اور عزلت نشینی سے ایک طرح کی نفرت بلکہ عداوت سی رہی ہے اور ممبئی کی فلک بوس، دیدہ زیب، اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والی عمارتوں نے دل میں شوق کی آگ کو اور ہی شعلہ پوش کررکھا تھا، چنانچہ حافظ شاہد سلمہ کے ساتھ قریب کے مشہور اور واردین کے قلب ونظر کے لئے وجہ سکون وقرار ساحل سمندر گیا، یہ وہی جگہ تھی جسے لوگ ''حاجی علی'' سے جانتے ہیں۔

جب میں وہاں پہنچا تو شام کی آمد آمد تھی، مگر بارش کے قطرے مسلسل ٹپک رہے تھے، اسی حالت میں ہم لوگوں نے مزار کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، ابھی سمندر کا پانی کچھ فاصلہ پر تھا، اصحابِ ذوق موجوں سے ٹکرانے اور اپنی جوانمردی کے اظہار کے لئے دور دور تک جارہے تھے، بارش کے تسلسل نے ہماری ہمتوں کو کمزور کردیا تھا، اس لئے ہم لوگوں سے یہ جرأت نہ ہوسکی، واپسی سے پہلے خیال آیا کہ مزار میں جاکر دیکھوں کیا صورت حال ہے؟ جوں ہی داخل ہوا، عورتوں کی بھیڑ تھی، بظاہر مجاورین پردہ کی ترغیب دے رہے تھے، مگر بے پردگی کا سامان بھی خود ہی فراہم کررہے تھے، موڑ کے پرے سے مجاورین آنے والی عورتوں کے سر وغیرہ کو چھوتے، شاید یہ بابا حاجی علی کے فیض کو عام کرنے کی نسبت سے کیا جارہا ہو، مگر ایسے فیض سے کیا حاصل جو شریعت کی نگاہ میں بے فیض بلکہ باعث گناہ ہو اور شریعت کے نام پر بے دینی اور اصلاح کے نام پر فساد کا موجب بنے، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آج اوہام پرستی کے اس مہلک مرض میں مبتلا ہے۔

آج کا دوسرا اہم پروگرام انجمن اسلامیہ کے وسیع وعریض ہال میں ''ہندوستان اور نظام دارالقضاء'' کے موضوع پر تھا، یہ اجلاس عام مسلمانوں کے لئے رکھا گیا تھا تاکہ اُمت

کے ہر طرح کے افراد اس اجلاس میں شریک ہوسکیں اور موجودہ ہندوستان میں نظام قضاء سے واقف ہوسکیں ، مقررہ وقت کے مطابق پروگرام شروع ہوگیا ، اجلاس کی صدارت جناب عبدالستار شیخ (سکریٹری مسلم پرسنل لاء بورڈ) کے ذمہ تھی ،مگر اپنی علالت اور پیرانہ سالی کے سبب وہ تشریف نہیں لا سکے، مقامی مقررین میں مولانا مظفر عالم کا خطاب ہوا، آپ نے قاضی اور قضاء سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا، مولانا فیاض صاحب (قاضی دارالقضاء ممبئی) نے شہر ممبئی میں قائم شدہ دارالقضاء کی تفصیلی رپورٹ پیش کی ، اخیر میں مولانا مدظلہ کا بصیرت افروز اور دل کے نہاں خانوں میں اتر جانے والا خطاب ہوا ، مولانا نے دارالقضاء کی اہمیت ، موجودہ حالات میں اس کی ضرورت اور ہندوستان کے پس منظر میں اس کے طریقۂ کار کو تفصیل سے بیان فرمایا، مولانا نے دارالقضاء کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے کہا کہ '' دارالقضاء ہندوستانی عدلیہ کے بالمقابل کوئی عدالت نہیں ؛ بلکہ یہ ایسی جگہ ہے، جہاں فریقین کی رضامندی سے شریعت کی روشنی میں باہمی اختلاف کا حل نکالا جاتا ہے ، حکومت کو تو مزید خوش ہونا چاہئے اور ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ یہ دارالقضاء حکومت کی ذمہ داریوں میں تعاون کرتے ہیں اور عوام کے مسائل کے فیصلے جلد سے جلد کردیئے جاتے ہیں''۔

مولانا نے بعض حلقوں کی جانب سے کئے جانے والے اس اعتراض کا بھی جواب دیا کہ جب ہندوستان میں کوئی فیصلہ نافذ کرنے کی ہمیں طاقت نہیں تو ہم کیوں کر فیصلہ کریں؟ مولانا نے کہا: دوستو! ہم نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، کونسی چیز ہے جو ہمیں ان افعال کی ادائیگی پر مجبور کرتی ہے؟ اس کا جواب اللہ کا ڈر اور خدا اور رسول ﷺ کے احکام کی تابعداری اور فرمانبرداری کے سوا اور کیا ہے؟ یہی صورتِ حال یہاں بھی ہے، اگر ہمارے اندر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ ہوگا، تو ہم اپنے عائلی اور غیر عائلی مسائل کا حل بھی شرعی نقطۂ نظر کے مطابق دارالقضاء میں کرائیں گے ، ہمیں اس کے لئے کی دوسری

طاقت کے استعمال کی ضرورت نہیں، مولانا نے مزید کہا کہ ابھی ہم اسی قدر کے مکلّف ہیں، اگر ہم نے اس سے بھی روگردانی کی تو جو ابھی ہمیں حاصل ہے، بعد کو ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ وہ بھی ختم کردیئے جائیں گے، مولانا نے کہا کہ یاد رکھئے! دارالقضاء میں مقدمہ دائر کرنے کے بعد جو جیتتا ہے یعنی جس کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے وہ تو جیتتا ہی ہے، جو بظاہر ہار جاتا ہے، وہ بھی جیتتا ہے، کیوں کہ اس سے بڑی جیت اور کیا ہوگی کہ آدمی خدا اور رسول ﷺ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے، —— پروگرام کی کاروائی جناب ہارون موزہ والا نے چلائی جب کہ مولانا عبدالاحد فلاحی نے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کردی تھی۔

پروگرام کے اختتام تک رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے، بارہ بجے مالیگاؤں کے لئے ہماری ٹرین تھی، ہم لوگ اسٹیشن پہنچے، مالیگاؤں کے لئے منماڑ اسٹیشن پر اُترنا تھا، یہاں ٹرین صبح سویرے ساڑھے چار پانچ بجے پہنچنے والی تھی، پوری رات سوتے جاگتے گذری، منماڑ اسٹیشن آیا، جامعہ بیت العلوم کے دو اساتذہ مولوی عتیق الرحمٰن ندوی اور مولوی رضوان فلاحی اسٹیشن پر آ گئے تھے، مالیگاؤں یہاں سے تقریباً ۳۵ کیلو میٹر دور واقع ہے، آرام دہ کار سے ہم سب لوگ مالیگاؤں کے لئے روانہ ہوئے، راستہ کے دونوں جانب خوشنما، ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار ہماری نظروں کو ذوقِ خوشنمائی بخشنے کے لئے بے چین تھے، مگر نیند اور رات کی بے خوابی نے یہ سلسلہ زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہنے دیا اور وقفہ وقفہ سے میں نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا، بالآخر ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد ہم لوگ ''جامعہ بیعت العلوم، مالیگاؤں'' پہنچے، جس کی دعوت پر ہمارا یہ پروگرام طے پایا تھا۔

ہندوستان کے بہت سے شہروں کے لئے وجہِ شہرت اس کا حسن، جدید طرزِ تعمیر سے آراستہ عمارتیں، کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارک اور معاشی ترقی ہوئی ہے، یقیناً یہ چیزیں بعض لوگوں کے لئے وجہ افتخار بن سکتی ہیں، بلکہ آج کی مہذب دنیا میں یہی چیزیں سرمایۂ

افتخار ہیں، لیکن آج ہم ایسے شہر میں پہنچے جس کی شہرت مذکورہ چیزوں کی وجہ سے نہیں بلکہ علم پروری اور علم دوستی کی وجہ سے ہے، شہر مالیگاؤں میں مسلمانوں کے زیر انتظام تقریباً ۲۵ بڑے دینی اور عصری علوم کے ادارے ہیں، لڑکیوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے مرکزیت اس شہر کو حاصل ہے، آبادی کے تناسب کے لحاظ سے یہ شہر یقیناً اپنی اس صورتِ حال پر بجا طور سے فخر کر سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب اس شہر کے لئے مفید اور باعث خیر ثابت ہوا، ہینڈلوم —— جس کی صنعت کے لئے یوپی اور خاص طور پر مئو کا علاقہ مشہور ہے، —— اس انقلاب کے موقع سے اس صنعت سے وابستہ چند افراد نے اپنے لئے اس شہر کا انتخاب کیا، پھر ان کے ساتھ ان کی صنعت بھی یہاں آگئی اور آج ماشاء اللہ یہاں کے مسلمانوں میں یہ کاروبار اپنے زوروں پر ہے، اسی وجہ سے مسلمانوں کی مالی حالت بھی بہتر ہے، مگر موجودہ حکومت کی مخالف مسلم پالیسی نے اس صنعت کو کافی کمزور کر دیا ہے اور صنعت کاروں پر بے جا ٹیکس عائد کرنے کی وجہ سے بہت لوگ اب اپنی اس پرانی بلکہ موروثی صنعت کو چھوڑ دینا چاہ رہے ہیں، صنعت کاروں کا کہنا تھا کہ حکومت ٹیکس میں روز بہ روز اضافہ کر رہی ہے، مگر حکومت کے یہاں رعایت کوئی خانہ نہیں ہے، جب کہ آندھرا پردیش اور مدراس کی حکومتیں ہینڈلوم کی صنعت پر بھی سبسڈی دیتی ہیں، اس شہر میں تقریباً ۶۰ فیصد مسلم آبادی ہے، اس لئے یہاں کی تہذیب وتمدن میں دینی رنگ نمایاں ہے، مسلمانوں نے شروع ہی سے اس شہر کی ترقی میں حصہ لیا ہے، چنانچہ سب سے پہلی مرتبہ ڈرینج اور پانی کا نظام خاں صاحب حاجی عبدالرحیم —— جو اس علاقہ کے پہلے مسلم ایم، ایل، اے ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۳ء تھے —— نے ہی شروع کیا۔

جامعہ بیت العلوم کو شہر مالیگاؤں میں اُم المدارس کی حیثیت حاصل ہے، ابھی جتنے دینی مدارس اس شہر میں خدمت انجام دے رہے ہیں، ان میں اس جامعہ کی کوئی نہ کوئی تربیت یافتہ شخصیت موجود ہے، اس جامعہ کی بنیاد ۱۱۷ سال قبل مولانا عبداللہؒ نے ڈالی تھی، جو ۱۸۵۷ء میں

اپنے شہر اعظم گڑھ (یوپی) سے یہاں منتقل ہوگئے تھے، جامعہ زمانۂ قیام سے ہی اپنے مقصد میں لگا رہا، کبھی حالات ناسازگار بھی ہوئے، مگر اس کشتی کے ناخداؤں نے ان ناموافق حالات میں بھی خطرہ مول لے کر اس کی حفاظت کی، نظامی طرز تعلیم کی حامل اس جامعہ میں پرائمری اور حفظ قرآن مجید کے علاوہ دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، اب تک تقریباً پانچ سو علماء اور سات سو حفاظ اس جامعہ سے سند فراغت حاصل کر چکے ہیں، مدرسہ ایک ٹرسٹ کے تحت چل رہا ہے، ابھی اس کے صدر مدرس مولانا سراج احمد صاحب ہیں، جو بڑے خلیق، علم دوست اور اعلیٰ ذوق کے حامل ہیں، مدرسہ کا مہمان خانہ مولانا کے ذوق کا آئینہ دار ہے، ضروریات کی چیزیں مہیا ہیں اور سمتِ قبلہ کی نشاندہی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

آج کے پروگرام میں سب سے اہم جامعہ بیت العلوم میں ختم بخاری شریف کی تقریب تھی، یہ پروگرام اس نقطۂ نظر سے بھی کافی اہم تھا کہ یہی پروگرام اس پورے سفر کا محرک تھا، جس کی وجہ سے ہمارا یہ سفر مالیگاؤں تک طے پایا، اس سال جامعہ ہذا سے بارہ علماء نے سند فراغت حاصل کی، اس اجلاس میں مولانا کے ذمہ بخاری شریف ختم کرانی تھی، جامعہ کی وسیع وعریض مسجد میں صبح ۱۰ بجے پروگرام کا آغاز ہوا، امسال جن طلبہ نے اپنا حفظ قرآن مکمل کیا تھا انھوں نے اور مدرسہ کے دوسری جماعت کے طلبہ نے علمی مظاہرہ پیش کیا، جو بہت ہی متاثر کن تھا، صدر مدرس جامعہ مولانا سراج احمد صاحب نے اس موقع سے نبی علیہ السلام کے فرمان ''**نضر الله إمر أسمع مقالتی فحفظها ووعاها وأداها كما سمع**'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اس کے بعد حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بخاری کی آخری حدیث کا درس دیا، مولانا نے اپنے خطاب میں حجیتِ حدیث اور صالح معاشرہ کی تعمیر میں احادیث نبویہ کے کردار پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی، صحیح بخاری کی آخری حدیث کی سند ومتن پر آپ نے مختلف طریقہ سے بحث کی اور امام بخاری کی ذہانت وذکاوت کا تذکرہ کیا، نیز امام بخاری کی سیرت وسوانح پر بھی مختصر انداز میں گفتگو فرمائی، اس آخری

حدیث پر کلام کے دوران آپ نے سندِ فراغت حاصل کرنے والے طلبہ کو بہت سی اہم باتوں کی طرف توجہ بھی دلائی، آپ نے کہا کہ ''عزیز طلبہ! اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کتاب کو ختم کرلیا ہے، آپ اس کی لاج رکھئے، طالب علمی تو آخری زندگی تک جاری رہتی ہے، یہ موقع خوشی سے زیادہ احساس ذمہ داری کا ہے، فتح مکہ سے بھی زیادہ خوشی کا اور کوئی موقع ہوسکتا ہے؟ لیکن اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تواضع کا اتنا غلبہ تھا کہ پیشانی مبارک بار بار اونٹ کی کوہان سے لگ جایا کرتی تھی، جب آپ ﷺ مکہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے حضرت اُم ہانیؓ کے گھر میں دو رکعت نماز ادا فرمائی اور اللہ کا شکر ادا کیا'' مولانا نے طلبہ کو اُمت سے محبت کا پیغام دیتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہا کہ ''آج کے حالات کیسے ہیں؟ آپ ان سے باخبر ہیں، لوگ کس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرت میں مبتلا ہیں، اگر آپ بھی اس اُمت سے نفرت کریں گے، تو اُمت کا کیا حال ہوگا؟ آپ نے اس موقع سے نبی علیہ السلام کے اسوہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بیان فرمایا کہ ایک صحابی نے حرمت شراب کے ابتدائی زمانہ میں شراب پی لی، صحابہ انھیں برا بھلا کہنے لگے، ایک صحابی نے یہاں تک کہہ دیا ''اللہ تمہیں رسوا کرے'' نبی علیہ السلام نے ان سے یہ کہا کہ تم ایسا مت کہو بلکہ کہو ''یرحمک اللہ'' (اللہ تم پر رحم کرے)۔

اس پروگرام میں شہر کے تجار اور مدرسہ کے معاونین بھی کثیر تعداد میں شریک تھے، مولانا نے ان سے مخاطب ہوکر نبی علیہ السلام کی یہ حدیث بیان فرمائی: ''شہداء کا خون اور علماء کے قلم کی روشنائی قیامت کے دن برابر ہوں گے، کیوں کہ شہداء اسلامی ممالک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں، جب کہ علماء اسلامی افکار کے محافظ ہیں، اس لئے اگر آپ حضرات ان مدارس کی مدد کرتے ہیں، تو اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ اللہ نے آپ کے پیسوں کو اپنے دین کی سربلندی کے لئے قبول فرمایا ہے مولانا مدظلہ کا یہ خطاب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا، آپ ہی کی دُعاء پر مجلس کا اختتام عمل میں آیا۔

اس علم دوست شہر میں چند ندوی فضلاء نے ایک مسجد کے تحت دو چار سال قبل ''مولانا علی میاںؒ لائبریری'' کا قیام عمل میں لایا ہے، آج بعد نماز عصر لائبریری کے منتظمین نے کتب خانہ کی اہمیت وضرورت کے موضوع پر مولانا کا خطاب رکھا تھا، ماشاء اللہ فی الحال اس لائبریری میں مختلف اصلاحی، دعوتی موضوعات پر دو تین ہزار کتابیں ہیں، تین سو سے زائد افراد اس لائبریری کے ممبر بن چکے ہیں، جنھیں یہاں سے کتابیں عاریۃً مطالعہ کے لئے دی جاتی ہیں، یہ ایک اچھی کوشش ہے جس کی تعریف کی جانی چاہئے، واقعہ ہے کہ آج کل معاشرہ کی اصلاح وتربیت میں مسجد نے اپنا کردار کھودیا ہے، جس کے ذمہ دار مسجد کے ائمہ وخطباء اور ذمہ داران ہیں، ان میں نہ یہ ذوق باقی رہا اور نہ ہی معاشرہ کی فکر، اگر مسجد کی چہار دیواری سے مثبت طریقہ پر معاشرہ کی اصلاح کی مہم چلائی جائے تو انشاء اللہ ضرور یہ تحریک اپنے مقصد میں کامیاب رہے گی۔

مولانا نے اپنے اس پر مغز خطاب میں لائبریری کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں کسی قوم کی ترقی اور ان کی تہذیب وتمدن کی بقاء اور اس کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اس سے قومیں زندہ مانی جاتی ہیں، بلکہ قوموں کے لئے ان کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لئے روح کی ہے، اس موقع سے مولانا نے سلف صالحین کی علم دوستی اور کتابوں سے تعلق خاطر کے بہت سے واقعات تاریخی حوالوں سے بیان فرمایا، سامعین میں مسجد کے مصلیان کے علاوہ شہر کے علماء ودانشوران کی کثیر تعداد شریک تھی۔

آج ہی بعد نماز مغرب شہر کی جامع مسجد میں ایک پروگرام رکھا گیا تھا، ہم لوگ یہاں جامع مسجد لے جائے گئے، جامع مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے آج سے ۸۳ سال قبل مدرسہ تعلیم القرآن کے نام سے ایک مکتب کا قیام عمل میں آیا تھا، جو آج کل مفتی اسماعیل صاحب (امام جامع مسجد) کی زیر نگرانی اپنی ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے، آج کا دن اس سال حفظ وناظرہ کرنے والے خوش قسمتوں کے لئے تقسیم اسناد کا تھا، بچوں نے اپنا بہترین

اور دلچسپ تعلیمی مظاہرہ پیش کیا، اس کے بعد مولانا نے ''بچوں کی تربیت'' کے موضوع پر خطاب فرمایا، مولانا نے کہا کہ آج کے زمانہ میں جب کہ مغربیت کا فروغ اور اسلام سے دوری کا رجحان پیدا ہو رہا ہے، اپنے بچوں کو دینی تعلیم اور خدا اور رسول کے احکام سے واقف کرانا ہر مسلمان والدین اور سرپرستان پر ضروری ہے، چوں کہ یہ مسجد درمیان بازار واقع ہے، جس میں بہت سے تجار بھی آئے ہیں اور اس پروگرام کی مناسبت سے ان کی اچھی خاصی تعداد شریک بزم تھی، تو مولانا نے اسی مناسبت سے ''اسلام میں تجارت کے اُصول'' کے موضوع پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی۔

رات کا کھانا جامعہ بیت العلوم کے چیف ٹرسٹی جناب حاجی خالد عمر صدیقی کے یہاں تھا، آپ کا شمار شہر کے مشہور تاجروں میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے دولت کے ساتھ ساتھ اظہار نعمت اور صحیح مصرف میں انفاق کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے، رات دیر گئے ہم لوگ قیام گاہ جامعہ بیت العلوم لوٹ آئے، دوسرے دن ۲۹ ستمبر کو شہر کی مشہور درسگاہ جامعۃ الہدیٰ میں ایک پروگرام طے تھا، یہ مدرسہ الہدیٰ سوشل ویلفیر سوسائٹی کے تحت آج سے پچیس سال قبل شروع کیا گیا، دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا بھی امتزاج اس مدرسہ کی خصوصیت ہے، جامعہ جناب عبدالرشید عثمانی جیسے مخلصین کی سرپرستی میں روز افزوں ترقی پر ہے، اب تک کئی سو طلبہ سند فراغ حاصل کر کے ملک کی دوسری بڑی یونیورسٹیوں اور دینی جامعات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

صبح ۱۰ بجے سے جامعہ کا یہ پروگرام شروع ہوا، بچوں نے اپنا علمی مظاہرہ پیش کیا، پھر اخیر میں مولانا محترم کا بیان ہوا، مولانا حفظ قرآن کی فضیلت واہمیت پر تفصیلی خطاب فرمایا، آپ نے کہا کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ صرف قرآن یاد کر لینے سے کیا فائدہ، جب تک اس کو سمجھ کر نہ پڑھا جائے؟ مولانا نے اپنے خطاب میں اس ذہنی وسوسہ اور اعتراض کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا کہ ایسا سمجھنا سراسر غلط ہے، یہ الگ بات ہے کہ قرآن سمجھ کر پڑھنا

زیادہ باعث خیر ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہئے ،لیکن قرآن جس طرح سمجھ کر پڑھنا ثواب کا باعث ہے، اسی طرح بے سمجھے بھی تلاوت قرآن ثواب سے خالی نہیں، آپ نے اپنی بات کو مدلل کرتے ہوئے کہا نبی علیہ السلام نے تلاوت قرآن کا ثواب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''الٓمٓ'' میں ۳۰ نیکیاں ہیں، آپ ﷺ نے یہاں نیکیوں کے بارے میں اطلاع دینے کے لئے قرآن کی دوسری آیات کو چھوڑ کر ایسی آیت کا انتخاب فرمایا، جس کا معنی ومفہوم صحیح قول کے مطابق صرف اللہ اور اس کے رسول کو ہی معلوم ہے، دوسرے لوگ اس سے واقف نہیں، اس سے یہ بات اشارۃً معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کی تلاوت اگر بغیر سمجھے کی جائے تو بھی وہ ثواب کا باعث ہے، مولانا نے اپنی تقریر میں اُمت کے درمیان اتحاد واجتماعیت پر زور دیا اور کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم مسلکی اختلاف سے اوپر اُٹھ کر اتحاد کی فکر کریں۔

اس شہر کی ایک مشہور اور ممتاز دینی درسگاہ ''معہد ملت'' ہے، آج وہاں بھی جلسۂ ختم بخاری شریف تھا، اس نسبت سے یہاں مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ (سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) تشریف لائے ہوئے تھے، مہتمم مدرسہ مولانا عبدالاحد ازہری کی خواہش پر ہم لوگ یہاں بھی گئے، وقت کی کمی کے باعث کچھ ہی دیر بعد جامعہ بیت العلوم لوٹ آئے، کچھ وقفہ کے بعد دن کے کھانے کے لئے جامعہ بیت العلوم کے ٹرسٹی حاجی ظہیر احمد صاحب کے یہاں جانا تھا، آپ کا مکان ہماری قیام گاہ سے کافی دور تھا، اس لئے جلد وہاں کے لئے نکلنا تھا، کھانے کے بعد کچھ دیر مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوا، یہیں سے ہم نے اپنے میزبان محترم مولانا سراج صاحب، جناب ظہیر احمد صاحب اور دوسرے حضرات —— جن کا نام ابھی ذہن کے اسکرین پر نہیں آ رہا ہے —— کو الوداع کہا اور منماڑ اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے، ہمارے ساتھ جامعہ بیت العلوم کے دو اساتذہ مولانا عتیق الرحمٰن ندوی، مولانا محمد الیاس فلاحی اور ہمارے دوست مولانا ارشد ملی بھی اسٹیشن تک چھوڑنے آئے، سرسبز وشاداب، ہرے بھرے کھیتوں، بلند قامت مگر سبزہ پوش پہاڑوں سے گذرتے ہوئے دوسرے دن ۹ بجے سکندر آباد

پہنچے، درمیان سفر ممتاز عالم دین متعدد کتابوں کے مصنف مولانا صدرالحسن ندوی سے ملاقات ہوگئی، ان سے مختلف علمی اور دعوتی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے ہمارا سفر مکمل ہوگیا، اسٹیشن پر محترم جناب کلیم الدین صاحب آچکے تھے، ان کے ساتھ ہم لوگ گھر پہنچے اور اس طرح ۹۲ گھنٹے کا ہمارا یہ سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔

❑ ❑ ❑ ❑